

ماہنامہ
خا

اکتوبر 2018



PRODUCTIONS
THE ENTERTAINMENT
magazines.com

سرگير کيش

ماهنامه حنا

جلد: 40 شماره: 12
دسمبر 2018
قيمت: 70 روپے

سردار محمود

باني:

سردار طاھر محمود

مدیر اعلیٰ:

تسليم طاھر

مدیرہ:

ارم طارق

نائب مدیران:

تحریر محمود

فوزیہ شفیق

مدیرہ خصوصی:

سردار طارق محمود

قانونی مشیر:

(ایڈوکیٹ)

کاشف گوریجہ

آرٹ ایڈیٹر:

خالدہ جیلانی

اشتہارات:

افراز علی نازش



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلسلہ ناول

اسلامیات

دل گزیدہ 7
اُم بریم 12
پر بت کے اُس پار کہیں 7
تایاب جیلانی 170

فارغ دہلی 7
بشیر مدد 7
ادارہ 8
حم نعت
پیاسے نبی کی پیاری بانیں

مکمل ناول

انشاء نامہ

ہجر کا استعارہ اور ہے 34
تم میرے پاس رہو 64
اک تیرے نام کی چاہ اُم ایمان قاضی 134

انشاء کی نشانی ہے 11
ابن انشاء

افسانے

ناولٹ

دسمبر بنگار ہے 208
فیس بک 212
سدا مسکرائے اُس کا گھر 218
نادیہ جہانگیر
شاہنکول
سیما بخت عام

شہر دل کا راستہ 96
شہر بی بی 114
تعلیم زادہ 184
حمین اختر
بشیر بیگل
تعلیم زادہ



انتباہ: ناشر ہمارے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی فی وی پیج میل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔



URDU TUBE

A HOME OF

www.urdu-tube.com



- | | | | | | |
|-----|--------------------------------|-----------------|-----|-------------|---------------|
| 232 | تسليم طاہر | بیاض | 224 | تحریم محمود | حاصل مطالعہ |
| 234 | افراح طارق | حتا کا دسترخوان | 226 | ماہر محمود | میری ڈائری سے |
| 237 | کس قیامت کے یہ نامے فوزیہ شفیق | | 230 | بلیس بٹنی | رنگ حنا |
| | | | 228 | عین عین | حنا کی محفل |



سر دار طاہر محمود نے نواز پرشنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرگرم روڈ لاہور سے شائع کیا۔
 خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا**، پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرم روڈ
 اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
 monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

کچھ نیا دیکھیں

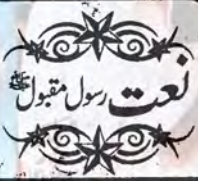
قارئین کرام! دسمبر 2018ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

کراچی ملکی معیشت میں ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ہونے والے کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے۔ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کی بناء پر یہ شہر اپنے باسیوں کے لئے خوشحالی کا پیغام لے کر آیا اور روشنیوں کا شہر بن گیا۔ امن و امان کی بہتر صورتحال اور معاشی خوشحالی کی بناء پر ملک بھر کے شہری تلاش روزگار کے لئے اس شہر کا رخ کرنے لگے اور یہ شہر بطور پر مٹی پاکستان کہلانے لگا۔ لیکن گزشتہ چند دہائیوں سے شریہند عناصر نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ایما پر اس شہر کے امن و امان کو تباہ کر دیا تھا۔ کراچی کی بگڑتی ہوئی صورتحال نے یہاں کے شہریوں کو ہفتی خلیجیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالآخر کراچی کی رونقیں بحال کرنے کے لئے ریجنر کو میدان میں اترا پڑا اور ریجنر کے جوانوں نے قربانیاں دے کر دہشت گردوں کو کفر کردار تک پہنچا کر کراچی میں امن و امان کی صورتحال کو بہتر بنایا اور اسے دوبارہ روشنیوں کا شہر بنایا۔ اب کچھ عرصہ سے دوبارہ شریہند عناصر کراچی میں سرگرم ہو رہے ہیں اس صورتحال کے تناظر میں چیف آف آرمی شائف جنرل قمر جاوید باجوہ کو کہنا پڑا ہے کہ ہم اس کی سیکورٹی کو مزید بہتر بنائیں گے تاکہ یہاں کاروباری سرگرمیاں مثبت انداز میں جاری رہیں۔ فوج تو ملکی سلامتی کے لئے داخلی اور خارجی سطح پر اپنا فرض سرانجام دے رہی ہے مگر رسول انتظامیہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا فرض جانفشانی سے سرانجام دے اور کراچی کے امن و سلامتی کے لئے شریہند عناصر کی سرکوبی میں فوج کے ساتھ تعاون کرے۔ کراچی کے سٹیک ہولڈرز کو بھی نہیں بلکہ ملک کے سٹیک ہولڈرز کو متحد ہو کر اس شہر کی جنوبی ایشیاء کا سب سے ترقی یافتہ شہر بنانے کے لئے کام کرنا چاہیے۔

سالگرہ نمبر:- ”سال نو نمبر“ جنوری کا شمارہ سالگرہ نمبر کے ساتھ ”سال نو نمبر“ بھی ہوگا، حسب روایت اس میں قارئین اور مصنفین سے سروے شامل ہوگا سروے کے سوالات اندرونی صفحات پر شائع کیے گئے ہیں۔

اس شمارے میں:- فلک تویر، دشمن بلال اور ام ایمان کے مکمل ناول، بشری سیال، تحسین اختر اور تمغیلہ زاہد کے ناولٹ، نادیر جہانگیر اور رمشا احمد کے افسانے، ام مریم اور نایاب جیلانی کے سلسلے و ناولوں کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار طاہر محمود



تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا
یا نبیٰ خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا

شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
حسن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا

اے شہنشاہ رسل فخر رسل ختم رسل
خوب سے خوب خوش اسلوب ہوا خوب ہوا

فخر آدم کو نہ ہوتا جو فرشتہ ہوا
بنی آدم سے جو منسوب ہوا خوب ہوا

داغ ہے روز قیامت میری شام اس کے ساتھ
میں گناہوں سے جو تجوب ہوا خوب ہوا

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ
سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ

پھول میں بی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

پیڑوں کی صفیں پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بادل کی عبادت ہے برستا ہوا پانی
آنسو کی غزل حمد و ثنا اللہ ہی اللہ

داغ دہلوی

بشیر بدر

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا بہت سے فساد جو مسلمانوں میں ہوئے۔
(صحیح مسلم)

فتنوں کا بیان

سیدنا حدیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا۔
”تم میں سے کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟“

بعض لوگوں نے کہا۔

”ہاں ہم نے سنا ہے۔“

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
”شاید تم فتنوں سے وہ فتنے سمجھے ہو جو آدمی کو اس کے گھربار اور مال اور ہمسائے میں ہوتے ہیں۔“

تو انہوں نے کہا۔

”ہاں۔“

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”ان فتنوں کا کفارہ تو نماز اور روزے اور زکوٰۃ سے ہو جاتا ہے لیکن تم میں سے ان فتنوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکیں نے سنا ہے جو دریا کی موجوں کی طرح اٹھ کر آئیں گے؟“

سیدنا حدیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ لوگ خاموش ہو گئے، میں نے کہا کہ میں نے سنا ہے۔

جب برائی زیادہ ہو جائے
ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نیند سے جاگے اور فرمایا۔

”لا الہ الا اللہ خرابی ہے عرب کی اس آفت
سے جو نزدیک ہے آج یا جوج اور ماجوج کی آڑ
اتنی کھل گئی۔“

اور (راوی حدیث) سفیان نے دس کا
ہندسہ بنایا، (یعنی انگوٹھے اور کلہ کی انگلی سے حلقہ
بنایا)۔

میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم! کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت
میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جب برائی زیادہ ہوگی۔“ (یعنی فتنوں و
فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی)

(صحیح مسلم)

فتنوں کا نزول

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ
کے مکھلوں میں سے ایک محل پر چڑھے پھر فرمایا۔

”تم دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟ بے شک
میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی جگہیں اس
طرح دیکھتا ہوں جیسے بارش کے گرنے کی جگہوں
کو۔“ (یعنی بہت ہوں گے بوندوں کی طرح مراد
جمل اور عصفین اور فتنہ عثمان اور شہادت حسین)

فساد ڈالے، کوئی شیطان ان میں سے آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا، (یعنی فلاں سے چوری کرائی، فلاں کو شراب پلوائی) تو شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا، پھر کوئی آکر کہتا ہے کہ میں فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرا دی تو اس کو اپنے پاس کر لیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا ہے۔“ اگمش نے کہا کہ۔
 ”اس کو چٹا لیتا ہے۔“

(صحیح مسلم)

فتنہ مشرق کی طرف سے ہوں گے
 سیدنا سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے۔

”اے عراق والو! میں تم سے چھوٹے گناہ نہیں پوچھتا نہ اس کو پوچھتا ہوں جو کبیرہ گناہ کرتا ہو، میں نے اپنے والد سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ کہتے تھے۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ فتنہ ادھر سے آگے کا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا جہاں شیطان کے دونوں سینک نکلتے ہیں اور تم ایک دوسرے کی گردن مارتے ہو (حالانکہ مومن کی گردن مارتا کتنا بڑا گناہ ہے) اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی قوم کا ایک شخص مارا تھا اور وہ غلطی سے مارا تھا (نہ بہ نیت، قتل کیونکہ گھونے سے آدمی نہیں مرتا) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ۔

”تم نے ایک خون کیا پھر ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور تجھ کو آزمایا جیسے آزمایا تھا (طہ ۴۰)“

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
 ”تو نے سنا ہے تیرا باپ بہت اچھا تھا۔“
 سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔
 ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ۔“

”فتنے دلوں پر ایسے آئیں گے ایک کے بعد ایک، ایک کے بعد ایک جیسے بورے کی تیلیاں ایک کے بعد ایک ہوتی ہیں پھر جس دل میں فتنہ رچ جائے گا اس میں ایک کالا داغ پیدا ہو گا اور جو دل اس کو نہ مانے گا تو اس میں ایک سفید نورانی دھبہ ہو گا یہاں تک کہ اسی طرح کالے اور سفید دھبے ہوتے ہوتے دو قسم کے دل ہو جائیں گے، ایک تو خالص سفید دل کھنے پھرنے کی طرح جس کو کوئی فتنہ نقصان نہ پہنچائے گا جب تک کہ آسمان و زمین قائم رہیں، دوسرے کالا سفید مائل یا الٹے کوزے کی طرح جو نہ کسی اچھی بات کو اچھی سمجھے گا، نہ بری بات کو بری مگر وہی جو اس کے دل میں بیٹھ جائے۔“

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ پھر میں نے سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث بیان کی کہ۔
 ”تمہارے اور اس فتنے کے درمیان میں ایک دروازہ ہے جو بند ہے مگر نزدیک ہے کہ وہ ٹوٹ جائے۔“

(صحیح مسلم)

شیطان کا فتنہ ڈالنا

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
 ”ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو دنیا میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے، پس اس سے مرتبہ میں زیادہ قریب وہ ہوتا ہے کہ جو بڑا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”وہ اپنا اور تیرا گناہ سمیٹ لے گا اور
 دوزخ میں جائے گا۔“

(صحیح مسلم)

مسلمانوں کی لڑائی

سیدنا اخف بن قیس کہتے ہیں۔

”میں اس ارادہ سے نکلا کہ اس شخص کا
 شریک ہوں گا (یعنی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا
 سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں
 شریک ہوں گا) راہ میں مجھ سے سیدنا ابوبکر طے
 کہنے لگے کہ۔“

”اے اخف تم کہاں جاتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

چچا زاد بھائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”اے اخف! تم لوٹ جاؤ، کیونکہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان

اپنی تلواریں لے کر لڑیں تو مارنے والا اور جو مارا

جائے دونوں جہنمی ہیں۔“

میں نے عرض کیا یا کسی اور نے کہا کہ۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قاتل تو

جہنم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں جائے گا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

”وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ رکھتا

تھا۔“

(صحیح مسلم)

☆☆☆

(صحیح مسلم)

فتنے میں حصہ لینا

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”بے شک کئی فتنے ہوں گے خبردار ہو،

وہاں کئی فتنے ہوں گے، بیٹھے والا ان میں سے

چلنے والے (لوگوں سے) بہتر ہوگا اور بھاگنے

والے (لوگوں سے) چلنے والا بہتر ہوگا، خبردار

رہو، جب فتنہ اور فساد اترے یا واقع ہو تو جس

کے اونٹ ہوں، وہ اپنے اونٹوں میں جا ملے اور

جس کی بکریاں ہوں وہ اپنی بکریوں میں جا ملے

اور جس کی (کھیتی کی) زمین ہو، وہ اپنی زمین

میں جا رہے۔“

ایک شخص نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس

کے اونٹ نہ ہوں اور نہ بکریاں اور نہ زمین ہو وہ

کیا کرے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ اپنی تلوار اٹھائے اور پتھر سے اس کی

باڑھ کو کوٹ ڈالے، (یعنی لڑنے کی کوئی چیز باقی

نہ رکھے جو لڑائی کا حوصلہ ہو) پھر اپنے بچاؤ میں

جتنی ہو سکے جلدی کرے، الٰہی! میں نے تیرا حکم

پہنچا دیا، الٰہی! میں نے تیرا حکم پہنچا دیا، الٰہی! میں

نے تیرا حکم پہنچا دیا۔“

ایک شخص بولا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

بتلائیے کہ اگر مجھ پر زبردستی کریں یہاں تک کہ

مجھے دو صفوں میں سے یا دو گروہوں میں سے ایک

لے جائیں پھر وہاں کوئی مجھے تلوار مارے یا تیر

آئے اور مجھے قتل کرے؟“

انسان کی نشانی

ابن انشاء

اس دل کے جھروکے میں اک روپ کی رانی ہے
اس روپ کی رانی کی تصویر بنانی ہے

ہم اہل محبت کی وحشت کا وہ درماں ہے

ہم اہل محبت کو آزار جوانی ہے

ہاں چاند کے داغوں کو سینے میں بساتے ہیں

دنیا کہے دیوانا دنیا دیوانی ہے

ایک بات مگر ہم بھی پوچھیں جو اجازت

کیوں تم نے یہ غم دے کے پردیس کی ٹھانی ہے

سکھ لے کے چلے جانا دکھ دے کے چلے جانا

کیوں حسن کے ماتوں کی یہ ریت پرانی ہے

ہدیہ دل مطلق کا چہ شعر غزل کے ہیں

قیمت میں تو ہلکے ہیں، انشاء کی نشانی ہے

☆☆☆

www.urdutubes.com

دل زندہ

ام مریم

چالیسویں قسط کا خلاصہ

جرم ثابت ہو جانے پہ عباس کے ساتھ شانزے کو بھی سزا ملتی ہے، شانزے کو فیب چوہدری کے گھر سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جاتا ہے، مگر شانزے اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں، اب اس کا اگلا حدف حجاب ہے۔

سلیمان خان دوبارہ آپا سے رابطہ بحال کرتے ہیں، آپا جو جیسے انہی کی واپسی کی منتظر تھیں، بھائی کی آواز سن کر پھر سے جی اٹھتی ہیں۔

قدر عجب مشکل میں گرفتار ہے، حمدان کی بے رخی اسے مارے ڈال رہی ہے، مگر جھکنے میں اعتراف میں بھی اتنا متاثر ہے۔

علی شیر کے لئے یہ اطلاع کہ قدر اپنی زندگی میں گمن ہے کسی بلاسٹ سے کم نہیں، وہ ہر صورت یہ سکون درہم برہم کر دینا چاہتا ہے۔

حجاب کی زندگی میں آنے والا طوقان تباہی و بربادی چھوڑ گیا ہے، وہ کسی طور نہیں سنبھل پارہی تھی۔

ایکٹا لیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





”چھوڑ دیں مجھے۔“ وہ ہلکی، ایسی تڑپ جو کسی کے دیکھنے میں نہ آئی ہو، عمر خود اس سے نظریں چراتا تھا، کیسا سانحہ تھا، خوشی انہیں راس نہ آسکی تھی، دونوں نے اس شب کا کتنا انتظار کیا تھا، عمر نے ساری باتیں اس دن کے لئے سنبھالی تھیں، سارے شکوے حجاب نے ہر نازا سی شب کو اٹھوانا تھا، مگر..... اسے اس کی ارامنوں کی رات میں اس کے شوہر کے سامنے بے پردہ بے عزت کر دیا گیا تھا، عظیم سانحات میں شمار ہوا تھا یہ سانحہ، اولیں..... اور ایسا بھانک انتقام وہ تو اسی دشمنی کی وجہ ہی نہ کھون سکی تھی، ایسا نقب کیوں لگا گیا تھا بھلا وہ اس کے گھر اس کی عزت اس کی خوشیوں میں.....؟ نظریں روٹی تھی تو آنسو تمام نہ ہوتے تھے، دل کا بوجھ ڈھلنے والا ہی نہ تھا، وہ کیا کرتی تھی.....؟ نظریں خود سے نہ ملتی تھیں، عمر سے کیونکر ملاتی۔

”کنٹرول یور سیلف..... آپ نے ہر صورت خود کو سنبھالنا ہے، یہ بے حد ضروری ہے، ورنہ اگر ذرا سی بھی کسی کو شک ہوگئی تو جو نقصان حصے میں آئے گا وہ اس سے شدید ہوگا جو ہو چکا، آپ کو سمجھ آ رہی ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

سرخ آنکھوں میں آنسو لئے وہ اس سے نظریں ملانے بغیر بات کرتا تھا، شاید اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا سکیں گے کبھی بھی، آنسو تو حجاب کی آنکھوں میں بھی تھے، بلکہ بہہ رہے تھے، رکتے نہ تھے۔

”اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا؟ اس سے بڑا کوئی اور نقصان نہیں ہو سکتا میں اس صورتحال کو قبول نہیں کر سکتی، اس ذلت کے احساس سمیت مجھے نہیں چینا.....“ وہ روتے ہوئے نیچے بیٹھ گئی انداز میں آہ دے لگتی، فریاد تھی، عمر نے گہرا کر بند دروازے کو ایسے دیکھا جیسے اس کی آواز کے باہر جانے سے خائف ہو، ہونٹ جھپٹتے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

”میں بتاؤں تمہیں اس کا شدید نقصان کیا ہے؟ خالہ جان کو اس ساری حقیقت کا معلوم ہوتا، وہ جیتے جی مر جائیں گی، حجاب..... ان کا سوچو، اپنے قادر اور بھائی کا سوچو، کوئی بھی نہیں جی سکے گا، ہمت سے کام لو، آزمائشیں انسانوں پہ ہی آیا کرتی ہیں اور مجھ پہ تو ہمیشہ سے آئی ہیں۔“

اسے تسلی دیتے عمر کی آواز ایک دم بھرا گئی، حجاب چپ رہی، یوں خاموش ہو گئی جیسے عمر بھر اب کچھ نہیں بولے گی، عمر کو تشویش تو ہوئی تھی مگر اس کی آہ و نوحہ کی بجائے یہ خاموشی قیمت تھی بہر حال، مبر دینے والی خدا کی ذات ہے، اسے بھی آہی جانا تھا کبھی نہ کبھی۔

☆☆☆

مجھے تم بھول جاؤ گے مجھے معلوم ہے لیکن
پلٹ کے جب بھی آؤ گے محبت خنجر ہوگی
بھی بھولے سے بھی اگر مجھے تم یاد کر بیٹھو
میری شیخ تلاوت اور عبادت خنجر ہوگی
فلک کے پار اتر دو تم یا سمندروں میں جا ٹھہرو
کسی کے دوست چاہت کی امامت خنجر ہوگی
ہماری آرزو جو ہے تمہاری دسترس میں ہے

ملو نہ ملو تم لیکن محبت منتظر ہو گی

اس وقت وہ ہلکے نارنجی رنگ کے خوب صورت کا مدار جدید تراش خراش کے مطابق سوٹ پہنے ادھوری سی تیاری کے ساتھ بھی کوئی کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی، اس کے سرخ و سفید رنگ روپ سے گویا روشنیاں سی پھوٹ رہی تھیں جو دیکھنے والی کی نگاہ کو خیرہ کرنے کا باعث بن رہی تھیں، حمدان جو خاصی دیر سے اس کا منتظر تھا اور وہ کمرے سے نہیں نکل سکی تھی تو خاصا جھنجھلا کر اسے بلانے آیا تھا، مگر کیا شک کہ غصہ حسن کی شعاؤں میں جل کر خاک ہوا اور وہ بامشکل خود کو مبہوت ہونے سے بچا سکے۔

”اس طرح تو محترمہ شام تک آپ کی تیاری پوری نہ ہوگی۔“

وہ ایک جھمکا پہن چکی تھی، حمدان نے دوسرا خود اٹھا کر پہنا دیا۔

”گستاخی معاف مگر اس وقت نا تم نہیں تو مجبوری ہے۔“

قدر کہاں ایسے التفات اور توجہ کی عادی تھی یا اس وقت تیار تھی، ایک تو اس کی قربت کا تاثر اس پر یہ جرات اس کے گللوں چہرے پہ کتنے رنگ بکھر گئے، مگر وہ تو کتنے نارمل انداز میں بات کرتا تھا۔

”میک اپ تو مکمل ہے آپ کا۔“

بھرے بھرے ہونٹوں پہ بہت خوب صورت شید کی لپ اسٹک اور جھکی ہوئی آنکھوں کے پپوٹوں پہ آئی لائینر اس کے لود چنے حسن کو اور بھی تمازت دے رہا تھا، وہ مطمئن ہوا۔

”زحمت کریں گی یا یہ کام بھی مجھے ہی سرانجام دینا ہے؟“ اس کے چم چماتے سینڈل چہرے کی ٹھوکر سے اس کی طرف دھکیلتا وہ گہرا سانس بھر کے کہہ رہا تھا، قدر محبوب بھی کبھی سراسیمہ بھی، گھبرا کر پہننے کو جھکی تو کھلے بال ڈھلک کر چہرے کے آگے پھیل گئے۔

”چلو..... ہو گیا کام..... انہیں سمجھیں آپ۔“ حمدان کے انداز میں ہلکی سی کوفت اتری، قدر کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ بالوں کی سمت متوجہ ہو جاتی، غلٹ میں بال سمیٹ کر نازک سا کچر اٹھایا مگر لگانہ سکی کہ حمدان اس کے پیروں میں سینڈل پہنا رہا تھا، کچر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”رہنے دیں..... میں خود پہن لوں گی۔“ اس نے مضطرب ہوتے تیزی سے پاؤں پیچھے کھینچا، حمدان نے چونک کر سر اوجھا کیا تھا، اس کی نظروں میں کیا تھا کہ وہ کنفیوژ تو تھی مزید پزل ہوئے بغیر نہ رہتی۔

”کیوں گھبرا گئیں آپ..... یہ ہماری شادی کا سیزن نہیں ہے، نہ ہی اس مہربانی کے بعد میرا مزید ویسی مہربانیاں کرنے کا کوئی ارادہ ہے جو اس رات آپ کی رضا و رغبت کے بغیر بھی کر گیا تھا۔“ حمدان بولا تو لہجہ سلگتا ہوا تھا، آج اور جی سے بھرا ہوا، اس کے بعد وہ رکنا نہیں سب کچھ چھوڑ چھا ڈر ایک دم سے اٹھ کر باہر نکل گیا، قدر آنکھوں میں آنسو لئے ہونٹ سینچنے بیٹھی تھی، کتنا مشکل ہو گیا تھا حمدان کا اس کی کیفیات کو سمجھنا اور اس سے زیادہ دشوار ہو چکا تھا قدر کا اسے کچھ بھی سمجھنا، تبدیلی سے آگاہ کرنا۔

☆☆☆

جس گھڑی دل کے میرے زخم نہائی ہوگی
ساری خلقت ہی مجھے دیکھنے آئی ہوگی
جس کو برباد کیا پہلی محبت نے سحر
پھر اسے دوسری سچی راس نہ آئی ہوگی
مجھ سی نادار سے الماک نہ پوچھو کہ فقط
زندگی چار دھاڑے کی کمائی ہوگی
کیسے چپ چاپ جلا رہی خوابوں کا بدن
کسی نفرت نے ہی یہ آگ لگائی ہوگی

بیڈ پہ نڈھال آنکھیں موندے وہ گویا ساری دنیا سے چھپی خود اپنے آپ سے کترائی پڑی تھی،
عمر فون پہ غالباً غافیل سے بات کر رہا تھا، اس کی وضاحت سے لبریز آواز وہ یہاں بھی سن سکتی تھی، نا
چاہتے ہوئے بھی سن رہی تھی۔

”جباب کی کل رات سے ہی طبیعت بہت خراب ہے، اب ذرا سنبھلی تو ہے میں پوزیشن ایسی
نہیں کہ حرم کے ولیمہ میں شریک ہو سکیں، سو بہت معذرت..... آپ ان لوگوں سے پلیز ایک میگزین
دیتے جگہ، میں خود بھی کال کروں گا۔“

”بیارانی..... کچھ کھا لو..... کل سے بھوکی ہو، ایسے تو اور طبیعت خراب ہوگی۔“ بی جان پھر آ
گئی تھیں، انہیں اس کی بہت فکر تھی، ایک رات کی دلہن کو کون سا آسیب چٹ گیا، ہنسا بھولنا ہی
بھول گئی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، ڈسٹرب نہ کریں پلیز۔“ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی وہ کروٹ بدل چکی
تھی، جب عمر نے اندر قدم رکھا گوشت میں روتا ہوا بچہ تھا، شاید بھوکا تھا۔
”اس کا فیڈر تیار کر دیں بی جان۔“ انہیں باہر آنے کا اشارہ کرتا وہ دم آواز میں بولا تھا تو بی
جان رازدارانہ انداز میں اس کے فریب ہوئیں۔

”سچ بتانا عمر..... لڑائی ہوئی ہے تمہاری اس بچی سے؟“ جوا با عمر نے سرد آہ بھری تھی۔
(کاش ایسا ہی ہوتا، یہ تناؤ یہ اذیت، یہ خاموشی اور کرب کسی ذاتی معمولی لڑائی کا ہی باعث
ہوتا، تب میں اسے کبھی یوں اس کے حال پہ نہ چھوڑتا، مگر اب کیسے بھلاؤں اسے)۔

”بیٹے میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ پہلی بچی کا کوئی تذکرہ پہلی رات نہ کرنا مناسب نہیں،
مگر تم نے تو بچہ ہی اس کے حوالے کر دیا نئی بیباکی دلہن کے، اسی بات کی ہونہ ہو تو نئی ہے۔“
بی جان اندازہ قائم کیے بیٹھی تھیں اور اس پہ قائم اور پر یقین تھیں، دیکھا جاتا تو یہ بھی غیبت
تھا، بچے کا بلکنا بڑھا تو جھجھلائیں۔

”ایک تو یہ ذرا سنا منائیں نکلا، دیکھو تو بات نہیں کرنے دی مجھے، جیسی ماں ویسا سپوت،
جانے یہاں کیوں چھوڑ گئی چالا کو۔“

انہیں شاء پہ بہت غصہ تھا، جو ختم ہی نہ ہوتا تھا، انہوں نے تو کہا بھی تھا کہ بچہ نضال کے
حوالے کروں، یہ نہ ہو کسی دن وہ بھی اس کی ماں کی طرح منہ اندھیرے چوروں کی طرح کسی طرف

کو نکل لیں، تمہیں پرانی اولاد کیا فیض دے گی، منہ پہ مار کر ان کے جن کی ہے، وغیرہ مگر عمر ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا اس سارے قصے میں اس بچے کا اگر کوئی کہیں تصور نہیں نکلتا تھا تو سزا سے کیوں دی جاتی ہے مجھ بچے تو نم مٹی کی مانند ہوتے ہیں، انہیں جو بھی صورت دی جائے گی اس کے مطابق ڈھل جائیں گے، وہ معاشرے کو ایک معمار فراہم کر سکتا تھا تو اس ذمہ داری سے جی کیوں چراتا، ثناء سے شادی کر کے اس نے کچھ نہیں پایا تھا ماسوائے اس بچے کے پھر وہ اس خزانے کو کیوں کھودیتا بھلا۔

”خالہ جان حرم کے ولیمہ سے واپسی پہ حمدان کے ساتھ یہاں آئیں گی، ممکن ہے انکل اور تمہاری بھابھی بھی ساتھ ہوں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دوران تمہارا خود کو سنبھال لینا بے حد ضروری ہے۔“ بچہ دودھ پیتے ہی سو گیا تو وہ اسے لٹانے ہی اندر آیا تھا، اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا، حجاب کے ساکن وجود میں کوئی جتنب نہیں ہوئی تو عمر کو فطری سی تشویش نے گھیرا، صورتحال جس قسم کی تھی وہ مایوسی و پیمان کی کسی شدید کیفیت میں کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتی تھی، جیسا گھبرا کر اس کے پہلو میں دھرے ساکن بازو کو پکڑ کر ملکا سا جھنجھوڑا۔

”حجاب.....!!!“ حجاب نے جیسے کراہ کر آنکھیں کھولیں، اس پہ نگاہ پڑتے ہی فی الفور نظر پھیر لی، بازو کھینچ کر پہنچ سے دور کر لیا۔

”چھوڑیں..... مت قریب آئیں میرے۔“ اس کے دبے ہوئے سینھے ہوئے لہجے میں

جنوری کا شمار ”سال نو نمبر“ ہوگا اس میں دیگر دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ مصنفین اور قارئین کی شمولیت کے لئے حسب روایت سروے بھی شامل ہوگا، آپ سب سے گزارش ہے کہ سوالات کے جوابات بیس دسمبر تک بھیج دیجئے گا۔
سوالات یہ ہیں۔

- ۱۔ کیا سال کیا دے گیا؟ کوئی خوشی، کوئی خوبصورت احساس یا آگہی؟
- ۲۔ 2018ء میں آپ نے خود سے کئی عہد و پیمان کیے ہوں گے، ان میں سے کتنے پایہ تکمیل تک پہنچے اور کتنے ادھر سے رہے؟
- ۳۔ مجموعی طور پر یہ سال کیسا رہا؟ اس سال کی کوئی خوش کن یاد جو آپ کے لبوں پر مسکراہٹ بھر دیتی ہے؟
- ۴۔ اس سال نوز چینل، سیاست، کھیل، شو بیز اور تحریر و تخلیق کے میدان میں مختلف شخصیات نمایاں رہیں آپ کو کس شخصیت نے متاثر کیا یا اچھی لگی اور کیوں؟
- ۵۔ اس سال آپ کے مشاغل اور مصروفیات کیا رہیں، کوئی نیا احساس، سوچ اور فکر ملی؟

کر لاہٹ تھی کوئی، عمر بے ساختہ پیچھے ہٹا، چہرے پہ موجود تشویش ڈھل گئی۔

”میں یہ بتا رہا تھا کہ شام تک حالہ جان آئیں گی تم سے ملنے اور.....“

”کیوں.....؟“ حجاب کو جی بھر کے اضطراب نے گھیرا۔

”تمہاری طبیعت کا پتا چلا تو پریشان ہو گئیں۔“

عمر اسے دیکھے بغیر جواب دے رہا تھا، کیسی قیامت تھی وہ ایک دوسرے سے نظریں ملاتے

شرسار ہوئے جاتے تھے۔

”آپ نے کیوں بتایا انہیں.....؟“ وہ بے ساختہ چیخ پڑی، چہرے پہ اذیت کے کتنے رنگ

اتر آئے تھے۔

”مجبوری تھی بتانا، حرم کے دلبرہ کی تقریب میں شامل نہیں تھے ہم۔“

عمر رساں سے کہہ رہا تھا مگر حجاب کی کوفت دکھ اور اذیت بڑھ رہی تھی۔

”انہیں منع کریں، میں ہرگز کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“ وہ پھر سے رونے لگی۔

”اپنی ماں سے بھی نہیں؟“ عمر نے چونک کر سوال کیا۔

”ہاں نہیں۔“ حجاب نے ہذیبائی انداز میں جواب دیا، اس کے رونے میں شدت آرہی تھی،

عمر ہونٹ پیچھے اسے دیکھتا رہا۔

”میں انہیں منع نہیں کر سکتا، سوری۔“ یہ جواب حجاب کو قابل قبول نہیں تھا، مارے طیش کے

اس کی دودھیا رنگت سے لہو سا جھلکنے لگا۔

”آپ جان بوجھ کر مجھے اذیت دینا چاہ رہے ہیں۔“ وہ سسکی، عمر نے سر دآہ بھری تھی۔

”میں تمہارا مجرم ہوں حجاب..... اعتراف ہے مجھے..... میں جو تمہارا محافظ قرار پایا تھا، تمہاری

بربادی کے وقت کوئی کردار ادا نہیں کر سکا، تم ٹھیک نفرت کر رہی ہو مجھ سے، بالکل ٹھیک سوچتی ہو

میرے متعلق، مگر اس کے علاوہ ایک تمہاری ذات بھی ہے، جس پہ کوئی انگلی نہ اٹھے، میں یہی چاہتا

ہوں جتنی جلد ممکن ہو سکے، اپنے زخموں کی رفوگری کر لو، یہ تمہیں ہی کرنی ہے، اتنے گہرے پردے

گر الو خود پہ کہ کوئی تمہاری ذات پہ لگنے والے اس بد نما داغ کو نہ دیکھ سکے، اتنی مجھے تم معاف نہ بھی

کرو تو یہی میرے لئے بہتر ہے، تمہاری بے اعتنائی اور نفرت مجھے میری کوتاہی کا احساس دلاتے

رہے گی، یہی میری سزا ہونی چاہیے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا، پلٹ کر تیزی سے

کمرے سے نکل گیا، حجاب مزید کچھ نہ بولی، اس کے بے بس لاچار آنسو خاموشی سے بہتے رہے

تھے اور نیکے میں جذب ہوتے جاتے تھے۔

☆☆☆

راہ جنوں پہ چل پڑے جینا محال کر لیا

ہم نے تلاش یار میں خود کو نڈھال کر لیا

کیسے وہ دن تھے پیار کے خود پہ بڑا یقین تھا

پل میں جدائی ڈال لی پل میں وصال کر لیا

چیتے رہے وصال میں مرتے رہے فراق میں

یہ بھی کمال کر لیا وہ بھی کمال کر لیا
اپنی بھی کچھ خبر نہیں دل کی بھی کچھ خبر نہیں
ہم نے تمہارے ہجر میں کیسا یہ حال کر لیا

گامڑی تیز چل رہی تھی اور ماحول میں خاموشی نہیں تھی، حمدان اور غانیہ دونوں مسلسل بات چیت کر رہے تھے، گفتگو کا موضوع حجاب کی ذات ہی تھی، عمر کی اطلاع کہ اس کی طبیعت کی خرابی کے باعث ولیمہ میں شریک نہیں ہو سکتے غانیہ اور حمدان کو تشریف کی گہری عین کھائی میں اتار گئی تھی، نیب چوہدری سے مصطفیٰ یہ بات چھپائی گئی تھی، یہ بھی شکر تھا کہ واپسی پہ وہ اپنے کسی سیاسی ساتھی کے ساتھ اس کے ہمراہ چلے گئے تھے اور ان لوگوں کا بھرم رہ گیا تھا۔

”پہلے انہیں گھر چھوڑ دیتے ہیں۔“ حرم کے سرال سے نکلتے ہی حمدان نے اس سے گلو خلاصی کا پروگرام مرتب کیا تو غانیہ حیران ہو گئی تھیں۔

”کیوں ابھی..... قدر ہمارے ساتھ جائے گی، کیوں قدر بیٹے؟“ انہوں نے محبت سے کہتے اسے دیکھا، اسے حمدان کی بات بری لگی تھی، جیسی ہونٹ پیچھے بیٹھی تھی، اس سوال پہ تہ نظروں سے حمدان کو ضرور دیکھا۔

”انہیں پتا ہوگا، جو یہ بات کہہ رہے ہیں، کیا شک میری زندگی کے فیصلوں کا سارا اختیار ان کے ہاتھ میں جو آ گیا ہے۔“ وہ سلگ سلگ جا رہی تھی، اتنی تیاری کا فائدہ جب وہ اک نگاہ بھی نہ ڈالے، آگ لگے اس تیاری کو، اس کا تو دل رونے کو چاہ رہا تھا، وہاں سب نے کتنی تعریفیں کیں، یہاں تک کہ حمدان کے سامنے بھی اسے سراہا۔

”حمدان صاحب آپ کی بالکل یگ سی مزاتی کیوٹ اتنی پیاری ہیں کہ آپ کا مشہور و معروف حسن و جمال بھی ان کے سامنے بالکل ماند پڑ گیا ہے۔“ اس کے ایک کو لیک کی بیوی نے ہنستے ہوئے کہا تھا وہ تب بھی کاندھے جھٹک کر سگریٹ کے کس تو لیتا رہا اسے دیکھنا گوارا نہ کیا، نہ جواب میں کچھ بولا۔

”بھئی یہ کیا بات ہوئی ایس پی صاحب، اتنی پیاری بیوی پا کے بھی آپ کے سوئے ختم نہیں ہوئے، حالانکہ پہلے کہتے تھے شادی ہوتے ہی سگریٹ چھوڑ دوں گا، ویسے بھی سنا ہے بیوی حسین ہو تو سگریٹ کی طلب نہیں رہتی۔“

خاتون بہت شوخ اور چلبلی تھیں، مزے سے گفتگو کرتی تھیں ہر قسم کی۔

”اگر طلب پوری نہ ہو تب بھی سنا ہے عادتیں نہیں چھوڑتیں۔“ اس بار وہ بول پڑا تھا، نہ صرف جواب دیا بلکہ آج دینی نظروں سے قدر کو بھی بالخصوص دیکھا، قدر کا دل یکدم گہرے پاتال میں گرا، اس نے صاف محسوس کیا حمدان نے کیا چوٹ کی ہے، اس کا رنگ بے ساختہ متغیر ہوا، حمدان تو نگاہ کا زاویہ بدل گیا مگر وہ خود کو جلد نہیں سنبھال سکی۔

”کون سی طلب پوری نہیں ہوئی۔“ خاتون ایک دم متحس ہوئیں، دلچسپی یکدم نقطہ عروج پہ جا پہنچی۔

قدر جزب ہو چکی تھی، حمدان کو بھی یہ انتہائی ذاتی سوال کچھ بھایا نہیں، دونوں خاموش اور لا تعلق

ہو گئے تو خاتون کو خود ہی احساس ہو گیا تھا، جیسی بات کا رخ بدل دیا۔
 ”کیا یہ ممکن ہے کہ قدر نے آپ کو اسموکنگ سے منع نہ کیا ہو، قدر واقعی۔“ وہ بے تکلفی سے
 اگلا سوال کر رہی تھی، قدر کا ضبط جواب دے گیا تھا اب بالآخر۔
 ”مجھے کسی کے پرسنل میں انٹرفیئر ہونا پسند نہیں، ہر کوئی اپنی مرضی اور زندگی کا مالک ہوتا ہے،
 ہوتا بھی چاہیے۔“ ہونٹ سکڑ کر اب کے وہ ایسے نخوت سے بولی تھی کہ خاتون کو اگلے سوال کی
 جرأت نہ ہو اور ایسا ہی ہوا، خاتون کھٹک لی تھیں۔

”کیا واقعی..... کیا واقعی میں اپنی مرضی کا مالک ہوں؟ خاص کر آپ کے معاملے میں خان
 زادی؟ اگر واقعی ایسا ہوتا تو ہماری زندگی ایسی ہی ہوتی جیسی ہے؟“ اس کا موڈ ہنوز خراب تھا، جب
 حمدان کے پے در پے ہونے والے سوالوں نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا، کیا کچھ نہ تھا اس کے
 انداز میں اس کے کچھ میں اس کی آواز میں، کچی تپش آج اور سرد مہری، قدر نے چونک کر اسے
 دیکھا، وہ تو تھا ہی متوجہ، وہ اس کی نظروں سے نظریں چار نہ رکھ سکی، فی الفور پلکوں کی جھلریاں گرا
 گئی، ان جھلریوں پہ مستقل لرزش اتری اور گلابی رنگت میں لہو سا تیرنے لگا، البتہ وہ بولی کچھ نہ تھی،
 یہاں تک کہ حمدان کی سوال پہ زہر خند نظریں اس کے چہرے سے ہٹ گئیں، حمدان وہاں سے دانستہ
 پرے چلا گیا جبکہ قدر روہاٹی ہوتی رہی تھی، حمدان کا یہ جتنا اسے اذیت میں مبتلا کر گیا تھا، جتنے
 چھی نقصان ہوئے تھے ان میں وہ اکیلا حصہ دار تو نہ تھا، قدر برابر کی شریک تھی مگر وہ تو مجرم ہی اسے
 سمجھتا تھا، پھر دکھ کی بات تو تھی، وہ سب کچھ بھول کیوں نہ جاتا تھا، ویسے ہی جیسے وہ بھولنے کی
 کوشش کر رہی تھی۔

”میں تو اسے لئے کہہ رہا تھا نازک مزاج پہ کچھ گراں نہ گزرے، بہر حال اعتراض مجھے کیا ہو
 سکتا ہے، ہم تو انہیں اپنے ہمراہ ستاروں کے سفر پہ لے جانا چاہتے تھے، یہ خود ہی نہیں مانتیں۔“
 اگلی بات حمدان نے دانستہ ایسے کہی کہ صرف وہی سن سکے، قدر نے چونک کر اسے دیکھا وہ
 متوجہ نہ تھا، اس حسین بات کا بھی کوئی تاثر اس کے چہرے پہ نہیں تھا، یہاں تک کہ قدر کو اپنی
 سماعتوں کا دھوکہ محسوس ہونے لگی یہ بات۔

”میری خواہش ہے میرے بیٹوں بچوں کو اللہ جلد خوشخبری عطا فرمادے، پھر صحیح معنوں میں
 خود کو مکمل محسوس کروں گی۔“

غانیہ خاصی ریلیکس تھیں، مسکرا کر گویا ہوئیں، قدر نے پھر بے ساختہ حمدان پہ نگاہ کی، وہ
 لا تعلق تھا اور مکمل طور پہ ڈرائیونگ میں مگن، قدر کو اس نا قدری کے احساس نے عجیب سے دکھ میں
 مبتلا کر چھوڑا۔

حجاب سے بھی پھر وہ اسی احساس کے ہمراہ ملی، سرسری سا اور ایک سائیڈ پہ بیٹھ گئی تھی، چائے
 بھی ڈھنک سے نہیں پی، عمر نے انہیں اتنی رات کو واپس جانے کی کسی طور اجازت نہیں دی اور
 وہیں ان کے سونے کا انتظام کروا دیا، قدر بہت تھکاؤٹ محسوس کر رہی تھی، مزید وقت ضائع کیے
 بغیر اٹھ کر کمرے میں آگئی، حمدان البتہ ماں سے تنہائی میں بات کرنے کو بے قرار ہوا تھا۔
 ”مما.....!“ وہ جیسے ہی کمرے میں جانے کو اٹھیں ان کے پیچھے چلا آیا۔

”میں جانتی ہوں بیٹے آپ بہت سی باتیں کرنا چاہ رہے ہو مگر یہاں کچھ بھی کہنا بالکل مناسب نہیں، کل تک ویٹ کرو۔“ انہوں نے گردن موڑ کر لکھ بھر کو رکتے کہا اور پلٹ کر کمرے میں چلی گئی، حمدان گہرا سانس بھرتا سگریٹ سلگانے لگا، اسے عجیب سی تشویش گھیر رہی تھی۔

”بیٹے آپ گئے نہیں کمرے میں؟ کیا نیند نہیں آرہی؟“ بی بی جان برتنوں کی ٹرے لئے وہاں سے گزریں تو اسے راہداری کے پتھوں بیچ کھڑے دیکھ کر حیرانی سے استفسار کیا، حمدان چونک گیا، سب سے پہلے سگریٹ ہی پھینکا، بزرگوں کا وہ بہت احترام کیا کرتا تھا اس معاملے میں۔

”جی..... بس جا رہا تھا۔“

”تمہاری بیوی بہت پیاری ہے ماشاء اللہ، خود بھی حسین ہو، بچے تو بہت پیارے پیارے ہوں گے تم لوگوں کے۔“ وہ مسکرا رہی تھیں، حمدان کے چہرے پہ جو مسکان تھی وہ بھی، وہ بھی جیسے کسی غیبی ہاتھ نے نوحہ لی۔

(کاش وہ دل بھی پیارا رکھتی)۔

اس کے دل سے گویا ہوک انھی، کمرے میں آیا تو اسے جوں کا توں بستر پہ گرے پایا، یہاں تک کہ جوتے تک نہیں اتارے ہوئے تھے۔

”غالباً محترمہ آپ کا واپسی کا ارادہ ہے تو براہ کرم بیڈ خالی کر دیں میں تو آرام کروں۔“ سلگ کر کہتا ہوا وہ بستر کے کونے پہ ٹکا تو بگریٹ اور پرفیوم کی خوشبو از خود قدر کے گرد اک حسین سا حصار باندھ گئی، اس کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

”ایسے آپ کی بھڑاس نہیں نکلے گی، آپ ایسا کریں کوئی وزنی چیز اٹھا کر میرے سر پہ ماریں اور قصہ تمام کر دیں، ہمیشہ کو نجات حاصل ہو جائے گی۔“ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لئے وہ کہہ رہی تھی، حمدان نے ایسے طوفانی موڈ اور جواب پہ بہت چونک کر اسے دیکھا، کچھ دیر دیکھتا رہا، گویا سمجھ نہ پا رہا ہو یہ گلابی رنگت والی لڑکی کیونکر شہابی ہو رہی ہے۔

”کسی کا غصہ مجھ پہ اتارنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ناگواری سے بولا تھا، قدر پھری گئی۔

”کس کا غصہ؟“ وہ بھڑکی۔

”مجھے کسی کا غصہ نہیں ہے سوائے تمہارے۔“ اس کی منٹھیاں از خود بھینچنے لگیں، آنکھیں برسنے کو تیار، یہ سوز کا رنج کا کلال کا عالم بھی اس دلکش لڑکی یہ روپ کی بہار کے کرم کرتا تھا، حمدان کا موڈ لحوں میں کچھ کا کچھ ہوتا گیا۔

”میرا غصہ تو مجھ پہ ہی اتارنا چاہیے، تو اتارو، کیسے اترے گا؟“ وہ مسکرانے لگا، سوال کرنے لگا، حظ لے رہا تھا، قدر کچھ نہ بولی غصہ ہیجان کی جانب مائل تھا۔

”اتار لو بھئی..... موقع اچھا ہے، اجازت دے رہا ہوں، ویسے کیسے اتارو گی؟ کشش لڑو گی یا صرف گالیوں پہ اکتفا کرو گی۔“

”یار کشش لڑ لیتا، کچھ ہم بھی فریش ہو جائیں گے۔“ اب وہ سراسر اسے چڑھا رہا تھا، چھیڑ رہا تھا، قدر کی رنگت جانے کیوں دھک گئی، حمدان مسکراتے ہوئے شرٹ اتارنے لگا۔

”معذرت..... اسے اتارے بغیر نہیں رہ سکتا، ورنہ خطرہ بڑھ جائے گا تمہارے لئے، شادی

کی رات والی حسرت جتلانے کی اور زبردستی کرنے کی بیدار نہ ہو جائے، آخر اتنی پیاری بیوی کا شوہر ہوں بھی۔“ شرت اتار کر جھٹکا وہ اسے بالخصوص دیکھ رہا تھا، قدر ایکدم نظریں چما گئی، چہرا پھیر گئی، اتنی حجاب آلود کیفیت سے بھری کہ بے ساختہ صوفے پہ جا کر بیٹھ گئی، حمدان اس بے اختیاری حرکت پہ ہنسنے لگا تھا۔

”دیکھا ڈر نہیں، بس یہی ہے خان زادی کی بہادری۔“ وہ پھر اسے چڑانے لگا، قدر کچھ نہیں بولی، اس صورتحال نے حمدان کے بدلے موڈ نے اسے شپٹا دیا تھا، کہاں توجہ کی طلب تھی ملی تھی تو سرا سمیگی کا عالم انوکھا ہو گیا۔

”کاش تم ضد میں اکثر میں ہی کہو میں نہیں ڈرتی ورتی، اور آکر پورے اعتماد سے میرے برابر لیٹ جاؤ، اسی طرح وارے نیارے ہو جائیں میرے۔“ اس کی شوخی کا دائرہ وسیع ہونے لگا، مصنوعی آہیں بھڑتا کہہ رہا تھا، حجاب کے مارے قدر کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا، ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔

”چپ ہو جائیں آپ۔“ وہ بے ساختہ ٹوک گئی، تو حمدان یکدم ہونٹ بھیج بیچ گیا، اٹھا اور لائٹ آف کر دی، قدر وہیں بیٹھی رہی، جانے کیوں وہ اس کی پیش رفت کی منتظر تھی اور منتظر ہی رہی، یہاں تک کہ حمدان کے گونجتے خزانوں نے اسے مایوس اور ہرٹ کر ڈالا تھا، بے آواز بہتے آنسو اسے اس کی بے مائیگی کا احساس دلا رہے تھے۔

☆☆☆

چھوڑو یہ بات ملے زخم کہاں سے مجھے
زندگی پہ بتا کتنا سفر باقی ہے

”آپ جان بوجھ کر یہ سب کر رہے ہیں، مجھے اذیت دینے کو؟“ کرسی پہ بالکل ساکن بیٹھا وہ باہر بہتی تاریک رات کو خالی نظروں سے دیکھتا تھا، چہرے پر اضمحلال بکھرا ہوا ایسا تھا کہ دل ہول جائے، حجاب کی اس بات پہ شکایت یا پھر الزام پہ متاسفانہ سانس بھرتا ناچاہتے ہوئے بھی اس کی سمت متوجہ ہو گیا، انداز سوالیہ تھا۔

”مما اور بھائی کو کیوں روکا؟“ وہ ہذیبی انداز میں چلائی تو پہلی بار عمر کے چہرے پہ ناگواری اتری۔
”ان سب غیر اہم باتوں میں خود کو کھپانے سے بہتر ہے حجاب کہ آپ اس فکر میں مبتلا ہوں کہ اس سیاہی کی کالک ہمیشہ کے لئے ہمارے چہروں پہ نہ لی رہ جائے، اس گناہ کا کوئی بیج اگر پھوٹ نکلا تو زندگی میں اذیت کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے گا، دعا کریں اس پہلی آزمائش میں گرفتار اگر ہوئے ہیں تو اللہ اگلی آزمائش سے دو چار نہ ہونے دے۔“ وہ بولا تو اس کی آواز بھرا گئی، پہلے تو حجاب بھی نہیں جب سمجھ میں بات آئی تو جسم مرد ہو گیا، روکھنے کھڑے ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

حجاب کا جس طرح رنگ زرد ہوا، جیسے آنکھوں میں خوف نے ڈرے ڈالے، جس انداز کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں، عمر کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا، کہ غلط موقع پر صحیح بات کہہ بیٹھا ہے، زخم تازہ تھا، ابھی تو لبورسنے کا سلسلہ جاری تھا کہ اس نے اور ضرب لگا دی تھی، یعنی سفاکی پہ اتر آیا تھا، نصیحت بھی اگر وقت پہ نہ ہو تو بے اثر جاتی ہے، یہی حال یہاں ہوا۔

”حجاب!“

اس سے قبل کہ وہ اس کی غیر ہوتی حالت پہ اٹھ کر اس تک جاتا وہ..... وہ پورے قد سمیت دھاڑ سے گری تھی، یوں جیسے کسی طوفان کی زد پہ آیا درخت جڑوں سمیت اکھڑ کر زمین بوس ہو جائے۔

”حجاب..... حجاب۔“ وہ گھبرا کر بوکھلا کر اس کی جانب لپکا مگر حجاب حواس کھو چکی تھی، عمر کے تو ہاتھ پیر پھولنے لگے، اب وہ کیا کرے گا، گھر میں اس لڑکی کا میکہ موجود تھا، وہ کیا جواز پیش کرتا اس بے ہوشی کا انہیں جو اس کی خرابی طبیعت سے ہی از حد تشویش کا شکار ہو کر آئے تھے، ایک دن کی دہن کا یوں ہاتھ پیر چھوڑے بستر سنبھال لینا سو قسم کے شہوک و شبہات کو جنم دیتا ہے، اس پہ یہ قیامت وہ تو سراسیمہ ہوا جاتا تھا۔

”حجاب..... خدا را آنکھیں کھولو، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کے منہ پہ چھینٹے مارتا ہوا وہ روہانسا ہوا جاتا تھا، مگر حجاب کے وجود میں کوئی تحریک بیدار نہ ہوئی، وہ حواسوں سے باہر کیا ہوئی تھی، وہ تو جیسے ہر غم سے نجات حاصل کیے سکون کی کیفیت میں بے سدھ لیٹی تھی۔

”حجاب اٹھ جاؤ خدا را..... یا اللہ رحم۔“ اب وہ اس کے ہاتھ مسل رہا تھا، بے بسی سے رب کو پکارا، گلاس میں بچا سارا پانی اس کے منہ پہ انڈیل دیا، ناک پکڑ کر زور سے دبایا حجاب نے یکدم جھرجھری سی لی، منہ سے گراہ نکلی تھی، گویا وہ ہوش میں آ رہی تھی، عمر کے چہرے پہ ذرا سا سکون لوٹا۔

”حجاب..... پلیز..... مجھے دیکھو..... آنکھیں کھولو میری جان۔“ وہ اس پر جھک گیا، حجاب نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں، ان نظروں میں کوئی احساس کوئی پہچان نہیں تھی اور نقاہت بھرے انداز میں گہرے گہرے سانس بھرنے لگی۔

”خود کو سنبھالو پلیز..... ایسے مت کرو۔“ عمر کی اپنی آواز بھرا گئی، آنسو پلکوں کی دہلیز پہ آن ٹھہرے، کیسا بے بسی اور دکھ کا عالم تھا، جو بیان سے باہر تھا، حجاب اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کی رنگت خطرناک حد تک پہلی پڑ چکی تھی، عمر نے اسے اٹھا کر بستر پہ لٹایا، اس کے کپڑے کیلے ہو چکے تھے، وہ نظریں چراٹا غلٹ میں فریج سے جوس کا ٹن پیک نکال کر لایا اور اس کی سیل توڑی۔

”پلیز دو گھونٹ لے لو، سکون ملے گا۔“ اس کی آواز میں نرمی ہی نرمی تھی، حجاب کے رغبت ظاہر نہ کرنے کے باوجود اس نے زبردستی سے جوس پلایا تھا۔

”مجھے معاف کر دو حجاب۔“ حجاب نے ہاتھ سے جوس کاٹن دور ہٹایا تو عمر اس کا اٹھایا ہوا سر واپس تکیے پہ ڈالتا بھیگی آواز میں بول پڑا تھا، حجاب کچھ نہیں بولی، نہ اسے دیکھا، البتہ آنکھوں سے سیل رواں جاری ہو گیا۔

(کاش میں مرجانی، یہ وقت دیکھنے سے پہلے مرجاتی)۔

اس کی سسکیاں ہچکچوں میں ڈھلنے لگیں، کروٹ بدل کر وہ منہ دوسری سمت پھیر گئی تھی، کچھ دیر تک ذہین بالکل تاریک رہا، پھر جیسے بے ہوشی سے قبل کی عمر کی بات یاد آئی، اس کے وجود پہ لرزہ سا طاری ہونے لگا، یہ لرزہ اتنا بڑھا کہ باقاعدہ جھکوں کی صورت اختیار کر گیا۔

”یا اللہ.....!“ وہ کراہی تھی، تڑپتی تھی، بلکی تھی۔

”تو اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے، مگر مجھے مزید آزمائش میں نہ ڈالنا، میرے اللہ تو میری دعا کو قبول فرما۔“

وہ یونہی گڑ گڑاتی رہی تھی، وہ یونہی تڑپتی رہی تھی اور رات بیتی جاری تھی، گزرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

بے سبب تو نہ تھیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بڑھا لینا
آنسوؤں کو کہیں چھپا لینا
کائناتی ڈوبتی صداؤں کو
چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب بھی کبھی کبھی ہنسنا
جب بھی بات ہو کوئی خفی کی
موضوع گفتگو بدل دینا
بے سبب تو نہیں تھیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا

ساری رات وہ ایسے ہی بے قرار رہی، صبح بھی جلدی اٹھ کر بیٹھ گئی، جبکہ حمدان بے سدھ نیند میں گم تھا، مدھم روشنی میں اس کا کڑیل جوان وجود بستر پہ دراز کشتی کشش کا باعث تھا، یہ قدر کا دل جانتا تھا، تبدیلی اور ایسی زود آور، وہ بے بسی کے احساس سے سلگے جاتی، دل ایسا روہانسا ہوا جاتا تھا اسی بے بسی کے باعث کہ چاہتا تھا بے خبر سوئے بندے کو جھنجھوڑ کر جگا ڈالے، اس بے بسی پہ ملامت کرے جھگڑے شکایت کرے اور پھر اسی چوڑے سینے پہ سر رکھ کے منہ چھپا کے آنسوؤں کی صورت ساری بے بسی بہا دے، مگر یہی تو سب سے مشکل تھا، وہ اپنی اتنا قربان کرنے کو تیار نہ تھی، اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی تڑپ رہی تھی اور ختم ہو رہی تھی، فجر کی اذان کی پہلی پکار پہ ہی اٹھ بیٹھی، پہلو مسلسل کروٹیں بدل بدل کر تیش ہو رہے تھے، وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی، بہت عرصے بعد بہت ڈوب کے دعا مانگی تو آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

”یا اللہ..... یا اللہ“ اس کی زبان یہ یہی ورد جاری تھا، الفاظ دم توڑ گئے، ساتھ چھوڑ گئے، وہ رب سے کیسے مانگتی اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی، ہر کیفیت کے غماز آنسو تھے بس۔ نماز کے بعد دل کچھ ہلکا ہوا، جائے نماز رکھ کر کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی، اس نے بہت کم رات کو رخصت ہوتے روختی کو برا جہان ہونے کا منظر دیکھا تھا، سورج کا طلوع ہونا اک امید بھی سوچتا ہے اس نے اسی وقت جانا، وہ قدرت کی صنایع میں مگن تھی جب دروازہ بج اٹھا، بہت بری طرح سے چونک کر وہ متوجہ ہوئی تھی۔

”السلام علیکم.....!“

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ٹرے سیت بی جان کو دیکھ کر بے ساختہ سلام کیا، اور ٹرے ان سے لے لی۔

”وعلیکم السلام جیتی رہو، خدا سدا سہاگن رکھے، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔“ انہوں نے جواباً دعاؤں کے خزانے لٹا دیئے۔

”کھڑکی سے آپ کو جاگتے دیکھا تھا، خوشی ہوئی یہ جان کر اتنے بڑے باپ نے بیٹی کی تربیت خوب کی، ماشاء اللہ سحر خیز ہیں، سوچا کچھ مہمانداری کر دوں، جلدی جاگنے والے ناشتہ بھی جلدی کرتے ہیں، مگر اسے ناشتہ نہ سمجھنا بیٹا، زیادہ دیر خالی پیٹ نہ رہو اس لئے دودھ لائی ہوں، ناشتہ تو ابھی بتاؤں گی ابھی پی لی لینا اور یہ حمد ان میاں نہیں اٹھے؟ انہیں بھی جگاؤ بیٹے، دودھ پیش کرو۔“

بی جان بولنے کی شوقین لگتی تھیں یا پھر اس کے ساتھ ہی بے مکان بول رہی تھیں، اس آخری بات نے ضرور قدر کو جز بزد کر دیا۔

”میں چلتی ہوں، ناشتہ کا انتظام کروں۔“ وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتیں پلٹ گئیں، قدر نے گہرا سانس بھرا اور دوبارہ صوفے پہ آئی، خوب صورت سی نازک ٹرے میں کاج کے دو ہمین گلاس دودھ سے بھرے رکھے تھے، اس نے ایک اٹھا کر گھونٹ بھرا، دودھ خوش ذائقہ اور خوشبو دار تھا، وہ آہستہ آہستہ سارا پی لگئی، گلاس واپس رکھ رہی تھی جب حمد ان نے نظر گئی جو نہ صرف اٹھ کر بیٹھ چکا تھا بلکہ سگریٹ بھی سلگا لی تھی، سگریٹ کے ساتھ وہ بھی سلگ گئی گویا، جی میں آئی غصے میں اٹھ کر جھپٹ لے، مگر ایسا حق کوئی وہ کہاں رکھتی تھی بھلا۔

”صبح کوئی اور کام نہیں ہے؟ سارے کمرے میں سمیل پھیلا دی ہے۔“ ناگواری سے کہتی وہ اٹھ کر کھڑکیاں کھولنے لگی، حمد ان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا، مسکرایا تھا۔

”کیوں نہیں ہے اور کام میں تو کب کا منتظر تھا کہ شاید بی جان کی ہدایت کے مطابق بیگم سلبہ آکر پیارے ناز سے اٹھلا کر ہمیں جگائیں، دودھ پیش کریں مگر جب ایسا کچھ نہ ہوا تو مجھے بیچارے غریب نے سگریٹ پہ اکتفا تو کرنا ہی تھا؟“ آہ بھر کے وہ کتنی مصنوعی بے بسی سے کہہ رہا تھا، قدر کے چہرے پر عجیب سا رنگ بکھر گیا، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

”چانس تو ابھی بھی باقی ہے، جاگ اگر خود گیا بھی ہوں تو دودھ تو پیش کر سکتی ہو۔“ وہ اسے شوخ نظروں سے دیکھتا تھا، قدر کا دل سینے میں ڈانوا ڈول ہونے لگا۔

”پکڑیں..... صرف اس لئے دے رہی ہوں کہ سگریٹ پھینک دیں۔“ اٹھ کر گلاس اس کے آگے کرتی وہ بظاہر نخوت سے کہہ رہی تھی، حمدان جانے کیوں مسکرایا، گلاس کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، قدر چونک سی گئی، برقی روکا ہلکا سا جھٹکا اس کی آنکھوں کی پوروں کے ذریعے اس کے پورے وجود میں پھیل گیا، اس نے کسمسا کر ہاتھ چھڑایا تھا۔

”کیا واقعی اس لئے پیش کر رہی ہو اور کچھ نہیں؟“ حمدان اس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا گویا۔

”شرٹ رات کو اتارنا مجبوری تھی آپ کی..... اب رات ختم ہو چکی ہے غالباً۔“ سوال گندم جواب چنا، وہ بات بدل گئی تھی، حمدان کا قبضہ بے ساختہ تھا۔

”عجب لڑکی ہو یا رتم..... بیوی بن کر بھی ان باتوں سے ابھی تک کتراتے ہو۔“ ہلکی سی جھلاہٹ سے کہتا وہ شرٹ اٹھا کر پہننے لگا، قدر واپس صوفے پہ جا بیٹھی، حمدان واش روم میں جا گھسا تھا، منہ ہاتھ دھو کر آیا تو تویہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا جب قدر نے پھر اٹھ کر تویہ اٹھا کر اس کے آگے کیا تھا، حمدان اب کے بہت بری طرح چونکا۔

بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں
دل کی بربادی کے سب آثار نظر آتے ہیں

”ہے نا.....؟“

اسے شوخ نظروں سے دیکھتا وہ کتنی معنی خیزیت سے سوال کر رہا تھا، قدر کے چہرے کا رنگ یکدم سرخ پڑ گیا، گڑبڑاتے ہوئے تویہ اس کے منہ پہ دے مارا۔

”خوش نہیں ہوتے، اس کے باوجود اس کو لے کر جتنا مرضی اونچا اڑ لو۔“ ناک چڑھا کر وہ نخوت سے بہتی جھلکے سے پلٹ گئی مگر اگلا قدم نہیں اٹھا سکی، اس کی کلائی حمدان کی پر حدت گرفت میں جا چکی تھی۔

”یقین کے رنگ نہیں ہوتے کہ ثبوت کے طور پہ پیش کر دیئے جائیں، بہر حال نہ مانو مگر اک دن ضرور اعتراف کر لو گی۔“ اس کا اعتماد ایسا تھا کہ قدر ہکا بکا رہ گئی، جبکہ وہ اسی یقین کے ساتھ گنگنا رہا تھا۔

تیرا وجود رواجوں کے اعتکاف میں ہے
میرا یقین تیرے عین شین قاف میں ہے

منہ پونچھا اور تویہ واپس اس کی طرف پھینک دیا، قدر محض اسے گھور رہی تھی۔

”وقت بیت جانے سے قبل اعتراف کر لو گی تو فائدے میں رہو گی۔“ حمدان نے دودھ کا گلاس اٹھا لیا، انداز مشورہ دینے والا تھا، قدر کا غصے سے رنگ لال سمجھو کا ہوا، البتہ بولی کچھ نہیں، اتنی ہلکی اور سستی سمجھتا تھا وہ اسے۔

ہم جا رہے ہیں وہاں جہاں دل کی ہو کوئی قدر
بیٹھے رہو تم اپنی اتانیں سنہال کر

باہر نکلے ہوئے وہ پھر گنگنا، گویا اسے زچ کیا، قدر ابھری گئی، گود میں دھرا اس کے پس اور

خوشبو سے مہکتا تولیہ اٹھا کر دور پھینکا، وہ سخت روہانسی ہو رہی تھی جیسے۔

☆☆☆

کھڑکی چاند کتاب اور میں
مدت سے اک خواب اور میں
شب بھر کھلیں آپس میں
دو آنکھیں اک خواب اور میں
سوج اور کتنی ساحل پر
دریا میں گرداب اور میں
شام، اداسی، خاموشی
کچھ کنارے تالاب اور میں
ہر شب پکڑے جاتے ہیں
گہری نیند تیرے خواب اور میں

وہ سر نیوڑائے میڑھیوں پہ بیٹھی تھی، زندگی جیسے رک گئی تھی، روشنی سبک رفتاری سے پھوٹی اور
ہر سو پھیل گئی جب اولیں نے ادھ کھلے دروازے سے اندر قدم رکھا، قدموں میں اس کے
لو کھڑا ہٹ کے باوجود چال میں محسوس کی جانے والی مستی تھی، شانزے نے اسے آنکھیں سکڑ کر
دیکھا تو صاف جانا اس وقت وہ نشے میں ہے۔

کو کبھی پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

وہ ڈگمگاتا ہوا ڈولتا میڑھیوں کی طرف ہی آیا تھا، میڑھیوں سے اوپر چھت پہ اس کا کرا تھا،
شانزے اٹھ کر کھڑی ہوئی تب اولیں نے پہلے زینے پہ قدم رکھا تھا۔
اس نے خوشبو کی طرح.....

معاوہ قہم گیا، آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور پہچان کا مرحلہ طے کرتے ہی منہ لگاڑ لیا۔

”تم پھر یہاں کیوں پائی جا رہی ہو؟“ ناگواری اس کے ہر انداز سے عیاں تھی، مگر وہ بھی
شانزے تھی ان معاملوں میں حد سے بڑھ کر بے پرواہ اور بے شرم۔
”دو جھٹکے لگے اور ماموں نے سارے بچے بیاہ دیئے، دل جل رہا تھا اس کا، وہ سب کیسے
دیکھتی یہاں چلی آئی۔“

وہ روہانسی ہو کر بیٹا رہی تھی، جیسے وہ واقعی اس کا ہمدرد ہو، خود ساختہ دکھوں کو جتنی اہمیت دی
جائے یہ اتنا ہی سر پر چڑھتے ہیں مگر وہ اس بات کو کہاں سمجھ سکتی تھی۔

”ترس ترس کر جھنے سے بہتر نہیں کہ اگر حق نہیں مل رہا تو بڑھ کر جھین لو، جیسے میں نے جھین
لیا۔“ وہ مسکرایا اور سر دھننا، گویا خود اپنے آپ کو داد دی تھی اپنے کارنامے پہ۔

تمہی سے ہیں سائیں تمہی سے ہے دھڑکن
تمہی سے ہے یہ زندگی.....

بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر اسی نشیلے انداز میں گنگٹا نے لگا، سر دھنسنے لگا، شانزے چوٹک اٹھی تھی، اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کیا کہا تم نے.....؟ کیا کیا ہے؟“ وہ بے صبری سے سوال کر رہی تھی، اولیس نشے کے باوجود ذومعنی انداز میں مسکرایا۔

”تمہیں کیسے بتا دوں، راز کی بات ہے اور تم ٹھہری پوری کتنی.....“ وہ اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا، جیسی وہ برس پڑی۔

”شٹ اپ۔“

”شٹ اپ کی خالہ..... سائیڈ پہ ہو، بس اتنا جان لے تیرے لئے کافی ہے کہ۔“

میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم ناواقف ہو

جس پہ مجھ کو پیار آ جائے اس کو پاگل کر دیتا ہوں

چھوڑ کے مجھ کو جانے والا لوٹ کے واپس آئے گا

دائیں بائیں آگ لگا کر آگے جنگل کر دیتا ہوں

وہ چپک رہا تھا، کھلکھلارہا تھا، شانزے البتہ بے وقوفوں کی طرح اس کی شکل دیکھے جاتی تھی،

اولیس نے اسے کاندھے سے پکڑ کر سائیڈ پہ کیا اور اسے سر تا پا دیکھا۔

”ویسے بڑی تو اس حوالے سے تم بھی نمی ہو، تو پھر کیا خیال ہے؟“ اس کی نظروں کا عامیانہ

پن ہرگز ڈھکا چھپا نہ تھا مگر شانزے پھر بھی انجان بنی۔

”کیا مطلب؟“

”اتنی معصوم تو نہیں ہو، چلو کھل کر بتا دیتا ہوں کہ۔“

ہر فرد یہاں پر تاجر ہے

ہر وقت تجارت ہوتی ہے

تم آپ ہی اپنے دام کو

چھپ کے نہیں سرعام ہو

کیا لوگے اپنی یاری کا

کیا لوگے تم دلداری کا

سے خوار بنو گے کتنے میں

تم پیار کرو گے کتنے میں

”ہو گئی یکواس پوری تمہاری؟“ وہ اس دوران بھی اسے شٹ اپ، شٹ اپ کرتی رہی تھی مگر

اولیس رکا نہیں تھا اسے اچھی طرح زچ کر کے ہی باز آیا۔

”نہیں..... ابھی رہتی ہے۔“

میں اس کا ہوں اس راز کو تو وہ جان گیا ہے

وہ جس کا ہے یہ خیال مجھے سونے نہیں دیتا

اس کی زبان کے آگے تو خندق تھی، وہ ہارنے والوں میں سے تو تھا ہی نہیں، اس نئی تازہ ملنے

والی فتح نے تو خمار میں ڈبو دیا تھا گویا۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ شانزے چڑی، عجیب سی جیلسی فیل ہو رہی تھی اس پل حجاب سے کیسے قسمت کے دھنی تھے یہ سب بہن بھائی، کیسی دیوانگی کی حدوں کو چھوٹی محبتیں ان کے نصیب کا حصہ بن گئی تھیں مگر ان ناقدروں کو قدر پھر بھی نہ تھی۔

”ایک ہی تو ہے وہ انمول پری..... نعم البدل جس کا کوئی نہیں۔“ وہ مدہوش سا ہو کر بولنے لگا، شانزے نے منہ بگاڑ لیا، حد سے بڑھ کر بری لگی یہ تعریف، بالکل برداشت نہ ہو سکی۔

”اب اتنی بھی حسین نہیں، عام سی ہی ہے جیسے میں نے دیکھی نہیں۔“
”تمہیں کیا پتا..... تمہیں کیا معلوم ہم نے دیکھا ہے کہ۔“

اس کے رخسار پہ ٹھہرے ہوئے آنسو توبہ
ہم نے شعلوں پر چمکتی ہوئی شبنم دیکھی

وہ آہ بھر رہا تھا، شانزے کو اور طیش آیا، اندر کے کمرے سے سعدیہ نے جھانکا تھا۔

”تمہارا کمرہ اوپر ہے، تم جا سکتے ہو۔“

”اور یہ گھر تمہارا نہیں ہے، تم بھی جا سکتی ہو۔“

کوئی اویس کو کچھ کہے اور وہ اسے بخش دے ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔

”اب چلی جانا یاد ہے، یہیں نہ دھرنا دیئے بیٹھی رہنا، حمدان کی شادی ہم نے نہیں کروائی جو تم یہاں سوگ منانے چلی آئیں، اونہہ ماموؤں کے جان کا ایسا عذاب..... جو ملتا نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا، شانزے اس سے بہت کم جیتی تھی سو اس وقت بھی تمام تر ناگواری کے باوجود بولی نہیں کچھ البتہ اسے گھور کر اپنا قہر نکالتی رہی، جبکہ وہ گنگنا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، سعدیہ کچن میں چائے بنانے جا رہی تھی اسے بھی طلب محسوس ہوئی تو فرمائش داغ دی۔

”میرے لئے بھی لے آنا۔“

”کیوں.....؟ میں تمہارے باپ کی نوکر لگی ہوں، ہاتھ ٹوٹے ہوئے نہیں ہیں تمہارے خود بنا

لو، سازشوں کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔“

بڑے ماموں کے گھر لحاظ کا سخت فقدان تھا، ایک سے بڑھ کر ایک بے دید یہاں بیٹھا تھا، اس کی پید معاشیاں اور خباثت چھوٹے ماموں کے گھر ہی چل گئی تھیں، یہاں سب اس جیسے ہی تھے یہی وجہ تھی کہ فتح اس کے حصے میں ابھی تک آنے لگی تھی۔

”بے شری اور ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، مہمان ایک دن کا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ دو دن کا تیرے دن تو بلائے جان کہلاتا ہے مگر اس عورت کو یہ بات کون سمجھائے؟“ اس کے گلے پڑنے کے بعد اب کچن سے سعدیہ کے بڑبڑانے کی آواز اس تک بخوبی پہنچ رہی تھی، ہاتھوں میں سر تھامے وہ پریشان کن انداز میں بیٹھی رہی، اسے سمجھ نہ آئی تھی یہیں رکی رہے یا واپس منیب ماموں کے ہاں چلی جائے، وہاں اگر ایسی ذلت نہیں بھی تو پہلے سی اہمیت بھی نہ رہی تھی اور یہی چیز اس کے لئے بہت اذیت کا باعث تھی، وقت ایک جیسا نہیں رہتا اسے یقین آ گیا، یہ وقت اس کے لئے بہت تیزی سے بدل گیا تھا۔

وہ ہٹا رہے ہیں پردہ سر عام چپکے چپکے
 کوئی قتل ہو رہا ہے درپام چپکے چپکے
 عمر کا ولیمہ پی سی میں تھا، اعلیٰ پیمانے پہ تقریب تھی مگر دلہا دلہن دونوں ہی مضحل اور بہت
 خاموش نظر آتے تھے، خود یہ قابو پا لینے کے باوجود اتنا خود کو سنباٹ لینے کے باوجود بھی، سب سے
 زیادہ قدر اور حرم بلکہ گاری تھیں، قدر گئی تو چھب ہی نرالی تھی، آرکسٹرا پہ گیت بج رہا تھا، حمدان کا دل
 جانے کیوں مائل باکرم ہونے لگا۔

تھکی تھکی نگاہیں یہ حسیں حسیں اشارے
 تمہیں لے نہ جائیں شاید میری جان چپکے چپکے
 وہ آہستہ سے چلا اسی سمت آگیا جہاں قدر سب سے الگ تھلک تھکی تھکی سی بیٹھی تھی۔

کبھی شوخیاں دکھانا کبھی ان کا مسکرانا
 یہ ادا نہیں کر نہ ڈالیں میرا کام چپکے چپکے
 ”یہاں کیوں بیٹھی ہیں سب سے الگ ہو کر، وہاں جائیں گی آپ کو تلاش کر رہی ہیں، بہت
 سے لوگ آپ سے متعارف ہونا چاہ رہے ہیں۔“ اس کی سمت جھک کر وہ آہستگی سے احساس
 دلانے والے انداز میں بولا تو قدر گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

”ابھی یہی کام بھگتانی آئی ہوں، بہت تھک گئی تھی جیسی ذرا بیٹھی ہوں۔“ اس کے انداز میں
 واقعی تھکاوٹ تھی، حمدان مسکرایا۔

”میں اٹھا کر لے جاتا ہوں اگر اجازت ہو۔“ قدر نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا، رنگ
 سرخ پڑ گیا۔

”اپنے آپ میں رہو..... سمجھے۔“ وہ ایک طرح سے بری، حمدان نے سر دگر مصنوعی آہ
 بھری۔

تمہاری بے رخی پر بھی لٹا دی زندگی ہم نے
 ہمارا حال کیا ہوتا اگر تم مہرباں ہوتے
 قدر نظر انداز کیے اٹھی مگر ہائی جیل کا جوتا جانے کیسے مڑ گیا، وہ گرتے پجی، حمدان نے بروقت
 سہارا دے دیا تھا، چلو یہاں تک تو بات ٹھیک تھی، مگر وہ تو اسے چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
 ”میں نے کہا تھا نا اٹھا کر چھوڑ آتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کمر کے گرد بازو
 حائل کیے کھڑا تھا، قدر کو اس کی یہ حرکت بے حد آکروڑ لگی جیسی بے حد ناراضی سے اسے نہ صرف
 پیچھے دھکیلا اس پہ غصے میں الٹ پڑی تھی۔
 ”آپ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں یقیناً ورنہ ایسی حرکت نہیں کرتے۔“ حمدان نے ہاتھ تو ہٹا
 لئے مگر مجال ہے برا بھی مانا ہو، ہائے.....

کیا وقت نکالا ہے رنجش کا بھی ظالم نے
 جب خوب سنو رہا ہے تب ہم پہ بگڑتا ہے

قدر محبوب سی ہو گئی، آنکھیں جھک گئیں، ریشمی پکوں پہ لرزش اتر آئی، ایک لفظ مزید کہے بغیر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی، حمدان وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا، اس کا فون بجاتا رہا وہ چونکا تھا، کال ہیڈ کوارٹر سے تھی، وہ ایک دم الارٹ نظر آنے لگا۔

”مجھے ایمر جنسی میں جانا پڑ رہا ہے ماما“ غانیہ اور غیب اکٹھے ہی کھڑے تھے وہ انہیں مختصراً اس اہم ریڈ کے متعلق بتانے لگا جس کا اسے آرڈر ملا تھا، غانیہ تو سنتے ہی پریشان نظر آنے لگیں، اس قسم کی صورتحال انہیں حمدان کی طرف سے فطری تشویش میں مبتلا کر دیا کرتی تھی۔

”فی امان اللہ بیٹے، چلے جاؤ، بہر حال فرض کی ادائیگی کا معاملہ ہے، مگر یا حقیظ یا سلام کا ورد ضرور کرتے رہنا، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ ان کا انداز مخصوص قسم کا تھا رخصت کرنے کا، گلے لگایا پیشانی چومی دعاؤں سے نوازتے نصیحتیں کرتی رہیں۔

”جی بہتر، اجازت پیا۔“ وہ ان کے آگے جھکا، انہوں نے مسکرا کر اس کا مضبوط کاندھا تھمک دیا، حمدان پلٹ کر اسٹیج کی جانب آ گیا، حرم وہیں بھی حجاب کے پاس وہ ان سے مل کر بجلت میں اسٹیج کی سیڑھیاں اتر رہا تھا جب قدر سے پھر سامنا ہو گیا۔

”سنا ہے کہیں جاتے ہوئے اگر بیبی راستہ کاٹ دے تو صدقہ دے دینا چاہیے..... میں ماما سے کہتا ہوں، انتظام کر دیں گی۔“ وہ جاتے جاتے بھی اسے چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا، قدر سرے سے اس کی روانگی سے لاعلم تھی، کچھ ناچچی کے عالم میں کھڑی رہی، البتہ اس کی بات نے یا تھے پہ بل ضرور ڈال دیئے، کچھ کہے بغیر وہ اسٹیج پہ آئی تو حرم جو ان دونوں کو ہی مسکرا کر دیکھ رہی تھی پہلے ساختہ ہنسنے لگی۔

”بھائی تو آپ سے بہت سرسری سا ملے، حالانکہ رخصتی کا طریقہ یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس کے شوخ و شنگ انداز نے قدر کو ابھرن میں مبتلا کر دیا۔

”کس کی رخصتی؟“ وہ پریشان ہوئی تو حرم نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔
”اس کا مطلب بھائی نے دانستہ آپ کو نہیں بتایا، انہیں ڈیوٹی کے لئے ایمر جنسی کال کر لیا گیا ہے۔“

”کیا وہ واقعی واپس جا رہے ہیں؟“ اس نے حیرانگی سمیت ناراضگی سے گردن موڑ کر دیکھا، لوگوں کی بھجڑ میں اسے حمدان کہیں نظر نہیں آیا، جانے کیا ہوا ایلکیم انھی اور تیز قدموں سے چلتی پور ٹیکو کی جانب لپک آئی۔

”حمدان..... حمدان رکیں پلیز۔“ ہائی ہیل میں کھٹ کھٹ بھاگتی پیچ کلر کی مہین ساڑھی میں میچنگ میک اپ اور جیولری کے ساتھ غضب ڈھاتا اس کا چپکتی ڈال جیسا سر اپا دو دھیرا رنگت میں گلاب کھل رہے تھے، حمدان متحیر سا تھم کر اسے دیکھنے لگا، ایسی بے تکلفی سے تو وہ اسے بھی مخاطب نہ کیا کرتی تھی، اس نے اک نظر کھائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور ایک نظر پھر اس پہ ڈالی، نام نہان بہت شہرت تھا اس کے پاس پتا نہیں وہ اس سے کیا چاہتی تھی اب۔

”جی فرمائیے۔“ اس کا انداز بجلت آمیز تھا، سوالیہ تھا۔
”مجھے ساتھ جانا ہے۔“ قدر اس کی بجائے گاڑی کی سمت متوجہ تھی، دروازہ کھولا اور لباس

سمٹ کر نشست سنبھال لی۔

”مگر کیوں..... اس طرح سے۔“

حمدان کے اعصاب کو جھکا لگا تھا، اسے قدر کا یہ فیصلہ کیسے پسند آ سکتا تھا کہ وہ خاندان کی اتنی اہم تقریب ادھوری چھوڑ کر یوں اچانک واپسی کی راہ لے رہی تھی۔

”کیوں نہیں جاسکتی میں؟ تقریب تقریباً اختتام پذیر ہونے والی ہے۔“ قدر نے اس کا اعتراض رد کیا، اس کے انداز اور چتون خشکے تھے، حمدان نے یکدم ہونٹ پیچھنے لگے، اک لفظ کہے بغیر اندر بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی، اس کا موڈ آف ہو چکا تھا، اکلوتی بہو ہونے کے ناطے یہ بچکانہ حرکت قدر کو زیب نہیں دیتی تھی مگر وہ اس سے کیا کہتا اگر اسے خود احساس نہیں تھا، وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اور اپنی مرضی کی مالک بھی، پھر اس رشتے کو اس نے اس انداز میں قبول ہی کب کیا تھا کہ وہ اسے کوئی تقاضا بھانے کا کہتا۔

”مجھے پاپا کی طرف چھوڑ دینا۔“ ریلیکس ہو کر بیٹھے اس نے اگلا فراموشی پر دو گرام نشر کیا، حمدان کچھ نہیں بولا۔

البتہ اس کی سفید رنگت میں لہو سا چھلکنے لگا تھا، نظروں میں ایسا کڑا پن تھا کہ اگر قدر متوجہ ہوئی تو لازماً برا بھلا مانتی، چند منٹ گزرے تھے جب بالکل اچانک حمدان کا فون پھرزور و شور سے بجنے لگا، ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے اس نے دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔

”جی ماما جانی؟“ سلام کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا، قدر فطری طور پر اس کی جانب متوجہ ہو گئی، ادھر سے جانے کیا کہا گیا کہ حمدان کے ہاتھ یہ شکنیں بڑنے لگیں۔

”اس معاملے میں میں کیا کچھ بول سکتا ہوں ماما، مجترمہ کسی کو اپنے کسی بھی عمل کی جواب دہ نہیں ہیں غالباً، اپنی مرضی کی مالک ہیں، انہیں جو بہتر لگتا ہے کرتی ہیں، کسی کی مجال کی مداخلت کر سکے، جی جی..... میرے ساتھ ہی جا رہی ہیں۔“

وہ جھلا جھلا کر بول رہا تھا، قدر ایک دم چونک گئی، اگر پہلے شک تھا کہ بات اس کی ہے تو آخری فقرے سے یقین کامل ہوا، جیسی الرٹ نظر آنے لگی، معاملہ ایک دم ہاتھ بڑھایا اور حمدان کے کان سے لگا فون لے لیا۔

”چلو کوئی بات نہیں بیٹے، تم غصہ نہ کرو، ابھی تو بچی ہے، وہ ان باتوں کی کیا سمجھ، آپ اگر پیار سے اسے سمجھا دیتے تو ہرگز ضد نہ کرتی، تقریب سے واپسی پر تمہارے پاپا خود اسے وہاں چھوڑ دیتے۔“ غائب کی بات اس نے محل سے سنی تھی جو وہ یقیناً حمدان سے اس کے متعلق کر رہی تھیں۔

”کیا مجھے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا آنٹی؟“ وہ قدرے شرمسار ہو کر سوال کر رہی تھی، غائبہ یکدم چپ ہو گئیں، غالباً اندازہ نہیں تھا حمدان کی بجائے لائن پر وہ آچکی ہوگی۔

”جی تو نہیں مناسب بات مینے مگر اس اوکے، میں نے معاملہ سنبھال لیا ہے آپ ٹینشن فری رہو۔“ وہ مسکرا کر اسے تسلی دینے لگیں مگر قدر کے دل پر عجیب سا بوجھ ضرور در آیا۔

”سوری..... مجھے واقعی اس معاملے کی نزاکت کا اندازہ نہیں تھا، اچھو سبلی مجھے پاپا کی یاد آتی

اچانک اور شدت سے آئی کہ رک نہ سکی، آپ کو بتا کر بھی نہیں آئی، حالانکہ یہ تو کرنا چاہیے تھا۔“
ان ساری ندامت بھری وضاحتوں کے درمیان اسے حمدان کی طنز پر سر دنگاہ کا احساس شدت
سے ہوا، غانیہ اپنے مخصوص نرم رچاؤ آمیز انداز میں نہ صرف اس کی معذرت قبول کر گئیں بلکہ اسے
الثانلی سے بھی نواز دیا۔

”یہ بات آپ اگر مجھے اسی وقت بتا دیتے تو میں یہ حماقت نہ کر چکی ہوتی۔“ فون بند کر کے
ڈیش بورڈ پر ڈالتی وہ اس سے مخاطب ہو کر آف موڈ کے ساتھ بولی، حمدان کو اس ہٹ دھرمی پہ جی
بھر کے پیش آیا، یہ خوب رہی تھی، یعنی الٹا چور کو توال کو ڈانٹ رہا تھا۔

”تم بچی ہو، تمہیں نہیں پتا تھا تمہاری اور تمہارے منصب کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟“
وہ برس پڑا، قدر کار رنگ یکدم پھیکا پڑ گیا، آنکھوں میں اس خواہ خواہ کی ڈانٹ نے آنسو بھر
دیئے۔

”میں تمہیں جب بتاتا اگر میں اس حقیقت سے لاعلم ہوتا کہ تمہارے نزدیک اس رشتے کی
وقت کتنی ہے، جب یہ وقت نہیں تو اس کے تقاضے اور ان کی اہمیت از خود مضر ہو جاتی ہے۔“
حمدان اسی شدید موڈ کے ساتھ بات کر رہا تھا، قدر کچھ نہیں بولی، ہونٹ جھینے آنسو پتی رہی۔

”اور اسی موقع پر تمہیں باپ کی یاد آنا تھی، جبکہ میں جیسے جانتا نہیں کہ تم ان کے ساتھ کیا کیا
سلوک نہیں کر چکیں، جب ملنے آئے تھے تو شکل ان کی دیکھنا بھی گوارا نہ تھا تمہیں۔“ حمدان کا
غصہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، قدر نے تو گویا اسے چھیڑ کر بھڑوں کے جھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا،
یہ گرج برس ختم ہی نہ رہی تھی، قدر اب بھی کچھ نہ بولی، البتہ آنسو پینے کی کوشش بری طرح ناکامی کا
شکار ہوئی اور آنسو گالوں پہ لڑھک آئے تو اس نے تیزی سے رخ پھرا، وہ اس بے درد شخص کے
سامنے اپنے قیمتی خزانے کو بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ سلیمان نہیں تھا، اس کے باپ جیسا نہ تھا
کہ ان آنسوؤں پہ تڑپ جاتا، ڈانٹ کا سلسلہ موقوف کر کے لاڈاٹھانے شروع کر دیتا، سلیمان اول
تو اسے ڈانٹتے ہی نہ تھے، اگر کبھی ذرا سا ڈانٹ دیا تو وہ اتنا برا ماننی تھی، ایسے دل دکھتا تھا کہ
آنسوؤں کے دریا بہا ڈالتی، سلیمان کو تو لینے کے دینے پڑ جاتے، ازالے کو کیا کچھ نہ کرتے پھر جا
کے اس کا ذرا سا موڈ بحال ہو پاتا مگر یہاں ایسا کچھ نہ تھا، بلکہ حمدان کا مزاج مزید آتشیں ہو گیا تھا
اس کے بہتے آنسوؤں سے۔

”بند کریں یہ رونا دھونا، بجائے اس کے کہ اپنی غلطی پہ تادم ہوں آپ نے الثانیہ بہانے
شروع کر دیئے، حد ہے یعنی نازک مزاجی کی۔“ وہ بھڑک کر ڈانٹ کر بولا، قدر یکدم بالکل سرد پڑ
گئی، وہ اتنا سخت گیر ہو گیا یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا، عجیب آدمی تھا کبھی ایسے لالعلق ہو جاتا
اتنا سرد مہر کہ وہ روہاسی ہونے لگتی اور کبھی ایسے طوفانی اور تند انداز میں حق جتنا کہ قدر کے لئے فرار
کے سب راستے مسدود ہو جاتے، وہ محصور ہو جاتی جتنا بھی پھڑ پھڑائی مگر اس حصار سے نہ نکل پاتی
جس میں وہ اسے قید کر لیا کرتا تھا، اسے ایسے ہی زور آور چھا جانے والے مرد پسند تھے، وہ علی شیر کو
ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی، وہ تو پتا نہیں کیسا تھا، حمدان البتہ ایسا شدید مزاج ضرور رکھتا تھا، جیسے اب
اس معمولی بات پہ قہر برپا کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

ابجد سعادہ اور
فلک تنویر



میری سانس نے جفا کی ٹھانی تو میں سمجھوں گا کہ
میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی۔“
انہی بازگشتوں نے در پیچ کے آئینوں پہ
عجب ضرب دی، یہ وہ رعد تھی جس نے تمام ذبح
روح کو سماعت سے بے بہرہ کر دیا۔

”حورے! حورے!“ دروازہ ٹھاہ سے کھلا،
شمع دان ہاتھ میں پکڑے ایک ڈھلتی عمر کی عورت
نے اسے پکارا، ٹلکے اندھیرے میں شمع کی دائرہ
نما روشنی حور قس ہوئی تھی، پری رخ نے رخ
موڑا۔

”مورے.....“ لفظ ٹوٹ گئے، مورے
نے سوچا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے اور جب اس
نے کہنا شروع کیا، تو کچھ سمٹ کر سمندر بن گیا۔
”مورے.....“ دل ایک مرہیے کا مجموعہ
ہے، جو اپنی محبت کے میت پہ ماتم کناں ہوتا ہے،
میرے دل پہ مت جائیے میرا دل تو ایک کورا

”محبت کا مینا نور کے ساتھ خوشبو بھی دیتا
رہا، خوشبو بکھیرتی، نور پھیلانے جاتا، مگر پھر عجیب
سا واقعہ ہوا کہ اگلے دن کی ضمانت میں محبت کے
مینار میں سیاہی لگی اور آن کی آن میں محبت کا مینار
سیاہ کر گیا۔“

آسمان کیسی بیوہ کی طرح آنسو بہا رہا تھا،
چھاجوں چھانچہ منہ برس رہا تھا، در پیچ کے ساتھ
وہ کھڑی تھی، ٹلکے اندھیرے میں نیم جنوط زدہ
چہرہ معلوم ہوتا تھا، قسمت نے بھی کیا کھیل کھیلے،
بارات محبت میں میت محبت کا اٹھنا کیسا عجیب
مذاق ہے۔

آوازوں کی بازگشت سارے میں غم کی تہہ
دبیز کرتی تھی، انہی بازگشتوں نے جیسے کسی بوسیدہ
کتاب میں دبی سرگزشت کو گھسیٹ لیا۔
”تم میری زندگی ہو اور پتا ہے نا، زندگی
تب قائم رہتی ہے جب سانس چلتی رہے، جب

مکمل ناول



کاغذ ہے، کہ جس نے جو بھی رقم کیا وہ سانس رکنے سے تک نقش رہا۔“

ماں نے شیخ دان میز پر دھرا۔

”اس طرح مت سوچو دل بند ہو جائے گا۔“

”دل ہی تو بند نہیں ہوتا، مورے جب دل بند ہو جائے تو پھر ان آنسوؤں کی اتنی جرأت کہاں کہ میرے نین کنوروں میں محفل سجا بیٹھے۔“

”وہ سب اللہ کو منظور تھا، صبر کرو، صبر سے کام لو حورے۔“ ماں نے اسے سامنے بیٹھا دیا، قدھاری انار کے سے ہونٹ رعشہ زدہ تھے، سنہری شام کی سی رنگت پہ مٹے مٹے آنسوؤں کے نشان ثبت تھے، کان کے جھکے سے ایک آوارہ لٹ بے طرح الجھا تھا، نین کنوروں میں آنسوؤں کی ”لو“ سی پھیلی تھی، وہ حور عرش تھی، عرش کی حور، مگر زمین پہ اتار دی گئی تھی۔

”مورے! میرا نام حور عرش کیوں رکھا، اگر حور عرش ہوتی تو اس زمین پہ اترنے کا مفہوم؟“ شکوے میں آنسوؤں کی رمت شامل تھی۔

”وہ اللہ کو منظور تھا کہنا نا۔“ ماں نے لجاجت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”مگر میں بھی تو اللہ کی بندی ہوں۔“
”تو آزمائش تو اللہ کے بندوں پہ ہی اترتے ہیں۔“ اس نے حقیر سے ہاتھ ہٹایا۔
”آزمائش؟“

”ہاں حورے! آزمائش اللہ کے بندوں پہ اترتے ہیں۔“

”مگر حورے۔“ وہ انھی، درتچے کے پاس کھڑی ہوئی۔

”مگر مورے آزمائش تو اترتے ہیں تب۔“ جب انسان زندہ ہوتا ہے نا، بھلا مردوں پہ

آزمائش اترنے سے فائدہ کیا؟“ اس نے رخ موڑ کر ماں کو دیکھا، مگر ماں جا چکی تھی، وہ روتے روتے بیٹھ گئی اور پھر بیٹھ بیٹھ سو گئی۔

☆☆☆

صبح جیسے اترنے کو بے تاب کھڑی تھی، رات میں سارے درخت کھل کر نہا چکے تھے، سیلی سیلی ہوائیں اندر خون جمار ہی تھی، سوات پہ آج پھر سے غم زدہ فضا ٹھہری معلوم ہوتی ہے اور وہ حور عرش صبح ہی نہر کے پاس چلی آئی تھی۔

نہر محبوبانہ ہوا، سماں جگر میں مضطربانہ ہوا، نہرا نے اندر تمام عکس منعکس کیے بہہ رہی تھی، ہاں اس عکس میں ایک وہ بھی تھا۔

بید کے درخت کے ساتھ، رخ بستہ سردی میں ایک لڑکی کھڑی ہے، بید کے بنزرتے پہ کھوئے کھوئے انداز میں ہاتھ پھیر رہی ہے، پھر اس ہی عکس میں فضا نے مبہوت ہوتے دیکھا، بنزرتے پہ لکھا تھا۔

”افق اور حور عرش۔“

☆☆☆

وادی سوات پہ افق سے امدنی شفق کی سرخیاں نہر کے پانی میں آگ لگا رہی تھی، بید کے ذرو پتے ہوا سے کھیلنے سرسراہٹ ابھار رہے تھے، افق کے اس پار، سوچ بادلوں کے بالے میں چھپ کے شام سے آشیر باد لے کر رخصتی چاہتا تھا، حور عرش اور زلف نہر کے پاس پتھر پہ بیٹھی، پانی میں پاؤں ڈلوئے ہوئے تھیں۔

”حیدر آیا تھا؟“ حور عرش نے زلف کے چہرے پہ محبت کی دیوی کا مجسم بوسہ دیکھنا چاہا، زلف تاک میں بیٹھی تھی، فوراً نظریں جھکا گئی۔

”آیا تھا۔“

”یقیناً بد مزگی بھی ہو گئی ہوگی؟“

”بد مزگی سے مطلب؟“ حور عرش نے

بغلیں جھانکیں۔

”مطلب وہ تم سے چڑتا ہے نا اس لئے۔“

”اف حورے تم بھی نا، کیا ضروری ہے کہ

وہ ہمیشہ ہی چڑے، وہ تو میری محبت اتنی

زیادہ.....“ حورے نے بیچ میں ٹوک دیا، زلف

نے خلی سے پانی میں پتھر پھینک دیا۔

”پتا ہے تمہاری محبت اتنی زیادہ ہے کہ اس

نے حیدر کو بے زار کر دیا، ہے نا؟“ زلف نے پھر

سے پتھر پانی میں پھینکا اور دائریں پانی کے بنے۔

”یار! یہ حیدر بھی قسم سے بہت متکبر قسم کا

ہے۔“ زلف نے ایک بار پھر سے پتھر پھینکا،

دائریں بنتے گئے، ارتعاش کے مہوور میں مقید منتظر

نگاہیں محبت کے چرنوں سے لپٹنے کے لئے امر

تھی۔

ٹھہری کی گونج اٹھی، بطورے سے محبت کی

آواز راگ کی صورت ابھری، پھر جب دائرے

سمٹ گئے تو اس نے دیکھا، دراز قد، گوزی

رنگت، کالے چھوٹے سے بال بڑے موٹھیں،

تازہ شیو کی نیلا ہٹ حورے نے بے اختیار سز

کے دیکھا، وہ سورج تاجدار سانا کھڑا تھا۔

”اتنی!“ بطورے کی راگ گونجی۔

”بھائی! آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟“

چندھائیں آنکھوں سے مسکراتے لبوں پہ زلف

شریرہ ہوتی، بھائی نے آنکھیں دکھائیں۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”تم سے مطلب؟“ زلف نے اٹھ کے

پوچھا۔

”میرا مطلب۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں یہاں کیوں

آئی ہوں؟“ زلف نے نکتے پھلائے، حور عرش

ابھی تک خاموش تھی۔

”ہاں تو۔“ وہ گڑ بڑایا۔

”بھائی آپ کا مطلب ہے کہ میں یہاں

سے چلی جاؤ تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔“ گلابی

آپٹل کے بالے میں بری رخ نے ہلکان ہوتے

منہ چھپایا، آنکھیں جبی تھیں اور نظروں کی تمازت

من مائل کر رہی تھی۔

”میں ہرگز یہ نہیں کہہ رہا۔“ اتنی نے کہا اور

سوچا یوں راہ میں دیوار بن رہی ہو، زلف نے

شفق کی سرخیوں پہ قدم دھرتے، پیچھے مڑ کر اتنی کو

حورے کے قریب جاتے دیکھا اور بیچ آگئی۔

”بھائی شام ادھا رو دے دیا، رات کی لاج

رکھا۔“ شام ہی تو ہے مقابل شام سے موازنہ

کیسا، نہر کے پانی میں ڈوبے پتھروں کی دھڑکنیں

سہمی سی لوریاں گائی تھیں، طاروں کی پریمی

کہانیاں قہم گئی اور ارض و سماں میں محبت کی ضو

فشانی پھیلی۔

”حور عرش!“

”حورے کیسے محترم۔“

”یہ گستاخی ہوگی۔“ اشتیاق آمیز نظریں

کھلکھلاتے اتنی پہ نکلیں۔

”گستاخی کیوں؟“

”عرش کی حور ہو، اوقات نہ بھولو۔“

”اوقات ہی تو نہیں بھولتی، آسماں کے

کنارے۔“

”تمہارا ماتحت ہوں۔“

پھر اچانک شہ گھڑیوں نے مہبوت ہوتے

دیکھا، اتنی کی سرخیاں سمٹ کے حورے کے

چہرے پہ چھا گئیں اور یہ منظر دیکھنے والوں کے

لئے الوہیت سا تھا۔

”اتنی گھر چلتا ہے۔“

”کون سے گھر؟“ شرارت میں محبت سہلی۔

”اپنے گھر۔“ حیرت سے اس نے اپنے

ماتحت کو دیکھا، قہقہہ سا ابل پڑا۔

”منظور ہے، چلو اپنے گھر۔“ وادی سوات
نے امر پریم کی ردا اوڑھ لیں۔
☆☆☆

”اے گھر۔“

رات ٹھہرتی سنساتی خوابیدہ انگڑیاں لے
رہی تھی، وہ بستر دہلی حورے سوچ رہی تھی اور
شکر کی آبتار کی مدھر موسیقی منا ہنسی پھونتی تھی، کتنا
فرحت بخش تھا میں، افق اور اپنا گھر، ایک بار پھر
ہنسی۔

”خواب کے قوس و قزح پہ نیند کی لوریاں محو
رقصاں ہیں۔“

درستچے کے پار جھانک تو آسمان کھر آلود سا
تھا، چاند کا تھا دل درستچے کے اندر جھانک رہا تھا،
چاندنی کھر کے تار جتنے جتنے رات کی تاریکی پہ
برام بھی، رابعہ بیگم نے دروازہ کھولا۔

”حورے سو گئی کیا؟“

”ہاں مورے، سو چکی ہوں۔“ وہ ہنسی، ماں
بہتے بہتے اس کے قریب پانسی پہ بیٹھ گئی۔
”دودھ لپی چلی ہو؟“

”کیا مورے، اب بچی تو نہیں ہوں۔“
پر نیاں میں لپٹے وجود سے عجب سی مہک کمرے
میں پھیلی تھی، شاید الوہی مہک ہو، رابعہ بیگم نے
سوچا۔

”سید و شریف سے ہاشم آ رہا ہے۔“ حیرت
سے پلکیں جھپکائی اور جب یقین ہو چکا کہ ماں
نے یہی کہا اور سچ کہا، اچھک کے اٹھ بیٹھی۔
”ہاشم سید و شریف سے آ رہا ہے، لیکن سنا
تھا کہ ہاشم نوشہرہ گیا ہوا ہے، جلدی نہیں آئے
گا۔“ سانس لینے لگی۔

”حور عرش محترمہ! کس نے کہا تھا کہ وہ
نوشہرہ گیا ہوا ہے؟“ اسے اپنی قابلیت یہ شبہ اور
حماقت کا احساس ہوا۔

”گل آویزہ بتا رہی تھی۔“

”گل آویزہ کو گولی مارو، اور یہ بتاؤ کہ زلف
نے کچھ کہا؟“ سوتے چاند نے انگڑائی لی اور
متوجہ ہوا۔

”زلف نے کچھ کیا کہنا ہے، کل سے تو خفا
بیٹھی ہے، کل ہم نہر کے پاس گئے تھے، زلف
نے کہا کہ کل زیتون کے جھنڈ تلک جاتا ہے، میں
نے کہا، مورے اجازت نہیں دے گی، اس کی
خوشی اڑاں چھو ہوئی، تنھے پھلائے اور کہا کہ تم تو
حقیقتاً حور نہیں ہو، نہ جاؤ میری بھلا سے اور ہاں
ماں سے کہنا نظر بد سے بچانے کی ترکیبیں پاس
رکھے، اتنی خوبصورت بھی نہیں ہے، ملا لہ تو اس
سے زیادہ.....“ کہہ کر رک گئی۔

”گلاب ابھی کھلا نہیں، اس کے قطرے
گلاب پہ گرنے میں ابھی سے ہے، چڑیا جب
سے سے پہلے گونسلہ چھوڑ دیں تو توازن ٹھوٹتی بیٹھی
ہے۔“ رابعہ بیگم نے سوچا۔

”اچھا بس چھوڑو، یہ بتاؤ گل نور سے بات
ہوئی تمہاری، پتا نہیں اس گل نور کا دل ہے یا خش
خشاش کے دانے۔“

”گل نور کیوں؟“

”گل نور نے کہا، چند کپڑے باقی ہے، تمام
کپڑوں کے دوپٹوں پر کرن ٹانگ لی ہے۔“
”کپڑے کس لئے؟“ اب کی بار وہ حیران
ہوئی۔

”چھوڑ بس۔“ ماں کلکھلائی۔

”بچی نہیں ہو۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”اچھا سو جاؤ اور ہاں۔“ ماں نے دروازہ
بند کر کے تائید کی۔

”افق کی ماں آئی تھی۔“ اور اس جملے میں
چھپے رمز کو وہ اگر جان پانی تو یقیناً صبح تک جھرنوں

سے ہنسی نے فضا کے کونکے گوشے میں دم لیا ہوتا، مگر خوابوں کی وادی میں طلسم کدے کی گنڈنوں کے کنارے یہ آگے نکل کے پھول کی پتیاں چلتی رہی، وہ افق..... حور عرش اور..... خواب۔

☆☆☆

یہ تاجدار سورج کی تابانی لگے اگلے دن کا نکھرا پہر تھا، اتوار کے دن ابو، گلیل بھائی، صدیق لالہ بھی گھر پہ ضرور ہوتے تھے اور سب کا گھر میں ہونا لازمی ہوتا تھا، صبح نماز پڑھنے کے بعد فوراً ناشتے کا اہتمام ہوتا، پھر جب سورج رخ روشن لئے مشرق کی اور سے انگڑائی کا رخار لئے طلوع ہوتا تو تخت پہ رابعہ بیگم بیٹھ جاتیں تو سارے کام چھوڑ کر روزی خشک میوہ جات لئے ان کے ساتھ بیٹھتی اور سوات کے حالات حاضرہ پر ایک مدلل انداز میں بحث چڑجاتا۔

آج اتوار کا دن تھا مگر وہ لازمی نہ ہوا، جو ہوا کرتا تھا آج مفقود تھا، صبح کا ذب ہی ابو نوشہرہ گئے تھے اور رابعہ بیگم کے علاوہ کسی کو یہ نہیں پتا تھا کہ ابوس نے گئے تھے؟ صدیق لالہ صبح ہی سودا سلف لینے نکل گئے تھے، گلیل بھائی بھی صبح سے ہی جیب لئے نکل رہے تھے کہ جیسے ہی پھانک عبور کیا ہی چاہتا تھا کہ رابعہ بیگم نے ہاشم کا کہہ دیا، یوں تو ہاشم آتا جاتا تھا مگر آج جس واسطے آ رہا تھا، اس کا پتا چاند کو تھا اور چاند بھی نا، کتنی محبتوں کا استمراری امین ہے۔

شفا بھابھی گلیل کے ساتھ جمع کو ہی میکے گئی ہوئی تھی، بیچ اولاد کے، حور عرش کا بہت من تھا اس کے ساتھ شکرئی گاؤں جانے کا، مگر ماں نے پتا نہیں کس بات کو لے کر اسے روک دیا تھا، گل مینہ بھی آج آئی ہوئی تھی۔

”صدیق لالہ کہاں گئے؟“ رابعہ بیگم گاؤں تھکے سے ٹیک لگائے، فغان بھرے تہوے سے

لطف اندوز ہو رہی تھی، ساتھ میں گل مینہ بیٹھی اخروٹ ہتھوڑے سے توڑ توڑ کے کھا رہی تھی۔

”ازی گل مینہ کیا کہوں، بھرا پھر اگھر ہے کچھ نہیں آتا کیا لاؤ، ایسے میں ہاشم بھی رہنے آیا ہے، ارے آیا کہاں ہے آنے والا ہے، سودا سلف کرنے گیا ہے صدیق، اب تو سوچ رہی ہوں گل مینہ کہ بس کچھ ہندو بست کر ہی لوں اس صدیق کا، مگر صدیق تو پاؤلا ہو گیا ہے قسم سے، اس ملائے خصموے (محکم والی) کے پیچھے میں کہتی ہوں گولی مارو، لاکھل جائے گی مگر وہ ماننا کہاں ہے۔“

”کتنی بولتی ہیں مورے۔“ حور نے مسکرا کر سوچا۔

”پھر میں نے تو کہہ دیا، گل آویزہ ٹھیک رہے گی مگر ناپا بانہ مان لے تو، نوشہرہ میں تو چمنیاں دھواں اگل چکی ہو گی نا، گل مینہ، تو بتاؤ گلیل کے دو بیٹے آنگن میں کھیلتے ہیں، اب بھلا بتاؤ، اسے سونا سونا دیکھ کر میرا دل تو ہولتا رہے گا نا۔“ رابعہ بیگم جذبات کے زیر اثر بہہ رہی تھی، گل مینہ نے ہتھوڑا زور سے پیچ دیا، غسل آفتابی کرنی حور عرش نے ہلر کے دائیں جانب جھانکتے ہوئے کہا۔

”پچھنے سے مطلب؟“

”مطلب تم ذرا سرک جاؤ۔“ گل مینہ نے راج ہنسی سی گردن اکڑائی، یعنی صاف کہہ دیا، مادام دفع دور فٹے منہ۔

”گردن نہ ٹوٹ جائے، خیال رکھنا۔“

”کیا کہا، گردن؟“

”نہیں، بس جاتی ہوں۔“

”زلف کی ماں آئی تھی مورے۔“

سرگوشیاں لہجہ۔

”تاریخ طے کر گئی؟“ ہتھوڑا سنبھلا۔

”اس ہفتے آئے گی۔“

”اس ہفتے اچھا، اب کہاں گئے ہیں؟“

”نوشہرہ گئے ہیں کسی زرگر سے زیور بنانے، وہاں تمہارے باپ کی بڑی یاریاں ہیں نا۔“ فغان روزی کو تھا، جیسے کہہ دیا، بس معاملہ خلاص اور اسی طرح کہ جب گل مینہ بوجہ سرگوشیاں نہ کر گئی تو حورے کھٹکنے لگی، اس نے رکتنا چاہا اور رک گئی، حیا کی لالی بکھرنے لگی، محبت کی دیوی نغمہ سرائی کرنے لگی۔

”محبت محبت۔“ اس نے سوچا اور پھر سے سوچا۔

”محبت۔“ پھر غضب ہوا، اس نے خود کو نہر کے قریب پایا، بید کے درخت سے ہوا راز و نیاز کر رہی تھی، منہدم ہوتے پہروں سے راگ نکل کے آلاپتے جا رہے تھے۔

کوئی دھیمی سروں میں آہستہ راز دارانہ سرگم سے لکسن مٹی کھیلتا گا تا ہے۔

محبت آسمان کی عبادت ہے اور اس عبادت کے عابد ابدیت کے بلوری تختے پر مرسوم ہے۔

یہ بوجہ محبوبیت سے گندھا ہے اور گیت کی سرنگیت وجود یار سے اٹا ہے۔

سماں عاشقانہ اور ادا دلربا نا۔

”یہ حقیقت ہے یا سماعت کی رنگینی؟“ اس نے خود سے سوال کیا، نہر کے ساتھ چلتے ایک اناری رنگ والی بچی کے ٹوکری سے ایک پھول اچک کے گھوم کے چلائی، سماعت کی ہی رنگینی ہے، ہاں یہ سچ ہے اور اور۔

یہ نہر کے پانی کے اوپر بہتی سفینہ میں پرچی جوڑے سے گرد گلابی دائرے میں ست رنگی تتلیاں ان کے سروں پہ منڈلا رہی ہے، ان پر بچی جوڑے کی آنکھوں میں فالووی رقص تھی، پانی کی سطح پہ نہرے پتے تیر رہے ہیں اور دیئے تیرتے ہوئے روشن ہے اور غضب ہوا کہ اس

نے پھر سے سوال کیا۔

”یہ میری بصارت کی دلنشینی ہے یا محبت کے اترنے کے الہام؟“

”محبت کا الہام۔“ خود ہی جواب دینا تھا۔

”ہاں یہ بھی تو سچ ہے۔“ عقب سے کسی نے کچھ کہا، وہ پوری کی پوری مڑ گئی۔

”یہ اکیلے اکیلے مسکرانے کا مطلب؟“

یقیناً یہ جرأت صرف زلف کر سکتی تھی، وہ زلف ہی تھی، ریشم سے بنی شال اوڑھے، وہ شاید ابھی کہیں جا رہی تھی۔

”میں..... مسکرا رہی تھی۔“ وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

”اور اب بھلا بتاؤ کیوں مسکرا رہی تھی؟“

”یار میں۔“ اسے شاید بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

”ہاں تم حور عرش افق۔“ یکدم حورے نے نظریں اٹھائی، تھیر رہی تھی، محبت سب کو مقید کیے نظریں، پلکیں لرزنے لگیں، آنکھوں میں محبت کے دیپ جلنے لگے۔

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”تمہیں، نہیں پتا اگلے ماہ کو تمہاری شادی

ہے۔“

”کس سے؟“ اس نے بھدا سوال کیا،

زلف نے طنز یہ نظریں سوئے آنکھیں پھیلائیں، ناک سیکڑ کر برہمی سے کہا۔

”مجھ سے۔“ وہ ہنس بڑی اور ہنار کے ہنسی چلی گئی، یہ ہنسی اس کے ساتھ جتی ہے، یہ اعتراف اڑتے ابا بیلوں نے کیا تھا، آوارہ لٹ جھولنے لگا،

وہ اور زلف سہیلیاں تھیں، زلف اس کی ماں ہے یہ عموماً رابعہ بیگم اسے کہتی تھی، ابھی رابعہ بیگم کا خیال آتے ہی باہم کا خیال بھی آیا۔

”زلف، تمہیں پتا ہے کہ سید و شریف سے

سے۔“

ہاشم آ رہا ہے۔“ وہ اچک پڑی کہ جیسے بچھوٹے
ڈنک مار لیا ہو۔

”ہاشم؟“

”مگر وہ تو شوہرہ.....“

”ہاں بھئی، کیا کہنے، آنے والے ہیں نا۔“
وہ موضوع بدل چکی تھی اور یہی اس نے غیبت
جانا تھا۔ زلف اب غصے سے کھول رہی تھی کہ ہاشم
نے آتے ہی اسے زلف پریشان کہتا ہے ہاشم
زلف پریشان اسے ہنسی آئی اور منہ پہ ہاتھ رکھے
ہنستی چلی گئی۔

کچے سیب کی خوشبو سارے میں پھیلنے لگی اور
وہ عموماً ہاشم کی موجودگی میں محسوس کرتی تھی، یکدم
چپ کے ناز چہ چرائے، چپ رک گیا، آگے
ٹھیکل کے ساتھ کچا سیب بیٹھا تھا۔

زلف اور حورے نے شتابی سے دوپٹہ
درست کیا۔

”تھخیر رائے رو رہا جانہ!“

”یہ زلف پریشان یہاں کیا کر رہی ہے؟“
جیب میں حورے سوار ہو کر ٹھیکل بھائی کے ساتھ
جا چکی تھی، اس نے فرار ہونے کی سعی کی مگر وہ
انجیر کا درخت بنا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا ہے محترم!“

”یہاں کیا ہو رہا ہے، بلکہ تھا؟“
”ہماری وادی ہے، کہاں بھی ہو سکتے ہیں،
تم سے مطلب؟“

”بس۔“ اس نے کان کی لومسل۔
”آپ کی وادی میں آنے کی تمنا تھی، یہ
سلی سلی ہوا میں، فضا میں تیرتے صحاب، بید کے
درخت اور.....“

”ہیٹھے راستہ چھوڑئیے۔“ اس نے برہمی
سے کہہ کر مڑنا چاہا۔

”ساری منظر نگاری خراب کر دی، قسم

”ہٹو۔“ اس بار وہ برہمی سے چلائی، اسے
پرے دھکیلتے ہوئے جانے کے لئے قدم بڑھا
دیئے، ایسے میں اس نے کلائی پکڑ لی، اس نے
ہاشم نے ہاتھ پکڑ لیا، وہ حیران ہوئی اس کے
حوصلے پر، پھر جب اسے احساس ہوا کہ وہ ہنس
رہا ہے، ہاتھ چھڑوا لیا، فوس کا کار بھاگنے لگی۔

”یہ پھول تو لیتی جاؤ۔“ وہ چلایا، ساعت
سے پیش آگئے لگی، اس نے رکتا محال جانا اور
بھاگتی چلی گئی، نیچے نہر کے عکس میں سید و شریف
سے آیا بانکا مسکرا رہا ہے تھا۔

☆☆☆

”یاد محبوب“ نے عاشق کے دل کی مگری کا
رخ کیا، آسمان نے چپ کا لباس اوڑھ لیا، زمین
نے فراخ دلی نبھائی اور ”یاد محبوب“ کے لئے
اپنے سینے کی وسعت وسیع کرنے لگی۔

اقلام ہوئے مناظروں پہ قدیوں کی
افشاں گرنے لگی اور سماں یاد رخصت ہو کے سماں
وصل کے لئے نشست چھوڑ چکی۔

ردمی شمال گروں نے اپنے قلم پکڑ کے،
سماں عشق کو دھنک رنگوں سے رنگنا شروع کیا۔

زلف انگلیٹھی کے سامنے بیٹھی تھی، فحان
ہاتھ میں پکڑے اور دزدیدہ پر سوچ نگاہیں اوپر نو
آموز خطاط کے الرحمن کی ٹیشل پہ لٹکائے، قہوہ پینے
میں لگن تھی، در پیچ پہ حریری پردے لٹکائے گئے
تھے اور آہوی دروازہ بند تھا۔

آنکھیں جھللا رہی تھی اور اس جھللاہٹ
میں ایک یاد قید تھی، آسمان دھواں دھواں،
دیواریں کھٹکتی اور حریری پردے پھڑ پھڑائے۔

”سید و شریف میں تم کو کیا نظر آتا ہے حیدر
کہ تم یہاں سے سوات ہمارے ہاں آنے کے
اصرار کو رد کیے جاتے ہو۔“ نہر کے اوپر بنے پل

کے ساتھ وہ بلاوجہ مسکرائے جا رہی ہے، ہڑ بڑا
کے عالم تنویم سے نکل آئی، دروازے کے ساتھ
کھڑے ہو کے پوچھا۔
”کون؟“

”میں ہوں، روزی۔“
”کیا ہے روزی، سارا بیڑا غرق کر دیا۔“ وہ
برہمی سے اپنی نوکرائی پہ برس رہی تھی، وہ شاید
غصہ ہوئی، خیالات کی جھالیں بننے پڑنے محبوب
کی صورت بنا گئی، تصور کی آفرینی پہ رقص کناس
ہوئی اور..... محبوب کی صورت بگڑنے پہ بتلائے
غم ہو گئی، روزی روکھی صورت لئے سوچ رہی تھی
کہ ان آنکھوں میں رقی تو خیرہ کیے دیتی ہے۔
”اب کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہی ہو،
بتاؤ تشریف آوری کیوں ہوئی؟“ کہہ کر کمر پہ
ہاتھ ٹکائے۔

”وہ جی..... بیگم صلبہ نے یہ بھیجے تھے۔“
”یہ کیا ہے؟“
”یہ کپڑے ہے بی بی اور کیا ہے؟“ اس
نے کپڑے لئے، روزی کو چپکا کیا، پھر جب کمر
بند کر کے وہ کپڑے دیکھ رہی تھی تو اس نے ایک
دوپٹہ دیکھتے ہوئے کچھ گرا، اس نے تھیر سے
دیکھا۔

”کارڈ۔“ سرخ کارڈ تھا جس پہ دو پریمی
جوڑے شانوں پہ سر رکھے کہ جیسے دنیا مانگیا سے
بے گانہ بلاوجہ مسکرائے جا رہے تھے، بے
اختیارانہ اس نے کھول کے دیکھا۔
چلو ایک کام کرتے ہیں
وجود اپنے محبت کے نام کرتے ہیں
نہر کے ساتھ چلتے چلتے
مسکرا مسکرا کر شام کرتے ہیں
اس دنیا میں بغاوت کرنے سے پہلے
باغی کہلانے سے پہلے

یہ کھڑی زلف آوارہ لٹ کو پار بار پچھے اڑس رہی
تھی، گلابی فراک، سفید موٹی والے نقش، ریشمی
شال، وہ سیدو شریف کا دریا دیکھ رہی تھی، ساتھ
میں حیدر داؤد کھڑا تھا، کالے شلوار قمیض یہ کالا
واسٹک پہنے، سر پہ کالی چترائی ٹوپی، کالے شال
اوڑھے، ساحر محصور کیے جاتا تھا، نہر کا عکس کیسا
غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

”زلف! سیدو شریف؟ صبا کی آخری
سائیس اور ابو کے سر پرڑتے ہاتھ، مجھے سوات
جانے نہیں دیتا، صبا کہتی تھی کہ انسان کو اپنی آبائی
جگہ سے اتنی محبت ہونی چاہیے کہ کسی عبادت کی
طرح وہ اس محبت کو فرض مانے۔“
”میں پھر بھی تمہارے لئے دعا کروں گی
حیدر کہ تم لوٹ آؤ۔“

”میں کوئی انجانا، بھٹکا اور گشدرہ مسافر نہیں
ہوں۔“
”مگر تم وہ بن رہے ہو حیدر، یہ بات کوئی
اہمیت نہیں رکھتی، بھلا اکیلا رہنا، کہاں کی درویشی
ہوئی؟“
”میں خالو سے پہلے ہی فرصت میں ملنا پسند
کروں گا۔“
”کیوں؟“

”تمہارے لئے ایک بہترین سامع کو
ڈھونڈنے کے لئے کہوں گا کہ جلد از جلد اس
مشرقی حسینہ کے ہاتھ پہلے کروا کے بائبل کا آئین
سونا کر کے پیادیس سدھار دیں۔“ اس نے رک
کے، اس کے چہرے کے تاثرات جانچے مگر ان
تاثرات میں ساٹ پن دیکھ کر منہ بسور دیا، جیسے
کسی بچے نوم اینڈ جبری دیکھتے ہوئے یکدم تجلی
چلے جانے کا غم ہوا ہو، ویسے زلف تھی، بچی ہے
نا۔

دروازہ پٹیا جا رہا ہے، ہاتھ میں پکڑے فنجان

ایک رات فقط آرام کرتے ہیں

چو

اک کام کرتے ہیں

نفرت بدنام کرتے ہیں

نیچے اچھ لکھا تھا، اب وہ ہنس ہنس کر کے
لوٹ پھوٹ ہو رہی تھی، بڑی بڑی اونچی ہنسی ہنس
رہی تھی، پھر آنکھیں چندھائیں، منہ کھنکھناتی بجانے
کے لئے کھول کے کہا۔

”حیدر!“

☆☆☆

رابعہ بیگم تخت پہ بیٹھی مسکرا رہی تھی، گل مینہ
نوازیئہ بچ پکڑے کچھ کہے جا رہی تھی، دائیں
طرف چار پائی پہ شریں بیگم بیٹھی، نیم کا سے
بھرے گڑ کے چائے سے چکیاں لے رہی تھی،
روزی ساتھ بیٹھی تھی اور زلف پریشاں کا دور تک
اتانہا نہیں تھا۔

اوپر، دیوار سے بنے کھڑکیاں باہر کو کھلی
تھی، پردے سمیٹے ہوئے تھے، کھڑکیاں پھلانگ
کے اندر جایے۔

”آئیے حور عرش سے ملنے ہیں۔“ آئینے
کے سامنے حور عرش کھڑی زلف صوفی پہ بیٹھی
ہوئی تھی، برا سا منہ بنائے چھپا آگے کو ڈالے
نجانے کون سے قصے چھیڑے ہوئے تھیں اور
ہماری ہیروئین صلاحاتی کم گو ہے کہ حد نہیں۔
”تمہارا مطلب ہے کہ حیدر نے تمہیں تحفہ
بھیجا؟“ مسکرائی۔

”مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کہ وہ حیدر نہیں
ہو۔“

”ہاں تو اور کیا، مگر اماں کہتی ہے کہ حیدر اتنا
با ذوق تو نہیں ہے اور تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ
گھوم کے اس کے سامنے کھڑی ہوئی اور ایسے
تشویش سے زلف کو گھورنے لگی کہ زلف کو اس س

زیادہ ہی تشویش ہونے لگی۔

اس نے ناک یکڑ کر کہا۔

”حیدر کے علاوہ تو کوئی ہے نہیں۔“

”حیدر کے علاوہ بھی تو کوئی ہو سکتا ہے۔“

”کون؟“، پتھیلی کا پیالہ بنائے، ٹھوڑی کے

نیچے رکھ کے آنکھیں جھپکیں اس نے بے چاری

حورے کو جزبہ کر دیا۔

”ہاشم..... دی سیدو شریف راج کمار۔“

حورے، شانے اچکاچی مسکرا کے اس کے ساتھ

بیٹھ گئی اور زلف کو سیدو شریف میں آگے زہریلے

پورے کے زہر سے منہ کڑوا ہوتا محسوس ہوا۔

نہر کے ساتھ چلتے چلتے، دنیا سے بغاوت

کرنے والی باغی نے منہ بسور کے حورے کو مکا

رسید کیا۔

”تباہ شے!“ ایسے میں نیچے شریں بیگم نے

نیم کا سرہ سامنے میز پہ دھرا۔

”اگلے ہفتے، اتوار کے شب۔“

☆☆☆

آہ آہ ہونے ساری کائنات کو اپنے لیٹ میں لے لیا

آکاش نے رخ سمیٹ کے دھسان کا روپ دھار لیا

برگد کے چھتارے سائے میں دھوپ ملی

ہوئی تھی، آسمان پہ چھائے کالی گھٹائیں کسی بیوہ

کے معصوم بچوں کی آنکھوں میں پینتے خواہشوں

کے آنسو کی طرح لگتے تھے، ہوا میں اتنی تیز تھی کہ

ہر شے کو دور لے جا پھینکتی تھی، ریت کے ذرے،

نقشوں میں گھس کر ایسا احساس ابھارتے کہ معلوم

ہوتا تھا کہ جیسے فکیر پھوٹ پڑا ہوا، دل کی جلن

سے منہ جاگ نکل رہا تھا، بڑی ہوئی شیو میں زرد

ذرد سے رنگ گھلے تھے پھر کر بناک ہواؤں میں

ارتعاش سا پیدا ہوا۔

برگد کی جھٹھائیں سمیٹیں اور نہر کے پانی کی

اوپری سطح پر خون کی تہہ جنسنے لگی۔

میں پرونیہ کی کھانسی بھی شامل ہوتی۔
 حورے منہ بسورنی، منکشی، ایزویوں کے
 سناہٹ دبانے کے لئے انگلیاں مروڑتی اور یہ
 جاوہ جا۔

ارے یہ بات کہاں سے کہاں نکل گئی، آج
 حورے نے بھی مگر ذکر اسی کا تھا، حریری پروے
 لٹکائے گئے تھے، دیوار کے عین ساتھ تپانی پہ قبوہ
 دھرا تھا، رابعہ بیگم گل مینہ کی شادی پہ بحث کر رہی
 تھی، ابو حقدہ گڑ گڑتی رہے تھے اور دھواں کمرے
 میں مقید ہو کے چکرا جاتا۔

ایسے میں بے چاری پرونیہ کی کھانسی بڑھتی
 اور رابعہ بیگم کہتی۔
 ”منخوس ماری، خاموش بیٹھی رہ۔“

پرونیہ روزی ”خ“ کو منہ میں ہی دبالیتی،
 بے چاری منخوس ماری۔

”گل مینہ کی شادی میں شرین بیگم نے دو
 سونے کے کڑے دیئے تھے، میرے نہ نہ کہنے پہ،
 چڑھادیئے حورے کو اور زلف بھی بڑی دل وانی
 ہے، کہنے لگی کہ گل مینہ کی شادی تو چیکے سے رچالی
 مگر حورے کے بارے میں یہ نہ ہوگا اور خدا نے
 ایسا بالکل نہ کیا، دیکھا گل مینہ چاہا ہیرا شرین
 کو۔“

”چاندی بنی ہے میری۔“
 ”پائے بی بی! چاند تو گنجا ہے اور حورے بی
 بی کو تو اتنی سی چوٹی ہے۔“ پرونیہ نے ہتھوڑا
 اخروٹ پہ اتنی سختی سے مارا کہ اخروٹ دانہ دانہ ہو
 گیا۔

”ہٹ منخوس ماری۔“ رابعہ بیگم نے دھموکا
 بڑا۔

”کبخت، بادام کے تیل کے سینکڑوں
 شیشیاں تو ڈلوئی ہے، روز دھوتی ہے، اتنے میں تو
 ہوتا ہی تھا، پاؤں تلک چوٹی۔“ پرونیہ نے منہ تو

مہروز پہ برہ کی نزویت ہوئی اور برہ میں بھگو
 کے کرہہہ راگ بوم کی نخوست کی سرپرتی میں
 رہے۔

”حور عرش کی شادی ہے۔“

☆☆☆

وادی سوات پہ گلاب شام دھندلکوں سے
 دبیز ہوتی محرابوں پر براجمان تھی، آسمان پہ ٹوٹا
 تارا نور کا حاشیہ بنا گیا تھا، چاول کے کھیت
 انگڑائیاں لے رہے تھے، عنائی تکیوں کے پروں
 میں غنودگی کھل چکی تھی۔

ابو بھی نوشہرہ سے آگئے تھے، دس تو لے زبور
 بنا لئے تھے، پانچ صدیق اور پانچ کھلیل نے، جہیز
 تو کتب کا بن چکا تھا، امی کب تیار بیٹھی تھی، گل
 مینہ مینے دودن کے لئے آئی تھی مگر یہ سب اتنا آتا
 فانا ہو گیا کہ گل مینہ حواس باختہ ہی ہو گئی تھی، رابعہ
 بیگم کہتی تھی کہ ایک ہفتہ شادی کے بعد رہ ہی لو مگر
 گل مینہ نے آگے ضد لگا رکھی تھی کہ جیسے ہی منیر
 نے اجازت دی، ڈھیر ہو جاؤں گی، ایسے میں
 بھلا صدق کا کہ اس نے منیر کو ہی بلایا۔

اب گل مینہ جار جٹ کے دوپٹے کو منہ میں
 داب کے لیوں کے آخری کناروں پہ پھیلی
 مسکراہٹ کو ضبط کر کے جیسے نقشہ چاند کے ماتھے
 پہ سجانے کی سعی کرتی ہو، رات عروج بام پہ بسرام
 تھی۔

رات کو سب ابو کے کمرے میں حاضر
 ہوتے تھے، آج بھی خنے لیکن حورے نہ تھی کیونکہ
 ذکر اسی کا چلن، اس کا چہرہ مارے شرم کے لال
 بھسوکا ہو جاتا، اچھل کے کودتی، گود میں سر چھپا
 لیتی مگر ماں بھی ناقص سے ذر جو اپنے شوہر سے
 شرماتی ہو، پرے دھکیلتی۔

”ہٹ منخوس ماری! میں کوئی افق ہوں؟“
 ایسے میں تہمتوں کی پھلجڑیاں پھوٹی، ابن تہمتوں

کان کھول کے سن لو افق۔“

”افق یا آسمان کے کنارے؟“

”جو بھی ہو میری بلا سے، آج دوپہر سے

پہلے اس غیبت زاری کو، تین دن پہلے کپڑے
دئے تھے مگر لا ہی نہیں رہا، حورے ہتی ہے۔“

افق نے جملہ اچک لیا۔

”حورے یا حور عرش؟“ اب کی بار ایک

زوردار مکاس کے شانے پہ بڑا اور اس نے سوچا
حور عرش کتنی ہے۔

”تم کیسے ہو؟“ سہ پہر کی نارنجی شعاعیں
آسمان کے کنارے سے لپٹی تھیں۔

”تمہارا ہی ہوں۔“ عتابی ہونٹ وا، تھیر
آمیز مسکراہٹ، وہ اس بر جستگی پہ دنگ رہ گئی، اللہ

ایسا برجستہ جواب۔

”وہ تو ہے مگر پتا ہے نا، کر قریب بھی رکھتے

ہو۔“ سہ پہر کی نارنجی شعاعیں یکدم افق کی
آنکھوں میں سمٹ آئی، افق نے پگڈنڈی پہ چلتے

ہوئے کہا۔

”واہ حورے۔“

”حور عرش کہئے۔“

”ہاں حور عرش! رقیب بھی کیا خوب ہوں
گے۔“

”ہاں نا، رقیب تو نام ہی خوب ہے۔“

”اچھا حورے۔“ اس نے رک کر مڑ کر
ترجہی نظروں سے دیکھا۔

”یہ رقیب خاں کون ہے؟“

”یہ سینہ راز ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”اور یہ کیوں ہے؟“

”کیونکہ یہ حور عرش کا متلاشی ہے۔“ اس
نے لہجہ سرگوشیا نہ پایا۔

”یہ باتیں بتاتی نہیں جاتی۔“ وہ رک گیا اور

بیٹھ گیا۔

کیا آنکھیں بھی بسور لی۔

”مورے مہندی کے روز کیا انتظام

کریں؟“ ٹھیکیل نے پوچھا۔

”ابو سے پوچھ لو، مگر یاد رہے کہ خرابی نہ ہو،

ان کے سہمی تو اتنے خراٹ کہ نہ پوچھو، وہ نہر
کے پاس نمونہ رہتے ہے نا، کیا نام ہے بھلا نمونہ

مارے کا۔“ منہ میں بادام ڈال کر پوسوج درزیہ
نگاہیں سلونی سلونی سی پرونیہ کے چہرے پہ نکا

دی، ابو نے دھواں فضا میں چھوڑا۔

”چائے کا انتظام، یا ایسا کرتے ہیں
کہ.....“

”برائی پکا لیتے ہیں۔“

”نہیں برائی نہیں، بس چائے کا انتظام صحیح
ہے، نمک پارے، بسکٹ، پکڑے، سموے،

کباب، چکن پیسز، حلوہ، رس گلے وغیرہ۔“

”ہاں، یہ سچ ہے۔“

”ابو! میٹھے کا ایک دیگ نہ منگوا لیں، میرا
مطلب ہے کہ میٹھے جاول کا۔“

”منگوا لو۔“ گڑگڑ دھواں ہوا میں تحلیل
ہوتے سے بڑا کمینہ کمینہ سا لگ رہا تھا۔

”گل ریز، ہاں وہ نمونہ۔“ رابعہ بیگم کو شاید
بات یاد آئی گئی۔

”وہ نمونہ ہی ہے تیرے ابو کے سہمی کی
طرح، ویسے کیا انتظام کرنا ہے مہندی کے روز؟“

☆☆☆

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ زلف نے کتاب
جھپٹ لی۔

”ایسا تو ہرگز نہیں ہوگا، بخدا آسمان سے گرا
اور کھجور میں اٹکا، واہ بھئی، افلاطون کے چچے، ہنر

کے پتر۔“ افق مسکرایا۔

”بیر کے پتر یا رانجھا کے؟“

”جو بھی ہے، میری بلا سے، لیکن ایک بات

کپڑے لادو، مگر نہ جی، یہ عینک والا جن کا ہے
افلاطون کے کان۔“

☆☆☆

آسمان پہ اڑتے بادلوں کے ٹکڑے شاید
برسنے کے موڈ میں نہ تھے، تاجدار سورج اپنی
سلطنت کا بکھیرا سمیٹے آسمان کے دامن میں بن
بلانے مہمان کو چارج سوپ چکا تھا، بید کے پتے
سربراہٹ ابھار کر خاموش لمحے کے زیر اثر چپ
چاپ سبز تنے سے لیٹے ہوئے ملے، نہر کا پانی
شفاف شفاف آدرش کی طرح تمام اپنے اندر
منعکس کیے بہتے ہوئے زرد پتوں کا بار اٹھائے
ہوئے تھے، زرد زرد پتے بکھرے تھے یہاں بھی
وہاں بھی، نہر کے کنارے، چاول کے فصل میں
گندم کے کھیتوں کے سرحدوں پہ سرخ گل لالہ
آج زرد رنگ سجائے ہوئے تھے۔

پھر ان زرد زرد سماں سے نظر اٹھا کر نہر پار کر
دو گندم کے کھیت چھوڑ کر، سفید آہنی گیٹ عبور
کر کے اگر آپ حورے کے گھر جائے گے، تو
حیرانی سے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں گے،
بوڑھے احمق برزن۔

سارا گھر ققموں سے سجا تھا درختوں کے
تنوں پہ بھی ققموں کا آج راج تھا، لان میں محفل
عروج پہ تھا، نیچے ستونوں کو گیندے کے گھرے،
پہنائے گئے تھے فرش مانجھ مانجھ کے دھویا گیا تھا،
روزی کی بو بھی آگئی، یہی بات شاید وہ بیگم داؤد
سے کہہ رہی تھی، اندر کمرے میں حور عرش زلف
سے ابجھی تھی۔

”اچھا تو تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ منہ دکھاؤ۔“

”یہ کیا بکواس ہے میں ہر گز بھی منہ
نہیں دکھاؤں گی۔“

”سنو حورے، مجھے شاید تمہاری غلط فہمی دور

”نہیں افق بیٹھ جانا عیب ہے، نہر کے
پاس چلتے ہیں۔“ افق اٹھا مسکرایا۔
”اور مسکرا مسکرا کر شام کرتے ہیں۔“

”بالکل۔“ وہ ایک بار پھر سے ہنس پڑی،
ایک ہاتھ ناک پر رکھے اور دوسرا بلند کیے ہنستی لگتی
مگر غضب یہ ہوا کہ افق نے نظریں چھپا کر
بکھرتے قوس قزح کی ایک جھلک دیکھ لی تھی،
یہی غیبت ہے، اس نے سوچا۔

”اگر میں نہ رہا تو؟“ افق نے بید کے
درخت پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے یکدم روک کر
اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”کیا کہا؟“

”یہی کہ اگر میں نہ رہا تو؟“ وہ اس کے
روبرو آیا، آنکھوں میں جھانکا۔

”تم میری زندگی ہو اور پتا ہے نا، زندگی
تب قائم رہتی ہے جب سانس چلتی رہے، جب
میری سانس نے جفا کی ٹھانی تو میں سمجھوں گا،
میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی۔“ اب کی بار حورے
نے سر اٹھایا اور، اب کی بار ایک زوردار مکا اس
کے شانے پہ پڑا، تو وہ کراہا۔
”آہ حورے۔“

”محترم، اگر آپ کی پریت کہانی کا اختتام
ہو گیا تو کیا میرے کپڑے لادیں گے؟“ خشکی
نظریں لگی۔

”کیا؟“ اسے اپنے عالم تنویم کی رنگینی بکھر
نے پہ غم ستایا جا رہا تھا، یہ زلف بھی نا۔

”سرخ فیتہ۔“ اس نے ایک اور زوردار مکا
اس کے چھانی پر رسید کیا، وہ پھر سے کراہا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“

”یہ پان، پان کی بات کر رہی ہوں۔“ اب
کی بار وہ چھٹی، عینک اچک لی۔

”میں کہتی ہوں کہ درزی سے میرے

”تو یہ کہ آپ کچھ مانگ رہی تھی۔“

”ہاں، پیسے، نیلے نیلے۔“

”میرے پاس پیلے پیلے ہیں۔“

”ہم تاریخ پیچھے کر لیں گے صاحب۔“ یہ کہہ کر دفعتاً اس کی نگاہ سامنے ایک سنجیدہ چہرے سے چار ہوئی، ہنسی ٹھنکول میں سنجیدہ چہرہ، وہ حیدر داؤد تھا۔

”تم کچھ خاموش ہو حیدر۔“ وہ مہندی چھوڑ کے آئی۔

”دل خاموش ہے۔“

”اور دل خاموش کیوں ہے؟“

”کیونکہ کوئی خاموش ہے۔“ اس کی ڈوبی بجھی نظریں پتا نہیں کس۔ ایسی فحشی سے جچی تھی کہ اگر ذرا سا ارتکاز ہوا وظیفہ ٹوٹ جائے گا۔

اور زلف نے نظریں گھائی، کمرے کی کھڑکی کے ساتھ حورے لگی تھی، خاموش سی بجھی۔ ”نگاہ یار، تخت عشق سے اٹھ کے پاتال بھر میں سر بسجود ہوئی وصولی میں برہ کی فصیلیں اٹھیں۔“

☆☆☆

مہندی گالوں پہ سرخی ملتی عروج سے زوال کی جانب سفر کر چکی تھی، نیند کی بریاں پلکوں پہ سپنوں کی ملمع کاری کر کے جا چکی تھی، فانوسی رقص در پہچے کے آئینے سے گھٹ گھٹ کر کمرے میں دائرہ نما روشنیاں نکھیر رہی تھی، سنگار میز کے سامنے زلف اسٹول پہ بیٹھی حور عرش یوں پیشی تھی کہ ذرہ آنچل قالین پہ ذرا سا اس کے شانے بھی تھا، چٹایا آگے کو ڈالے، گود میں رکھے حنائی ہاتھ، ہاتھوں میں گجرے اور گجرے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

زلف ٹھاہ سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔

”آہ، آج تو مہندی نے تھکا دیا حورے۔“

کردینی چاہیے۔“

”کیا خوش فہمی؟“

”یہی کہ تم حقیقتاً حور نہیں ہو۔“

”بس اب جلومت۔“

”جلے میری جوتی۔“ ناک بھوں چڑھائی، حورے چیخ پڑی۔

”ہائے زلف، تمہاری جوتی جل گئی۔“

زلف نے بے ساختہ چیخ ماری، حورے ہنس پڑی، مگر پھر جب وہ صوفے پہ بیٹھا دی گئی تو اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست، آنکھوں کی پوٹوں پہ دیزر سرد مہری لگی تھی اور یہی سرد مہری ماحول پہ چھائے ایک شخص کی وجہ سے تھی، پتا نہیں کیوں؟ وہ ایسا نہ تھی، اجنبی کھٹور، بس یہ فضا میں چھائی افسردگی تھی جس نے اسے افسردہ کر دیا تھا، پھر وہ چلی گئی، اب رسم بھی دلہے کی۔

صوفے پہ بیٹھا افق سفید شلوار قمیض کے اوپر سیاہ واسکٹ اور سیاہ چترالی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، زلف نے مہندی لگائی اس کے آنکھوں پہ گل مینہ نے رس گلہ منہ میں ٹھونس دیا، فیروزہ نے مکمل کار و مال دیا اور رابعہ بیگم نے ایک پیک شدہ جوڑا سر پہ رکھا۔

”پیسے نکالے۔“ زلف نے کمر پہ ہاتھ نکا کر ہاتھ پھیلایا۔

”میں بھیک نہیں دیتا۔“ گل مینہ کی آنکھیں ابل پڑی۔

”بھیک نہیں صدقہ دو۔“

”کیا ممکن ہو؟“ معصومانہ سوال۔

”ہم آپ کے جوتے چھپالیں گے۔“

زلف نے کھلی دھکی دی، گل مینہ نے تائید کی۔

”میں نے جوتے ہی نہیں پہن رکھے۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”تو؟“

سنگ مرمر کے فرش پہ سورج کی روشنی پھسل رہی تھی، گیندے کے پھول اٹھ کے جیسے ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے، زلف پریشان بالوں کا گھونسلہ بنائے، منہ پہ چوتا تھوپے باہر مڑھتی کر رہی تھی، اگر کسی کی نظر اس پہ پڑ جاتی تو یہی کہا جاتا۔

”ہائے چیل!“ اس نے مہناز سے کہا تھا کہ ذرا نیلا پاش دے دو مگر مہناز، منہ چھپاتی کرے میں ٹھس گئی۔

تخت پہ نانی محترمہ بیٹھی بال کھولے ہوئے تھیں اور خدا معاف کرے اس گستاخی پہ کہ وہ برسوں پرانی ”آپو مستی“ کی طرح دکھ رہی تھی، اس نے دیکھا، اس نے دیکھا منہ بنا کر یہ جاوہ جا، نانی محض بال کھولے ہوئے نہ تھی بلکہ روزی اس کے سر میں بادم کا تیل اٹھیل رہی تھی، نانی بار بار کہہ رہی تھی۔

”دو پہر نہ ہونے پائے، رخصتی جتنی جلدی ہوا اتنی اچھی ہے۔“ روزی نے شیشی نیچے رکھی۔

”میں جاؤں؟“
”بیٹھی رہ، ساج کرتی رہ، منخوس۔“ روزی نے ناک بھوں چڑھائی۔

”ارے، نانی۔“ سارا گھر مہمانوں سے بھر چکا تھا، لڑکیوں نے تو آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا، مردانے میں البتہ گھر کی افزائش کے مقابلے بہت محفل سے کام ہو رہا تھا۔

زلف کے نہ ہونے پہ شیریں بیگم سسرالی پوچھ گچھ میں پھنسی ہوئی تھی۔
”زلف نظر نہیں آ رہی؟“

”وہ حور عرش کے ہاں گئی ہے۔“ شیریں بیگم نے مسکراہٹ اچھالی، نند صاحبہ تپ گئی۔
”اسے یہاں ہونا چاہیے تھا شیریں۔“
”اس کو دلہن نے بلایا تھا۔“

حور نے گالوں پہ حیرانگی والے انداز میں ہاتھ رکھے۔

”سچ بتاؤ تم جھکتی بھی ہو؟“
”میں تمہیں کوئی جن زادی لگتی ہوں؟“
”لگتی تو نہیں، پھر کم بھی نہیں ہو۔“ اسٹول پہ بیٹھی حور نے آئینے میں دیکھا، زلف کا منہ بسور تا عکس۔

”اور سناؤ زلف، حیدر آیا تھا؟“ یکدم آئینے میں زلف کا عکس بدلا تھا، فانونی روشنیوں کی رتم زلف کی آنکھوں میں سمٹ آئیں۔
”آیا تھا، پھر جلدی چلا گیا تھا، حور سے وہ تو اتنا کھنور اور سرد مہر سا نہ تھا، پتا نہیں تمہاری شادی پہ وہ اتنا سر دہر کیوں ہو گیا۔“
”اجب بن جانا حور نے غنیمت سمجھا۔“
”وہ بات نہیں کرتا کیا؟“

”کرتا تو ہے بھی، مگر دل کی بات ہے صاحبہ!“ اس نے گوڈ میں ہاتھ دھرے۔

”مول سے بات نہ کرے، تو اثر نہیں رکھتی وہ بات، میں نے کہا نا، وہ زندگی سے بھر چکا ہے۔“

”آہم، کافی مطالعہ کیا ہے تم نے تو۔“ اس نے داد دی تھی۔

”ہاں محبوب جو ہے۔“ وہ ہنس پڑی، گالوں میں بڑتے کڑھے میں جیسے دھنک کے تمام رنگ بکھر گئے۔

”اور محبوب کتنے، بہر و پیا ہوتے ہیں نا۔“
”آہا، بہر و پیا، میرا پیا۔“ وہ گنگنائی تھی، اس نے یہ کہتے ہوئے پاؤں کی سنسناہٹ کے لئے انگلیاں مروڑ دی تھی۔

☆☆☆

”صبح آج شاید اترنے کو بے تاب کھڑی تھی۔“

بڑا دلکش بڑا رنگین یہ شاعر کہتے ہیں
یہاں ہے ہزاروں گھر گھروں میں لوگ رہتے ہیں
مجھے اس شہر کی گلیوں نے بنجارہ بنا ڈالا
چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا
میرے مالک میرا دل کیوں تڑپتا ہے سلگتا ہے
تیری مرضی تیری مرضی پہ کس کا زور چلتا ہے
کسی کو گل کسی کو تو نے انگارہ بنا ڈالا
چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارہ بنا ڈالا
میری آوارگی نے مجھ کو آوارہ بنا ڈالا
میں اس دنیا کو دیکھ کر اکثر حیران ہوتا ہوں
نہ مجھ سے بن سکا چھوٹا سا گھرون رات روتا ہوں
خدایا تو نے کیسے یہ سارا جہان بنا ڈالا
چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا
میری آوارگی نے مجھ کو آوارہ بنا ڈالا
دڑپنے کے ساتھ کھڑے ہو کے اس کا سارا
وجود اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، بس اگر دکھائی
دے رہا تھا، تو وہ اس کا چہرہ تھا، جو اتنا سفید سا
لگ رہا تھا کہ گویا چونا لپ دیا ہو چہرے پہ، شال
شانے پہ ڈالے وہ اوپر آسمان میں کچھ کھوج رہا
تھا، وہ تو شاید خود کو کھوج رہا تھا۔
انسان اپنی محبت کے ختم ہو جانے پہ کھوجتا
ہی رہتا ہے، خود کو اپنے محبوب کو اور معاملہ وہی سا
رہتا ہے، زخم زخم اور پھر زخم۔

اندھیرے اوڑھے آسمان میں اس کی محبت
مانند ٹوٹے تارے سی تھی، اس نے کبھی بھی زندگی
میں دل کے زخم سے مسکراتا نہیں چھوڑا تھا، ابو کے
مرگ کے بعد صبا کے مرگ کے بعد۔

زندگی میں سے اگر حورے کا باب نکال دیا
جاتا تو اس کی زندگی ایک ایسے کتب خانے کی
مثال تھی جس میں کتابیں تو ہزار اور ہر قسم کے مگر
قارئین سے مبرا، بے وقعت۔

☆☆☆

”اسے دلہن نے کیوں بلایا تھا؟“
”وہ دراصل دلہن کہہ رہی تھی، کہ گل مینہ
اکیلی، مصروف ہے، یوں بھی دونوں سہیلیاں کم
بیش زیادہ ہے، زلف کا من بھی یہاں نہیں تھا
اور تو اور گل تو مہندی میں حورے کی طرف سے
افتخار کو مہندی لگوائی، پیسے اٹھنے۔“ مسکرائی۔
”بڑی محبت ہے بھی۔“ تند صاحبہ مسکرائی،
وہ پھر مسکرائی۔

”ہاں سوتو ہے۔“

آسمان بالکل صاف تھا، تاجدار سورج نے
اپنے فوس کا طسم سارے ماحول پہ ملغوف کر رکھا
تھا، سردی گو کہ زیادہ تھی نہیں مگر کیسی سیلی ہوائیں
ضرور تھیں۔

چچا ابو سے راز و نیاز کر رہے تھے، بارات کا
وقت مقرر نہ تھا، وقت مقرر کرتے ہوئے سب بار
بار الجھ رہے تھے۔

”شام ڈھلتے صحیح رہے گا۔“ چچا نے کہا۔

”نہیں شام کو نہیں، شام کو اچھا خاصا اندھیرا
چھایا ہوا ہوتا ہے، یوں کرتے ہیں سہ پہر پانچ
بجے روانہ ہوتے ہیں، شام کے اذان ہونے سے
پہلے پہنچ جائیں گے۔“ فیروز لالہ نے اچھا خاصا
مشورہ دیا، ابو کا چہرہ مطمئن تھا۔

”سہ پہر پانچ بجے۔“ شواشا، لڑکیوں کی
تیاری تیز ہوئی، جن کے بھائی نہیں مان رہے
تھے، عجب تھاب مان رہے تھے، سب تیار ہو
رہے تھے، ایسے میں اگر کوئی نہیں تھا تو وہ افتخار تھا،
دلہن کی طرح سچی گاڑی سفید اتنی گیٹ عبور کر چکی
ہے، بارانی اندر جا چکے تھے، سب ہیں مگر دلہا
نہیں ہے۔

☆☆☆

چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا
میری آوارگی نے مجھ کو آوارہ بنا ڈالا

رہتے تھے، شطرنج کی میز ویسی ادھوری لگتی۔

”دھواں“ ڈرامہ دیکھتے ہوئے (جسے ان سب نے اتنے بار دیکھا کہ گویا حفظ کر لیا) صبا کی ہنسی اور رونائیں دور سے سنائی دیتی۔

بس یادیں رہ گئیں تھیں اور ایک سال بعد یاد بن کے رہ گئی صبا۔

خوشگوار زندگی میں جانے دکھوں کی بلا نے اپنا نامہ کیسے آٹا فانا کھول کے دکھائی آگ سے ابو کی زندگی بھسم کر دی تھی۔

آپریشن تھیمڑ میں صبا زندگی اور موت سے لڑتی رہی، لیکن قسمت ماں جیسی ہی رہی، نہ ماں بن سکی نہ وہ رہ سکی، صبا کے سپرد خاک ہونے پہ ابو بھی ہارٹ ایک سے نہ رہے اور فوت ہو گئے۔

اسے لگا کہ خزاں کا اس کی زندگی پہ سایہ ہو گیا، اس بھری پھری دنیا میں اس کی زندگی کی رونق جانے کسے پر لگا کے پھر سے اڑی، خالہ کے ہاں تو وہ بہت گم جاتا تھا اور شیریں بیگم کے کہنے پہ وہ ایک دو ہفتے رہنے وہاں گیا۔

یہ ایک اجلی اجلی سی ٹھہری سی صبح تھی، سیلی سیلی ہوائیں، جو سوات کی دین ہے نے اس دن جانے کون سی لکھن مٹی کھینے کا عہد کر رکھا تھا، بید کے پتے شونی سے سرسرا رہے تھے۔

وہ خالو اور افتی کے بنائے مشترکہ اسٹڈی روم میں بیٹھا تھا، افتی اس کا کلاس فیلو اور بہترین دوست رہا تھا، اسٹڈی کی کھڑکی باہر کو کھلی تھی جہاں گھر کا ایک بڑا سا باغیچہ تھا، باغیچے کے ساتھ ایک پتھریلی روش بیل کھائی اندر کو مڑتی تھی، وہ ”پیارا کارپلا شہر“ کھولے ہوئے تھا کہ ہنسی پہ ٹھنک کے کھڑکی کی طرف مڑا جہاں پردے بٹے ہوئے تھے اور روش پہ چلتی وہ لڑکی جسے اس نے ایک دو بار دیکھا ضرور تھا مگر ایسی نظروں سے ہرگز نہیں۔ گاؤں کی آبشار کی شور جھکارتی، اس کی ہنسی

داؤد ایک سرکاری اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، مضبوط کاٹی، گورے گلابی گال، نیلی آنکھیں، ابو ہر لحاظ سے حسین تھے ایک خامی جو بھی وہ ان کی تیز آواز کی تھی، وہ اگر بولتے بھی تو لگتا نہ تھا کہ پیار سے بول رہے ہیں، بلکہ ایسا لگتا کہ جیسے غصے میں بول رہے ہو۔

وہ اور صبا جڑواں تھے، امی بے چاری دونوں کو جنم دے کر فوت ہو گئی تھیں، امی کے وفات کے بعد پھپھو نے ابو پہ ہر قسم کی کوششیں کی، دباؤ ڈالا، بچوں کی شخصیت میں بگاڑ آنے کے ایسے ایسے نقشے کھینچے کہ ابو کو سامنے دنیا کی بدبختی مافوق الفطرت سی لگتی اور دنیا کے لوگ کسی خوشخوار بھیڑیے کی طرح ان کے بچوں کے خواہشوں اور ارباموں کی یونیاں نوچ نوچ کے کھانے لگتے، ان سب واہموں، دھمکیوں اور شکوؤں کے باوجود ابو نے اپنی بات نہ چھوڑی اور اپنی بات پہ ڈٹے رہے۔

”میں اپنے اولاد کو سوتیلے پن کا سایہ نہیں دینا چاہتا حورے، میں نہیں چاہتا کہ ان کی تربیت میں مجھ سے ذرا بھی کوتاہی ہو۔“ پھپھو وغیرہ ”ہونہہ“ کہہ کر چلی جاتی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ داؤد محض لفاظی نہ رہا، اس نے بچوں کو ماں کی مامتا سے محروم نہ رکھا اور باپ کی شفقت کی جو آخری حد ہے اسے حد کی انتہا کر دی تھی۔

ایسا پیار نہ دیکھا کسی نے، ابو وہ اور صبا ایک ٹرائے ایٹکل سے تھے، ایک نقطے پہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، ایک دوسرے کے لئے اہم تینوں دوست تھے، سہیلیاں تھیں۔

وہ سکیٹڈ ایئر میں تھا جب صبا کی شادی ہوئی، صبا کی شادی کے بعد وہ اور ابو بہت اداس

”ہاشم کو بلاؤ۔“ مگر آکر ہاشم نے
مستفسرانہ نظروں سے کمرے میں دیکھا۔

”اتنی ابھی پہنچا کیا؟“

”وہ تمہارے ساتھ نہیں آیا تھا کیا؟“

”وہ بیچ راستے میں اتر گیا تھا، وہ حبیب

جیوری ہے نا وہاں اتر گیا تھا۔“ ابو نے قدرے

غصے سے اس سے حواس باختہ لڑکے کو دیکھا، ٹھیک

اور حیدر ”حبیب جیوری“ پہنچے، کاؤنٹر بوائے سے

استفسار کیا۔

”یہاں یہ شخص آیا تھا؟“ وہ موبائل میں

اتنی کی تصویر دکھائی، کاؤنٹر بوائے نے غور سے

دیکھا اور پھر کچھ یاد آنے پہ کہا۔

”ٹھہریے سرا۔“ دروازے ایک خاکی لفافہ

اٹھا کے دیا، حیدر نے مستفسرانہ نظروں سے

دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”پتا نہیں، یہ کیا ہے، ان صاحب نے

جاتے ہوئے دیا تھا۔“ حیدر نے بھیجے ہونٹوں

سے لفافہ چاک کیا تھا، جیسے جیسے پڑھتا گیا، اس کا

چہرہ زرد مائل ہوتا گیا۔

ادھر گھر میں شرین بیگم بار بار زلف سے

کہے جا رہی تھی۔

”زلف! فون ملاؤ حیدر کو۔“ سرخ گھیردار

فراک میں چٹیا آگ کو ڈالے وہ ایسی لگ رہی

تھی کہ جیسے پری زاد یوں کی ملکہ ہو، لانی

مڑگاں، دودھیا گالوں پہ چمیل سے نین کٹورے،

آپٹل تھا کہ اڑا ہی جا رہا تھا۔

ماحول پہ جمود کی سی کیفیت تھی، مہمانوں میں

چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھی۔

”شرین بیگم! کچھ کہجئے۔“ حیدر نے جیسے

کال پک کی زلف کے چہرے پہ مسکراہٹ سی پھر

مٹی۔

میں مقید تھی، دفعتاً اس نے اپنا دل ٹٹولا، خزاں
جانے کو ہے، بہار کو سندیدہ دیا جائے، بہار کو
سندیدہ ملا اور دل کا موسم بدلا، دھنک رنگ
اترے اور وہ محبت کے رنگ میں رنگ گیا۔

اس نے اپنے رنگریزہ کو دیکھا، جس کی ہنسی
تعمنے کو نہ تھی اس نے خود کو بھلا دیا اور یاد رہا تو
صرف حورے، حورے، حور عرش۔

ارض و سماں درد کیا جاتا تھا اور وہ مہبوت

رہا اور مہبوت رہ ہی گیا کہ۔

حورے اب اس کی نہیں تھی، وہ کلی حور عرش

سے حور عرش اتنی بن جاتی، وہ اتنی کی تھی، اتنی،

اس کا خالہ زاد بھائی اس کا دوست اور اس کا

رقیب بھی۔

☆☆☆

ساڑھے پانچ بج چکے تھے، باراتیوں کی آؤ

بھگت ختم ہوئی، رابعہ بیگم بھائی صاحب سے بات

کرنے پہنچی۔

”بھائی صاحب ساڑھے پانچ بج چکے

ہیں۔“ ابو مسکرائے۔

”وہ تو مجھے پتا ہے۔“

”وہ میں چاہ رہی تھی کہ جلدی سے مردانے

سے گواہ اور مولوی کو بلوا لائیے تاکہ جلدی سے

نکاح ہو سکے۔“ رابعہ بیگم نے مدعا بیان کیا،

مردانے اطلاع دی گئی، حیدر اور ٹھیکل بھائی

آئے۔

”خالو اتنی تو نہیں آیا ہے۔“ اور ابو نے

سفید چہرے سے اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے ہو حیدر؟“

”خالو بچ کہہ رہا ہوں میں، اتنی تو آیا ہی نہ

تھا۔“

”دولہا کی گاڑی کون لایا تھا؟“

”ہاشم لائے تھے۔“

”ہیلو حیدر! کیا پتا چلا؟“

”پتا چل گیا؟“

”کہاں ہے افق بیٹا؟“

”آ رہے ہیں بس، ذرا صبر کرو۔“ اس

نے صبر کیا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور حیدر اور
فکیر نے یہ صبر کا پھل سب کو کھلا دیا۔

”افق ہالینڈ چلا گیا ہے چار بجے کی فلائٹ

سے، اس نے انکار کر دیا ہے شادی سے، یہ خط۔“

لقافہ زلف نے جھپٹ لیا تھا، شیریں بیگم نے

جلدی سے زلف کو پکڑ لیا۔

”کیا لکھا ہے؟“

”لکھا ہے کہ میں آپ سے شرمندہ ہوں،

میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔“ شیریں بیگم کی آنکھیں

ابل آئیں، دل پہ ہاتھ دھر، دھڑ سے زمین کے

سینے سے لپٹی۔

زلف کا چہرہ حنوط زدہ ہو گیا، ابو دھڑ سے

کرسی پہ گر گیا، رابعہ بیگم بین ڈالنے لگی۔

”وائی خدا، میری بیٹی، میری چاندنی بیٹی

اچڑ گئی۔“ اور کوئی اندر دھن کی گھنٹی نہیں

دہن..... حور عرش..... محبت کا منار نور کے ساتھ

ساتھ خوشبو بھی دیتا رہا، خوشبو نکھیرتی، نور

پھیلائے جاتا۔

مگر پھر عجیب سا واقعہ ہوا کہ اگلے دن کی

حنانت میں محبت کے منار میں سیاہی لگی اور آن کی

آن میں محبت کا منار سیاہ ہو گیا۔

☆☆☆

حور عرش، آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

عروسی جوڑے میں آئینے کے سامنے کھڑی

اس کے قد حارثی انار سے لب مکر اہٹ میں

ڈھلے ہوئے تھے، ایسے میں اسے کا مدار دوپٹہ

اٹھایا اور نزاکت سے مڑی، یکدم دروازہ کھلا اور

زدہ چہرے لئے زلف اندر آئی۔

”حورے! افق بھائی۔“ اسے زلف کا لہجہ،

ایک ٹوٹے مرتبان سا لگ رہا تھا۔

حورے نے آگے بڑھ کر کا مدار دوپٹے کے

ستاروں کو اجڑا پایا۔

”کیا ہوا..... زلف؟ افق کو کیا ہوا ہے؟“

زلف دیوار سے لگتی گئی۔

”حورے! تمہاری شادی برباد ہو گئی، افق

بھیانے انکار کیا ہے شادی سے، اور اب..... اور

اب۔“ حورے نکھار کیے کب سے زعفران بنی

بیٹھی تھی۔

کیا بارگاہی سے اٹھی پلکیں رکی اور دکھ سمونے

آنکھیں ایسی لگی کہ جیسے وہ رات ”کالا پانی“ بن

گئی ہو، حورے نے اسے سہم کر دیکھا اور دیکھتی

رہی۔

کیا اس نے یہ سنا؟ کہ افق.....؟ کیا وہ

بہری ہو گئی یا یہ تمنا ابھی اس نے کی بہری ہو

جانے کی، کیا اس نے وادی سوات کے اس عظیم

دکھ کو ڈھاتے دیکھا اور سہا؟ سہنا بعد کا کام ہوتا

ہے اور بعد کے کاموں کی حنانت نہیں دی جاتی۔

اس کو نور و گل کی شادی یاد آئی، جب دلہا

سیف خان دشمنی کی سمیٹ چڑھ گیا تھا، عین

شادی کے روز دشمن نے بارات میں ہی قتل کر دیا

تھا۔

ابھی جو حورے آئینے کے سامنے کھڑی تھی،

جو زعفران بنی تھی اب اچڑنے کی کٹھا معلوم ہوئی

تھی، بے حالی اس کی بے حال آنکھوں سے

جھانک رہی تھی اور سانس دھونکی کی طرح چل

رہی تھی۔

جب خواہشوں سے میرا پائی گئی تو ”برہا“

سے چور زمین پہ ڈھیر ہو چکی تھی اور سب نے پایا

اور یہی سنا۔

افق..... حورے..... شادی اور..... برہا!!!!

”منظور ہے۔“ جذبات سے عاری لہجے

میں کہا گیا۔

”کناح خواں کو بلایا جائے۔“

”حورے کو اندر لے جاؤ، اس کا حلیہ بھی ٹھیک کرو، اگر اس کو اعتراض ہو بھی تو بھی..... اور زلف بینی کو بھی لے جاؤ۔“ اندر کمرے میں جب دونوں لائی گئی تو زلف نے اس بے یقینی سے جس میں سارے دکھوں کی حدیں ختم ہو چکی تھی، سے حورے سے کہا۔

”کیا تم حیدر سے شادی کرو گی؟“

”میں بتا چکی ہوں زلف! جان دے سکتی ہوں مگر دل نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے، تم راضی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے زنی نظریں اٹھائیں۔

”ہاں، میں راضی ہوں۔“

”تم ایسے کیسے کر سکتی ہو حورے؟“

”جیسے تمہارے بھائی نے کہا، مجھے چھوڑ

کے، تو سنو زلف، میں تمہاری محبت نہیں چھینوں گی بلکہ حیدر سے شادی کر کے خود کو سزا اور رافق کی آخری خواہش کو جزا دوں گی۔“

”تم یہ سب کر رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس ایک لفظ اقرار میں کتنا سناٹا

تھا، طوفان کی طغیانی کو خود میں پنہاں کیے۔

محبت ظلم نہیں، محبت تو مظلوم ہے، کسی انسان کا ہو کے، اس کا نہ ہونا اس دنیا کی سب سے بڑی مظلومیت ہے۔

”میں عروسی کپڑے نہیں پہنوں گی زلف!

مجھے سفید جوڑا لا دو۔“ سفید جوڑا پہنے جب زلف نے تکمیل آخری خواہش کرنے والی سفید جوڑا پہنے اس روح کو گلے لگایا تو نجانے کیوں تمام گلے شکوے ایک دم مسمار ہوئے، دونوں اتنا روئیں کہ جیسے دونوں نے غم کو پالیا، سہہ لیا اور

☆☆☆

ابو کے کمرے میں خاموشی سر نہواڑے چکرار رہی تھی، ابو سر برداری کر ہی پہ بیٹھے تھے، جبکہ مصیبن صاحب افق کے والد چار پائی پہ ٹھیکل صادق اور ہاشم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، صوفے پہ شیریں بیگم اور رابعہ بیگم بیٹھی ہوئی تھی، گل مینہ اور حیدر چار پائی پہ بیٹھے ہوئے تھے، زلف دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کھڑی تھی اور جبکہ حورے قالین پے اجڑے ہوئے انداز بیٹھی دیوار سے ٹپک لگائے ہوئے تھی۔

”بھائی صاحب!“ دفعتاً اس خاموشی کا گھلا گھونٹا گیا۔

”اب آپ ہی کچھ بولے۔“

”افق نے ہماری ناک کٹوا دی۔“ ابو بولتے ہوئے رکے، حورے نے سوچا اس نے میرا دل کٹوا دیا۔

”اب ہم چاہتے ہیں کہ حورے ہماری ہی رہے میں دونوں ہاتھ جوڑ کے آپ سے التجاء کرتا ہوں، یہ افق کی ہی خواہش ہے کہ حورے کی شادی حیدر سے ہو۔“ بہت رو پھٹی آنکھوں میں غنجد ہو جانے کی سی چمک عود آئی، دیوار کے ساتھ ٹپک لگائے کھڑی زلف یک لخت کرنٹ کھا کے رہی۔

”ہمیں منظور ہے..... لیکن.....“ حورے کے والد نے درزیدہ نگاہوں سے پہلے صدیق اور پھر زلف کو دیکھا۔

”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ زلف کا نکاح صدیق سے ہو۔“ سرد لہجے میں اس بات پہ زلف کی آنکھیں اٹلیں، جیسے بخ بستہ ہواؤں کا بیجان لبریز طوفان کے زو میں آگئی ہو، شیریں بیگم کی نظریں شوہر پہ لگی اور شوہر کی حورے کے والد پہ۔

سنبھل گئیں۔

”حیدر ولد داؤد، تمہیں حور عرش بنت فیروز
شاہ بہ عوض دولا کھت حق مہر قبول ہے؟“

☆☆☆

آسان کسی بیوہ کی طرح آنسو بہا رہا تھا،
چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا، دریتچے کے ساتھ
وہ کھڑی تھی، گلجے اندھیرے میں چہرہ نیم حوط
زودہ معلوم ہوتا تھا، قسمت نے بھی کیا عجیب کھیل
کھیلے؟

”بارات محبت“ میں ”میں محبت“ کا اٹھنا
کیسا عجیب مذاق ہے۔

آوازوں کی بازگشت سارے میں غم کی تہہ
دبیز کرتی تھی، انہی بازگشتوں میں جیسے کسی بوسیدہ
کتاب میں دہلی سرگزشت کو کھینٹ لیا گیا ہو۔

”تم میری زندگی ہو اور پتا ہے نا، زندگی
تب قائم رہتی ہے، جب سانس چلتی رہے،
جب میری سانسوں نے جفا کی ٹھانی تو میں
سمجھوں گا میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی۔“ آواز
نہایت میٹھی تھی، یکدم آواز کی لے بدلی اور دیو
مالائی پن دیویوں کے زہریلے نغمے کا روپ دھار
بیٹھی۔

”میں بھائی ہوش و حواس کے، اس شادی
سے منکر ہوں، میں یہ شادی نہیں کر سکتا، میں آج
چار بجے کے فلائٹ سے ہالینڈ جا رہا ہوں، ہو
سکے تو مجھے معاف کرنا حورے! میں تمہاری
تکلیف کا باعث بنا، میری مجبوری ہی کچھ ایسی
نوعیت کی تھی جس میں، میں بھی پس منظر میں چلا
گیا۔“

انہی بازگشتوں نے دریتچے کے آبگینوں پہ
عجب ضرب دی، یہ وہ دھڑکی، جس نے دہرے ہر
ذی روح کو سماعت سے بے بہرہ کر دیا تھا،
دروازہ ٹھاہ سے کھلا۔

”حورے! حورے!“ شمع ہاتھ میں

☆☆☆

”تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا، کیا تم اس فیصلے
سے خوش ہو؟“

”خوش؟“ وہ استہزائیہ ایسی ہنسی کہ جیسے اپنی
ذات اپنے آپ پہ ہنسی ہو۔

”خوشی کے تمام لغوی معنی اس وقت بہہ
گئے جب تم نے دیوار سے ٹیک لگائے آنسو بہانا
شروع کر دیئے تھے۔“

”ویسے حورے تمہیں لگتا ہے کہ تم خوش رہ
پاؤ گی؟“

”میں.....؟ میں ایک ایسی کٹھ پتلی بن گئی
ہوں جس کی ڈور اب تقدیر کے ہاتھ میں ہے
جیسے چاہے تم نچاؤ گی؟“ وہ ہنستے ہوئے رو دی
تھی۔

”اور تم صدیق بھائی کے ساتھ؟“
”جب حیدر نہ رہا حورے تو پھر صدیق کیا؟
کوئی اور کیا؟ کوئی معنی نہیں رکھتا۔“
”نکاح کب ہوگا؟“

”پتا نہیں حورے! چلو میں تمہارے ہاتھوں
پہ ہندی لگاتی ہوں اور ہندی سے ”حیدر“ اور
تمہارا نام لکھتی ہوں، اللہ کتنا بچے گا، وہ تو میرا
بھائی تھا، مجھ سا بد قسمت، وہ تو محبت کے لائق ہی
نہ تھا، وہ تو تمہارے لائق ہی نہ تھا۔“ زلف نے
اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور اس نے یوں کھینچ لئے
جیسے کوئی نامحرم مرد نے اس کا ہاتھ پکڑا ہو۔

”نہیں کیوں لگاؤں، مردوں کو ہندی لگائی
جاتی ہے، سنو زلف! مجھے اور تکلیف مت دو۔“
اور وہ رو دی۔

نکاح خواں آچکا ہے اور حیدر سفید شلوار
قمیض پہنے ”ان چاہا“ دلہا بن کے ”چاہی“ دلہن
لینے آ رہا ہے۔

تھی۔

”وہ اللہ کو منظور تھا، کہا نا۔“ ماں نے لجاجت سے اس کا ہاتھ پکڑا، جس قدر چینی دباؤ میں تھی نکاح کے بعد حورے، ماں راجہ بیگم کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ غم سے مر جائے گی۔

”مگر میں بھی تو اللہ ہی کی بندی ہوں“

”مورے!“

”تو اللہ کے بندوں پہ ہی آزمائش اترتے ہیں۔“ اس نے تحیر سے ہاتھ ہٹایا۔

”آزمائش؟“

”ہاں آزمائش۔“

”کون سی آزمائش؟ یہ آزمائش کہ میرا رشتہ افق کے ساتھ ہوا اور بھرے پھرے بارات میں نور و گل کی طرح مجھے چھوڑا؟ یا یہ آزمائش کہ میری حیدر کے ساتھ شادی ہوئی، محبت کے ٹھکرا جانے کے بعد دل مردہ ہو جاتا ہے اور جب دل مردہ ہوتا ہے تو انسان پہ آزمائشیں اتریں بھی تو کیا فائدہ؟“

”مجھے پتا ہے حورے کہ تم بے سکون ہو، سکون سے رہو۔“

”اور آپ کو یہ بھی پتا ہونا چاہیے، کہ سکون نامی شے کا اب میری زندگی سے واسطہ نہ رہا۔“

”انسان کی زندگی میں خطرناک موڑ آتے ہیں۔“

”مگر انسان کا دل ایک بار ٹوٹا ہے۔“

”دل ٹوٹ جاتا ہے، رشتے نہیں ٹوٹتے۔“

”محبت مر جائے تو دل ٹوٹتا ہے، دل ٹوٹ

جائے تو انسان بکھر جاتا ہے، انسان بکھر جائے تو انسان کو خود کا نہیں پتا ہوتا، رشتے تو پس منظر ہو جاتے ہیں۔“

”محبت مرتی نہیں حورے! اگر محبت ٹھکرا بھی دی جائے، ذلیل بھی ہو جائے تو محبت محبت

پکڑے، ذہنی عمر کی مورے نے اسے پکارا، لکچھے اندھیرے میں شمع کی دائرہ نما روشنی محور نص ہوئی، پری رخ نے رخ موڑا۔

”مورے.....!!“

لفظ ٹوٹ گئے، مورے نے سوچا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے اور جب اس نے کہنا شروع کیا تو ”کچھ“ سمٹ کر ”بحر اکا مل“ بن گیا۔

”مورے! دل ایک مرچے کا مجموعہ ہے جو اپنی محبت کے میت پہ ماتم کتاں ہوتا ہے، میرے دل یہ مت جانیے میرا دل تو ایک کورا کاغذ ہے، جس نے جو بھی رقم طراز کیا وہ سانس سے تنک نقش رہا۔“ ماں نے شمع دان میز پہ دھرا۔

”اس طرح مت سوچو، دل بند ہو جائے گا۔“

”دل ہی تو بند نہیں ہوتا مورے!“

”وہ اللہ کو منظور تھا حورے! صبر کرو، صبر سے کام لو، خدا نے اس میں ضرور کوئی مصلحت رکھی ہوگی، جس شخص کو محبت کو لے کر تم رو رہی ہو حورے، وہ تمہیں ٹھکرا چکا ہے۔“

”میں اس کی محبت کو لے کر نہیں رو رہی ماں، میں اپنی محبت پہ رو رہی ہوں۔“ ماں نے اسے سامنے بٹھایا۔

قدحاری اتار سے ہونٹ رعشہ زدہ تھے، سنہری شام کی سی رنگت پہ مٹے مٹے آنسوؤں کے نشان ثبت تھے، کان کے جھکے سے ایک آوارہ لٹ بے طرح الجھا ہوا تھا، نین کٹوروں میں آنسوؤں کی ”خوشی“ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ حور عرش تھی، عرش کی حور، مگر زمین پہ اتار دی گئی تھی، جس کا اسے بھی قلق تھا۔

”مورے! میرا نام حور عرش کیوں رکھا؟ اگر حور عرش ہوتی تو اس زمین پہ اترنے کا مفہوم؟“ شکوے میں آنسوؤں کی رقیق شامل

”تم خدا نہیں تھے، سنگ مرمر کا دل پایا تم نے، تم بے وفا، سنگ مرمر کا دل پایا تم نے۔“ بے ربط جملے کہتے وہ پیچھے ہٹتی گئی، ہنسی گئی اور پیچھے ایک چٹان سے ٹکرا گئی، اس کا سر چکرایا اور وہ رخ پانی میں گر گئی۔

جیسے ہی وہ گری، جیب کے ٹائزر چمچڑائے، حیدر کسی طوفان کی طرح اس تک آیا، وہ سب اسے ڈھونڈنے لگے تھے، ابھی وہ کل آویزہ کے وہاں تلاشے جا رہے تھے جب نہر کے پاس اس نے چیخ سی، بے ہنگم، روٹی پھینکی، جب حیدر نے اسے ہاتھوں میں بھر لیا، تو ایک آوارہ لٹ اس کے گلابی رخسار پہ سایہ گلن ہوا، حیدر نے دھیرج سے ہٹایا۔

”تم واقعی عرش کی حور ہو، شکوہ اس رب سے نہیں، شکوہ خود سے ہے کہ میری محبت اتنی قیمتی کیوں ہوئی کہ عرش کی حور کو فرش پہ اترا پڑا۔“ سیلی سیلی ہوائیں اپنے اندر ڈھیر سارے آنسو سیٹے ہوئے تھیں۔

☆☆☆

حورے کی رخصتی افق کے گھر ہی ہوئی، ایک دو ہفتے گزر کے اسے حیدر کے گھر جانا تھا، حورے کی رخصتی کے دوسرے روز زلف کی رخصتی طے تھی۔

وہ کمرے میں نیچے قالین پہ بیٹھی، بیڈ کے بائیسے سے ٹیک لگائے ہوئے تھی، زلف بھی جا چکی تھی۔

حورے کے سفید لباس پہ سفید کفن کا ماتم نکھرا تھا، اس کی کلائیوں میں عظیم مرثیہ نگاروں کے ”نوح“ چمن چمن ”غم“ کے راگ آلاپ رہے تھے اس کی غزالی آنکھوں میں ”رات“ بسرام تھی، اس کی نظریں ہاتھوں پہ تھی، جس پہ پہلے افق کے نام سے مہندی لگی تھی اور آج یہ

رہتی ہے، کہیں بھی، کیسے بھی، ایک کک کے مانند ایک کرب کے روپ میں، لیکن رہتی ہے۔“ مزید کو کچھ کہنے سے گریز کرتے ہوئے ماں باہر چلی گئی مگر۔

”کل تمہاری رخصتی ہے حورے!“ بتانا نہ بھولی۔

”محبت رہتی ہے سدا، اسی کا تودکھ ہے، اسی کا تودکھ ہے۔“ وہ روتے روتے پیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

رات مزید آنسو جذب نہ کر سکی اور صبح کو آنے پہ مجبور ہوئی اور صبح جیسے اترنے کو بے تاب کھڑی تھی۔

☆☆☆

وادئ سوات پہ غم زدہ فضا ٹھہری ہوئی ہے، ایک دکھ ساء، ایک کک کے لپیٹ میں سیلی سیلی ہوائیں کربناک معلوم ہوتی ہے۔

وہ صبح ہی آگئی نہر کے پاس، نہر محبوبانہ ہوا، ساں بجر میں مضطربانہ، نہر اپنے اندر تمام عکس منعکس کیے بہہ رہا تھا، ہاں اس میں ایک عکس وہ بھی تھا۔

ایک ”من چلی“ اور بے نیازی لڑکی، رخ بستہ ہواؤں میں بید کے سبز تے پہ کھوئے کھوئے انداز میں ہاتھ پھیر رہی تھی، تنے پہ لکھا تھا ”افق“ اور حور عرش“ تنے پہ پھیر پائی تانی دیوی کا ہاتھ تھا۔

”تم چاہتے تھے افق کے میں حیدر کی دلہن بنو، میں حیدر کی رہو، میں اس کی نصیب بن جاؤں؟ وہ میرا نصیب بن جائے؟ تم خدا تو نہیں تھے افق کہ نصیبوں کے کھیل بھی کھیلنے لگے، کیسا دل پایا تم نے افق؟ سنگ مرمر کا دل، سنگ مرمر کا، سنگ مرمر۔“ سسکی ابھری اور ایکدم سے ایک ایسے چیخ کا روپ دھار بیٹھی، کہ تنہاں الوکو اپنی کریمہ چیخ پہ ناز ہوا۔

مہندی حیدر کے نام کی تھی۔

اسے مسلا، آنسوؤں کی تھالیاں اڑھکنے لگا۔

”دیکھو حورے!“

”دیکھو حیدر! تم چاہتے ہو گے جو بھی، مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں تمہاری خواہش پوری کروں، میں پیار کی تپسیا کرنے والی وہ بریم مداران ہوں، جس نے ساری محبتیں اس جوگ میں تیاگ کر دی ہیں، میرے حوصلے کو اکارت کرنے سے پہلے حیدر جان لو کہ جان دے سکتی ہوں مگر دل نہیں۔“ یہ کہہ کے وہ انہی اور باہر نکل، باہر کھڑی بے آواز روئی زلف سے نظریں چار ہوئی، دونوں کی نظریں ایک ٹاپے کے لئے ملی، بے اختیار زلف نے نظریں چرائی اور مڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

ایمسٹرڈیم۔

سنگی بیٹھ بیٹھے اس پتھر شخص کی آنکھیں، فضا میں غیر مرئی نقطے پہ جامہ پتھر میں، اس سنہری مگر خشک آلود شام میں جیسے انتظار کی ہوا میں تھکی سی، دفعتاً ایک ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھا گیا، بے اختیاری میں اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”سنو لڑکے کیوں اداس ہو؟“ ایک پینتالیس سالہ عورت جس کی آنکھیں نیلی سی تھیں، نے اسے ایسے پوچھا جیسے پوچھ رہی ہو۔

”تم مر رہے ہو، مرتے کیوں نہیں؟“

”اداس نہیں ہوں میں، میں تو خوش ہوں۔“

”اچھا، خوش ہو؟ ایسے خوش کہ ہونٹ تمہارے سختی سے سمجھنے ہوئے ہیں، آنکھیں کسی بھی جذبے سے عاری ہے، پیشانی پہ لکیریں ابھری ہوئی ہیں۔“ وہ عورت اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ ہم ہنسیں، ہمارے چہرے پہ مسکراہٹ ہو اور ہم بلند بانگ قہقہے

حیدر اس کے سامنے بیٹھا۔

”انشاء اللہ ہم جلد جلیں گے اپنے گھر۔“ اس نے شرارے اٹھائی نظروں سے سامنے بیٹھے خوش باش شخص کو دیکھا۔

”مجھے حورے نہ کہو، میں حور عرش ہوں۔“

”تم واقعی عرش کی حور ہو۔“ وہ خاموش رہی۔

”جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے حورے!“

”جو ہوا ہے اس کا سوگ رہے گا۔“

”یہ حقیقت ہے حورے! ایک پیارے کے چلے جانے سے بہت پیاروں کو چھوڑا نہیں جاتا۔“

اس کی محبت کا دھرم کتنا معتبر تھا، لفظ ”حقیقت“ نے اسے اچھوت کر لیا۔

لفظ ”حقیقت“ نے اس کے چہرے پہ چھائی محبت کی ست رنگی نور چھینی اور اس کی محبت کو اپنی پنجرے میں لاسی۔

”ہم سب کہتے ہیں تمہیں حورے، زندگی کی طرف لوٹ آؤ، جو ہو چکا، وہ ماضی بن چکا۔“ اندر آئی زلف ٹھک کے رکی اور اس کی سانسیں ”بحر مراد“ بن گئی۔

”میں کیسے زندگی کی طرف لوٹ آؤ حیدر داؤد، اور پیاروں کی بھی خوب کہی۔“ ایک بے رنگی میسکراہٹ سوکھے ہونٹ پہ رینگ گئی۔

”پیار کا دائرہ وسیع نہیں ہوتا، محبت ایک دفعہ جالا پتی ہے اور صرف ایک شخص کے گرد پھٹی ہے اور جو شخص اس جالے کا موجد بنے تو زندگی بن جاتا ہے اور جب زندگی نہ رہے تو کیسے زندگی کی طرف لوٹ آئے؟“ ایک گرم آنسو چپے چہرے پہ لڑھک گیا، زلف نے بے دردی سے

ہوں کہ صدیق تمہارے لئے اچھا ثابت ہو۔“
شیریں بیگم نے روتے ہوئے اسے گلے لگایا۔
”مورے! میں تو خوش ہوں اس میں بھی،
اس حالت میں بھی، کہ دل مردہ ہے، اس حالت
میں بھی، کہ میں اپنی محبت سے دستبردار ہو چکی۔“
رابعہ بیگم نے اسے دیکھا اور اس عجیب لڑکی کو
دیکھا جو رونا چاہ رہی تھی مگر رو نہیں رہی تھی،
شیریں بیگم دوبارہ رونے لگی۔

”میں شرمندہ ہوں بہت میری بیٹی، مجھے
معاف کر دو۔“

”مائیں معافی نہیں مانگتیں مورے، مائیں
دعائیں دیتی ہیں، دعا دیں اور مجھے رخصت کر
دیں۔“ سرد لہجے میں اس نے کہا، شیریں بیگم نے
اسے گلے لگایا۔

”خدا صدیق کو تم پہ مہربان کر دیں،
تمہارے اور اس کے بیچ محبت کا رشتہ بنے۔“ وہ
رخصت ہو کر حورے کے گھر آ گئی۔

اس نے اپنے ارمانوں کے میت کو سمجھوتے
کے قبرستان میں دفن کیا اور دفنانے کے لئے
خود کو تیار کیا۔

پھولوں کے بیچ وہ بیٹھ کے بے آواز آنسو
بہانے لگی، کمرہ اتنا پریش نہیں تھا، جیسے کہ افق کا
کمرہ سجایا گیا تھا، یہ سب اتنی افتادگی سے ہوا کہ
کمرہ صرف اتنا سجایا گیا تھا کہ بیٹھ کے گرد پھولوں
کی لڑیاں سجائی گئیں اور رابعہ بیگم نے مہمان
خانے سے فریج پر یہاں اس قدر سلطے سے سیٹ کیا
کہ گمان نہیں ہوتا تھا، کہ یہ پرانا فریج ہے۔

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا، کالے شلوار
قیمض کا آدھا حصہ اسے گھونٹٹ کے پار نظر آیا۔
”عرصہ سے ملائے کے پیار میں گرفتار
تھا۔“ وہ بیٹھ گیا تھا۔

”ملا لہ کو ہستانی ہرنی تھی، بلند حوصلے والی

لگائے تو ہم خوش ہوں گے، بعض خوشیاں ایسی
ہوتی ہیں جسے اپنی خوشی کا گلا گھونٹ کے کسی اور کو
دی گئی خوشیوں سے ملتی ہے۔“

”تم صحیح کہہ رہے ہو۔“ نیلی آنکھیں تانیداً
اس کے چہرے پہ لگی ہوئی تھیں۔

”لیکن تم انہی مثال دے سکتے ہو۔“
”یقیناً۔“ نوجوان کا لہجہ سرد تھا لیکن اس سرد
مہری میں بھی ایک بے نام سا جوش تھا۔

”میں ایک دلہے کی مثال دیتا ہوں، ایک
لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں،
دونوں کی شادی ہو رہی ہوتی ہے، ایسے میں اس
لڑکے پہ یہ عقدہ کھلتا ہے کہ ایک دوسرا شخص جو
اس کا دوست بھی ہے اور رشتے دار بھی، اس لڑکی
کو پسند کرتا ہے، اس دوست کو زندگی میں چند ہی
خوشیاں ملی تھیں، وہ لڑکا اپنے دوست کے لئے
اپنی محبت کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کے دوست کو اپنی
محبت مل جاتی ہے، کیا اس نے لڑکے نے بیچ
کیا؟“ نیلی آنکھیں حیران تھیں۔

”اس نے اعلیٰ ظرفی کی اور کسی کو اور کو خوشی
دے کر اس نے اپنے آپ کو عظیم کیا۔“

”میں نے ایسے کیا، میں افق نے اپنے
دوست حیدر کے لئے اپنی محبت چھوڑی، میں
بہت خوش ہوں، بس پتا نہیں کیوں یہ گرم گرم پانی
آنکھوں سے نکلتے ہیں، پتا نہیں کیوں۔“ وہ اٹھا
اور چلا رہا۔

پیچھے بیٹھی لڑکی حیران اور پریشان سی، اسے
اعلیٰ ظرف لڑکے کو دیکھتی رہی، اس کی پشت دھند
میں مدغم ہونے لگا۔

☆☆☆

”میں تمہارے آگے حد سے شرمندہ ہوں
زلف! افق نے جو کیا اس کا خیال نہ تمہیں بھگتا پڑا،
لڑکی ہوتی ہی ”قربانی“ کی گائے، میں دعا کرتی

”اپنے عمر سے زیادہ کے شخص کے ساتھ شادی ہوئی۔“

”شادی میں عمر کا کیا عمل دخل؟ ہم دوا جنبی راہوں کے ہم راہی ہے، آپ کو پتا ہے میں حیدر سے پیار کرتی ہوں اور آپ ملالہ سے، لیکن اب ہم دونوں ایک ہو گئے، اگر ہم محبت نہیں کر سکتے تو ہم یہ رشتہ بھٹا تو سکتے ہیں نا؟“ اس کا لہجہ اس قدر بیکا ہوا تھا کہ صدیق کا دل بھی جھٹکنے لگا۔

☆☆☆

گھریوں خاموش تھا کہ جیسے یکے بعد دیگرے کئی فونکیاں ہوئی ہو، تعزیت کے لئے لوگ آ بھی چکے اور جا بھی چکے ہو، خاموشی گھر کے اعصاب پہ کسی دیویمیکل مافوق الفطرت کی طرح سوار تھی۔

سہ پہر منڈھیروں پہ چڑھ آ چکی تھی، اشمیلا روتنی کے سراپے میں کھلا ہوا تھا، ہوا میں سردی اور خشک بھی، کھانے کے دسترخوان پہ آج سب تھے محض اُفق نہ تھا، حیدر اور حورے کی کرسیاں ساتھ تھیں مگر حورے کی کرچی خالی تھی۔

”تمہیں اسے منانا چاہیے تھا حیدر!“

”میں نا کام ہو جاتا ہوں ہر بار۔“

”حیدر! ایک بات کہوں؟“ صدیق نے ایک پھکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، روایت کے تحت وہ زلف کے گھرتین دن بعد آیا تھا، حورے نے انکار کیا کہ وہ نہیں جانتا چاہتی مگر اور ایسے انداز میں کہا تھا کہ شیریں بیگم کے ساتھ صدیق بھی انگشت پہ داندائا ہوئے تھے۔

”جی کہیے، اجازت کی کیا بات؟“

”جن سے محبت ہوتی ہے، اس کی یاد میں ایک ایک لمحہ عذاب ہوتا ہے، ایک ایک چیز جو اس کی یاد دلائیں، تڑپاتی ہے، میری تم سے اتنی گزارش ہے، کہ تم حورے کو یہاں سے لے چلو

اور نڈر اور بہادر بھی، اس سے محبت کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بہت بہادر تھی، مگر میں غلط تھا، وہ بہادر نہ تھی، وہ شخص ایک لڑکی تھی، اس کے بھائی سیف خان نے ایک دن حجرے میں قتل کیا، دشمنی کے دہال سے بچنے کے لئے ملالہ کو سورہ (دنی) میں دے دیا، تب میں سمجھتا رہا کہ وہ انکار کر دے گی، باغی ہو جائے گی، وہ اس فرسودہ، جاہلانہ روایت کے خلاف اٹھے گی، مگر میں غلط تھا، وہ لڑکی نہ تھی، بھائی کے غلطی کا خمیازہ تھی۔“ گھونگٹ اٹھائے بغیر وہ کہہ رہا تھا، تمبیصر آواز اور مردانہ خوشبو نے کمرے میں ایک عجیب سافسون پھیلانے رکھا تھا۔

”میں ملالہ سے تب بھی پیار کرتا رہا، لیکن اندر سے بہت ٹوٹ چکا تھا، میں سمجھتا رہا، لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں، وہ بے وفائیں وہ مجبور ہوتی ہے، مجھے یہ بھی پتا تھا زلف! کہ تم حیدر کو چاہتی ہو اور ہاشم تمہیں، اُفق حورے کو اور حورے کو حیدر، لیکن وہ سب تمہارے بھائی کے جذباتی فیصلے سے ہونا طے تھا، سب ختم ہو گیا، تم مجھے بھائی کہتی تھی، مجھتی تھی، مجھے لالہ کہہ کے پکارتی تھی، لیکن آج تم میری بیوی ہو، تم اپنی محبت سے یوں کسے دستبردار ہو گئی زلف؟“ وہ جسے وہ صدیق لالہ کہتی تھی، اس سے پوچھ رہا تھا۔

اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا کہ جیسے زلزلے کے زیر ہو۔

”ضروری تھوڑی ہے کہ ہم جنہیں چاہے، جنہیں سوچے، وہی ہمارا مقدر ٹھہرے؟ آپ بھی تو ملالہ کو چاہتے تھے لیکن زندگی سے آپ نے سمجھوتہ نہیں کیا؟“

”میں نے سمجھوتہ کیا، تم قربانی کی سمیٹ چڑھی۔“

”میں قربانی کی سمیٹ کیسے چڑھی؟“

”مجھے طلاق دو مجھے سکون آجائے گا۔“ غم آنکھوں میں سارے جہان کے زہروں کا پانی جمع ہو گیا، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

☆☆☆

المسٹر ڈیم۔
المسٹر ڈیم کے مشہور گل لالہ کی سرخی میں کالے پن کا غصہ سمٹ آیا، ایک گٹھی گٹھی سی ہوا اور اوپر سے ہوا میں رچی چلتے کی بسانہ، کہ جیسے دور کوئی گوشت جلا ہوا اور کہ جیسے پاس کوئی دل جلا ہو۔

المسٹر ڈیم کا مقامی مال ہے، جس کی چکا چوند آنے والوں کے لئے حیران کن بھی ہے اور خوشگوار بھی، ایک عورت جس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور بال سنہرے، اس نے ایک بیک اٹھایا ہوا تھا، مال سے نکلنے وقت اس کے بیگز میں اضافہ ہو چکا تھا۔

فٹ ہاتھ پہ چلتے وہ بس اسٹاپ تک پہنچی، جیسی روکنے کے لئے وہ رکی کہ فٹ ہاتھ کے دوسرے جانب اسے وہ اداس لڑکا نظر آیا، اس نے جیسی روکنے کا ارادہ ترک کیا۔

”ہائے۔“ نیلی آنکھیں اداس طائر کے پروں سمٹ کے رنگ کھونے لگی تھیں، افق کی نظریں اٹھی اور جبراً مسکراہٹ چہرے پہ سمٹ آئی۔

”تم اتنے اداس کیوں رہتے ہو؟“

”میں اداس نہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نام سے کیا ہوتا ہے، کچھ بھی رکھ دیا جائے۔“

”نام سے پہچان ہوتی ہے، تعارف بھی۔“ نیلی آنکھیں، اس کے چہرے پہ جلی تھیں۔

”میں اپنا تعارف کرا لی ہوں، میرا نام ماریانا ہے، میں کرچن ہوں، شوہر کا انتقال ہو چکا

اپنے گھر، وہ جب تک افق کے گھر رہے گی، وہ ایسے ہی بغاوت والی باتیں کرتی رہیں گی۔“

دستر خوان پہ بیٹھے سب لوگوں کی نظریں جکی ہوئی تھیں، حیدر کی تائیدی نظریں صدیق پہ تھیں اور جب اٹھی تو اوپر کھڑی حورے پہ جم گئی، جو اس دکھ جس کو عبادت کی طرح سمیٹے ہوئے تھی، آنکھوں میں سموئے صدیق کو دیکھ رہی تھی۔

”یعنی اب افق یاد بن کے رہ گیا؟“ شیریں بیگم اور زلف نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔

”وہ یاد بن کے رہ گیا محض، ایسی بھی کیا افتادگی آن پڑی ہے، کہ آپ نے اسے ماضی کر لیا؟“ دکھ جس جس کا نام ہے، حورے کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔

”تم یہاں آؤ، سکون سے بیٹھو، کھانا کھاؤ۔“ زلف اٹھی اور اسے بازو سے پکڑا۔
”سکون؟“ اس نے زلف کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”سکون کس دکھ کا نام ہے، اس دکھ کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں، وہ تو وہ لے گیا، میں بے سکون ہوں زلف!“ یکدم غصے سے رونے لگی۔
”یہاں ہے کوئی جو مجھے سکون دے سکیں؟ ہے کوئی؟“

”آؤ حورے یہاں بیٹھو، سکون سے۔“ ہاشم بھی اٹھا۔

”تم دے سکتی ہو سکون؟“ غم آنکھوں میں اس کا دل بھی بہہ گیا، حیدر نے اسے دیکھا۔
”میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں حورے!“ حیدر کا لہجہ سخت تھا۔

”سکون دے سکتے ہو؟“
”ہاں، میں تمہیں بے سکون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”صحیح ہے حورے، حیدر تمہیں طلاق دے گا، پر ان سب کے سامنے میں تمہیں یہ صاف بتا رہا ہوں کہ حیدر سے طلاق لینے کے بعد تم ہماری بیٹی نہیں رہو گی، تمہارا اور ہمارا تعلق نہیں رہے گا، چلو صدیق..... زلف بیٹی..... چلیں سب۔“

فیروز صاحب اٹھے اور سب نے اس کی تقلید کی تھی۔

”جو لڑکی اپنی محبت کی خاطر، اپنی عزت نیلام کر سکتی ہے، وہ رشتوں کے لائق نہیں ہوتی، محبت خدا نہیں ہوتی، جس کی عبادت کی جائے محبت بس ایک احساس ہے، یہ ہوتا ہے اور رہتا ہے۔“ ابو اس نمک کے بت کو مزید کہتے میں ڈال کے چلے گئے۔

”حیدر بیٹا! تم حورے کو اپنے گھر لے چلو، یہ یہاں رہے گی تو افق کے خیالات سے تڑپے گی۔“ شیریں بیگم آہستہ کہہ کر اٹھی۔

محبت اپنی خصلت میں نہایت منفرد ہے، یہ بیک وقت صابر ہوتی ہے اور عاقل بھی۔

صابر، برہاکے جوگ کو تپسیا کی مانند قبول کر لیتی ہے اور عاقل اپنی طرف میں اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ ہجر سے عذاب کے گلے لگ جاتی ہے۔

☆☆☆

ماریا نا کا ابارغشت وسیع بھی تھا اور خوبصورت بھی، اس کی آرائش اور زیبائش ماریا نا کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا، افق کے پندرہ روزہ ویزے کی میعاد ختم ہونے کو تھی، آج جمعہ تھا اور اس کی فلائیٹ اتوار کو تھی۔

”جوڑتھ ایک زندہ دل انسان تھا، میری اور اس کی ملاقات ماچسٹر کے میٹروپولیٹن یونیورسٹی میں ہوئی تھی، وہ آرٹس میں دلچسپی رکھتا تھا، مگر گھر کے دباؤ کے باعث اس نے بزنس کا شعبہ اختیار کیا، شادی کے بعد اس کی زندگی میں خوبصورت

ہے، ایک ایکسٹنٹ میں، اب میں، اکیلے پن کا شکار ہوں، کیا تم آج میرے ساتھ ڈنر کرو گے؟“

افق نے اسے دیکھا اور مسکرایا۔

☆☆☆

”مجھے طلاق دو، مجھے سکون آجائے گا۔“ غم آنکھوں میں سارے جہانوں کے زہروں کا پانی جمع ہو گیا۔

سب نے باری باری ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی کے اعصاب پہ نگاہیں گھاس کے ٹوٹنے کا ضرب بڑا، جو راجہ بیگم کے گرزتے ہاتھوں سے پھسلا اور تنگیں فرش پہ گر پڑا۔

”دے سکتے ہو طلاق، ابھی اسی وقت؟“

”خوبے!“ ایک دھاڑ، جس میں واضح شکست کی بو تھی، نے حورے کے چہرے پہ چھائی غصے کی لالی میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی۔

”بندر کرو اپنی بکواس، جتنا رسوا ہونا تھا، میں افق کے ہاتھوں، اس میں مزید اضافہ نہ کرو۔“

اس نے استہزاء سے ایو کو دیکھا۔

”واہ، کیا ڈائلاگ مارا ہے ابو، یعنی رسوا ہوئے آپ، آپ کو اپنی مان سمان کا اتنا خیال ہے، یعنی رسوا ہوئے آپ، اپنی رسوائی کو میری بربادی سے مقابلہ کروا رہے ہیں، میرے اجڑے دل سے۔“ وہ بیک وقت چیخی اور رو دی تھی۔

”حورے خدا را یہاں آرام سے بیٹھو۔“

زلف اٹھی تھی۔

”وہ تم ہو گی زلف بزدل، میں بزدل نہیں ہوں۔“

”میں بزدل ہوں پر بے وقوف نہیں ہوں حورے!“ ایک بار پھر زلف کو حورے نے اس قدر بے بس طریقہ دکھا ہوں سے تاڑا کہ جیسے وہ زلف نہ ہوئی اس کے دل کے زخموں پہ چھڑکی نمک ہو گئی۔

موڑ آیا، یہاں تبلیغ پہ چند مسلم آئے تھے، ان کے ساتھ جوڑتھ ہر وقت پائے جانے لگا، میں نے ایک روز استفسار کیا۔“

”جوڑتھ تمہارے رویے میں بلاؤ آ رہا ہے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“ جوڑتھ کا چہرہ بظاہر سپاٹ تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پہ ایک خوف گزرا تھا۔

”کام کا بوجھ ہے میری، ورنہ ایسا کچھ نہیں ہے، یہ عقدہ بعد میں کھلا، کہ بوجھ کام کا نہ تھا، بوجھ دل کا تھا، وہ اسلام قبول کرنا چاہتا تھا مگر اسلام قبول نہ کر پاتا تھا، وہ دراصل اس سوسائٹی کے کٹر عیسائیوں سے ڈرتا تھا۔“ جب میں نے محسوس کیا تو میں نے اس کو کہا۔

”کیا تم مجھے چند کتابیں یا چند باتیں ستا سکتے ہو؟ تاکہ مجھے بھی فیصلے میں آسانی ہو، کہ میں تمہارا بوجھ بانٹ سکوں، ہو سکے تو مشورہ بھی۔“ اس نے مجھے صرف ایک کتاب دی، قرآن مجید کا ترجمہ جب میں نے پڑھا تو اس کے سحر نے مجھے باندھ دیا، میں نے اس کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیا اور نرمی سے دایا۔“

”جو حق ہے وہ بولتا ہے، حق کی رسی تمام لو یہ خدا تک جانے کا ذریعہ ہے۔“ ہم دونوں نے اسلام قبول کیا، ہم ہنسی خوشی رہنے لگے ایک خوشگوار موڑ تھا جسے ہم دونوں نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ خوشی کے ساتھ نبھایا بھی، یہ کوئی فلم تھوڑی تھی جس کا اختتام خوشگوار ہوا ہو یہ تو زندگی تھی، میں امید سے تھی۔“

”پال کو جوڑتھ کا پتا چل گیا تھا، اس نے اپنے تئیں جوڑتھ کو سمجھایا بھی، مگر وہ نامانا، حق کے ساتھ رہو گے تو یا شہید ہو گے اور یا سرخرو، اس کا ایکیڈنٹ نہیں ہوا تھا، اسے پال نے مارا تھا،

پال کے قتل کے بعد میرے اپارٹمنٹ میں مجھ پہ قاتلانہ حملہ کیا، میرا بچہ بھی ضائع ہو گیا اور میں آج تک جوڑتھ کا پتا نہ لگا سکی کہ وہ کہاں تھا، میں نے صرف اس کا مرا چہرہ دیکھا تھا، جب پال نے اسے اپارٹمنٹ میں میرے سامنے گرا کر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“ اس کے لہجے میں دکھ کا سانپ پھن پھنکا رہتا تھا۔

”مزید کچھ نہ کہو، مجھے اتنا بتاؤ تمہارا اسلامی نام کیا ہے؟“ افتخ نے گلاس پانی کا اسے دیا۔

”حلیہ سعدیہ!“ ماریانہ کا لہجہ پر تبسم سا ہو گیا۔

”حلیہ سعدیہ!“ افتخ نے اپنے پاؤں کے ناخنوں پہ نظریں جمائے کہا۔

”کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ ☆☆☆

حاصل زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں وادی سوات کی شادی ہنوز برقرار تھی۔

آج تاجدار سورج نکلا ہوا تھا مگر موسم میں خشکی ہنوز برقرار تھی، حورے نے آج سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے، وہ سیرھیوں پہ بیٹھی تھی سیاہ شیفون کا دوپٹہ آدھا کندھے پہ تھا اور آدھا سیرھیوں پہ، سیاہ میق بالوں میں کچر لگا ہوا تھا۔

شیریں بیگم شادی والے ہنگامے کے بعد کم ہی کمرے سے نکلتی تھی، حیدر کو ایک کمپنی میں اچھی خاصی جاب مل گئی تھی، وہ صبح جاتا اور رات کو ہی واپس ہوتی تھی۔

”جس محبت کو میں نے تعویذ سمجھ کر گلے میں ڈالے رکھا وہ تعویذ میرے لئے پھانسی بن گیا۔“ ایک آنسو سگلتے نیوٹن سے نکلا تھا۔

”میں ایک جل پری کیوں بن گئی، افتخ میرے لئے پانی کیوں ہو گیا؟“ آسمان رنگ

گو ایک احتساب کا کٹہرا بنا اور مجرم بنا افتخ کے گرد ایک عدالت جگ گیا، حورے مڑی اور شیخوں کا دوپٹا اس کے کندھوں پھسلے لگا تھا۔
”تم آگئے افتخ، تم کیوں گئے تھے، تم نے مجھ کو کیوں چھوڑا تھا بتاؤ۔“ بھیاںک جیتی۔

”میری شادی کو نور دھل کی شادی کیوں بنائی، ایک داغ دیکھو، دیکھو اس ماتھے پہ، میرے ماتھے، دیکھو، دیکھتے کیوں نہیں، یہاں داغ ہے ٹھکرائی محبت کا، کیوں کیا ایسا تم نے، کیوں اجاڑا مجھے؟“ اس کی چھینیں رونے کے باعث مدھم پڑھنے لگیں۔

”تم نے میرے خوابوں کو اجاڑا، میں جب رات کو سوتی ہوں مجھے اپنی زندگی کا بھیاںک خواب نظر آتا ہے مجھے، مجھے اپنی بربادی نظر آتی ہے ان چندہ دنوں میں ہر خواب تسلسل آتا رہا، بتاؤ کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں میرے خواب برباد کیے، کیوں میری زندگی برباد کی؟“ سیاہ شیخوں کا دوپٹا اس کے کندھے پہ سے گر گیا تھا۔
”کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے؟“ اس نے افتخ کا گریبان پکڑ لیا، اسے جھنجھوڑنے لگی۔

”بند کرو اپنی بکواس، نہیں کرتا تھا میں تم سے محبت۔“ اس سے کئی گنا دھماڑا اس کے لہجے میں گئی۔

”آؤ حلیمہ۔“ اس نے اس کا گریبان ایسا چھوڑا جیسے کرنٹ لگا ہو، اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”آؤ حلیمہ، میں محبت تم سے نہیں حلیمہ سے کرتا تھا اور ہوں، یہ حلیمہ سعدیہ، میری بیوی۔“ مین گیٹ میں کب سے ساکت کھڑی حلیمہ جبرا مسکرائی اور اندر آنے لگی۔

”دھوکے باز..... فریبی..... بے وفا۔“ وہ

بدلتے لگا، یکا یک تاجدار سورج کے سلطنت کو مشرق سے آتے بادلوں نے سمیٹا۔

اس کی نظریں بدلتے آسمان پہ تھیں، آنکھوں میں آنسو تھے، مین گیٹ کی گھنٹی بجے جا رہی تھی، آج اتوار تھا سولازمہ کی چھٹی گئی، اس نے دوپٹہ درست کیا اور دروازے کی اور بڑھی، آسمان کے بدلتے رنگ میں سیاہ رنگ کی راجدھانی قائم ہوئی اس نے دروازہ کھولا۔

کالے رنگ کی ساری سیاہی اس کے چہرے پہ چھا گئی، اس کی چلتی سانسوں کو اس نے اس قدر روک لیا کہ اسے اپنی سانسوں کے بند ہو جانے کا خدشہ ہوا۔

”السلام علیکم!“ محض ایک نگاہ غلط اس پہ ڈال کے اندر داخل ہونے کے لئے پرتوتا پندرہ دن کے کم عرصے کا ایک طویل جبر دینے والا اس کا محبوب افتخ تھا، وہ یکے تک اسے دیکھتی رہی۔
وہ آہستہ سے اندر داخل ہونے لگا، نمک کا بت بنی حورے میں جہش ہوئی اور اپنے گلے کی رگوں کو ایک قوی قوت سے رگوں میں دوڑتے خون کو روک کے اس نے چلا کر کہا۔
”افتخ!“

جس انسان کی زندگی میں اس کا محبوب اسے چھوڑ کے جا چکنے کے بعد آجائے تو ہجر کا رونا روتا محبت اس کے آجانے کے بعد ہجر کو روتا ہے، دل کو کواڑوں کو اہنی تالوں سے بند کرنے کے بعد بھی دل کے نہاں خانوں میں سونامی سا طوفان اٹھ آیا۔

”افتخ!“ ایک بار پھر سے جج نے اس کے دل میں طوفان برپا کیا، چلتے قدم مجبور ار کے اور شیریں بیگم اور معین صاحب ایک ساتھ لٹکے تھے اور بری منزل کی میڑھیاں حیدر نہایت غلٹ سے پھلانگتا آیا تھا۔

آنکھ سے نکلا اور بے ریا چہرے پہ پھسلتا گیا،
دروازہ کھول کے اندر گیا، حورے سوئی جاگی کی سی
کیفیت میں لپٹی تھی۔
”حیدر!“ اس کی سرسراتی آواز نکلی۔

”ہاں۔“ حیدر بیٹھ پہ جبکہ بتاتا کہہ اٹھا۔
”مجھے اپنے گھر سے چلو۔“ آنکھوں کے
کناروں سے آنسوؤں کا ریلہ بہہ گیا، حیدر
مسکرایا۔

☆☆☆

”زلف! جلدی نکلو۔“ صدیق آواز دیتا
ڈرائیونگ یوم میں گیا، جہاں زلف تک سبکی سی
تیار کھڑی تھی۔

”بس ایک منٹ۔“ اپ اسٹک گہری کرتی
زلف کی نظریں آئینے میں صدیق کے عکس پہ ٹکی
تھی، جو کہ نہایت دلجمعی اور دلچسپی سے زلف کو
دیکھ رہا تھا۔

”شریف لوگ حسیناؤں کو تاڑتے نہیں۔“
زلف نے اوپر والے ہونٹ کی سطح کو سمجھنے کے کہا۔
”تاڑتے نہیں تو کیا کرتے ہیں؟“ اب تو

صدیق نے سینے پہ ہاتھ بھی باندھ لئے تھے۔
”آنکھیں پٹی (نیچے) کر کے آنے کا
انتظار کرتے ہیں۔“ زلف مڑی اور دلکشی سے
مسکرائی۔

”واہ، انتظار کا بھی کہتے ہیں اور آنکھیں
نیچے کرنے کا بھی۔“ صدیق نے منہ لٹکائے کہا۔
خوشی کے تمام تر رنگ کو اپنی آنکھوں میں
سمیٹے زلف نے سارے جہان کی منصوبی خفگان
کی ریاست قائم کیے صدیق کو دیکھا۔

”تو کیا آنکھیں نیچے کر کے انتظار نہیں کیا
جاتا؟“ ادائے دلبرانی سے آنکھیں منکائیں۔

”جب انتظار کا سے ہو پیاری بیگم تو محبوب
کی راہ دیکھنے کے لئے نظریں کیوں نیچے کرنے

مڑا اور نیچے رکھا ایک چھوٹا سا کھلا اٹھا کے سامنے
کھڑکی کے شیشے پہ دے مارا اور پھر اشتعال سے
جو چیز ملتی، اٹھا اٹھا کے چھینکتی گئی اور یہی کہے
جاتی۔

”تم نے مجھے محبت کے نام پہ دھوکہ دیا، تم
دھوکے باز فریبی..... بے وفا۔“

”دھوکے باز..... فریبی..... بے وفا۔“
ایک وزنی گھلا اٹھاتی حورے کا ہاتھ ساکت ہوا
اور دھڑاک سے فرش پہ گر گئی۔

حورے کا نام پتلی کر لیتا وہ حیدر تھا جو
حورے تک کسی آدمی کی طرح آیا اور افق
ساکت رہ گیا تھا۔

کتاب زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا
یوں حرف صرف بڑھا جسے وہ شخص میرا انصاف تھا
سربراہ مجھے چھوڑ کر وہ کسی اور کے ہمراہ ہو لیا
وہ شخص جسے چاہا میں نے بے حساب تھا

☆☆☆

آئی سی یو سے باہر آئی، ڈاکٹر کے چہرے پہ
مسکراہٹ رہ چکی تھی۔

”الحمد للہ! وہ اب ٹھیک ہے، آپ خیال
رکھیے گا کہ آئندہ اسے دینی دباؤ نہ ملے اور
ہاں..... یہ افق کون ہے؟“ ڈاکٹر نے یک لخت
پوچھا۔

حیدر نے خاموش نظروں سے سامنے
دیکھا، جہاں خاموش افق بیٹھا تھا، نظروں کے
اشارے سے ڈاکٹر سمجھ گئی۔

”معاف کیجئے گا آئندہ آپ ان کے
سامنے آنے سے گریز کیجئے گا۔“ بناوٹی مسکراہٹ
کے ساتھ افق وہاں سے اٹھا۔

”اب مریدانہ ہوش سے باہر ہے آپ ان
سے مل سکتے ہیں۔“ حیدر نے اسے دیکھا جو کسی
ہارے ہوئے جنگجو کو طرح جا رہا تھا، ایک آنسو

لگے بھلا محبت؟“ سوالیہ نظریں زلف کے سراپے میں پیوست کر کے اس نے کہا۔

”اوئے صدیق، اب نکل بھی، تمہاری پچھو ساگ بنائے کب سے تمہارا تشریف آرواری کا انتظار کر رہی ہوگی اور ایک تم ہو جو اندر چھوڑی بنا بتا کے نہیں تھک رہے ہو۔“ طرافت کی پوئی کا دہانہ کھلا، رابعہ بیگم دروازے میں کھڑی مسکرائی، بعض اوقات تقدیر کے فیصلے نئی زندگیاں سنوار دیتی ہیں۔

انہیں اسی چلبلی اور خوش و چخلی لڑکی زلف سے قطعاً اتنی داناتی اور فہم کی امید نہ تھی، صدیق کو نہ صرف اس پیار کرنے والا شوہر بنایا بلکہ ان چند ہی دنوں میں سارے گھر کا نظام ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”ایک تو یہ ماں بھی، غلط وقت انٹری مارتی ہے۔“ وہ ٹھیک ٹھاک خفا ہونے والے انداز میں مڑا۔

اب محبوب کی راہ دیکھنے کے لئے نظریں گھمانے کی ضرورت نہ رہی، جس محبت کا وہ رونا روتا رہا، وہ اس پہ زلف کے انداز میں نازل ہوئی۔

اس نے فراخی سے قبول کیا، ایک محبوب، زلف کو اور ایک محبت، صدیق کو۔

☆☆☆

دروازہ کھلا اور نقاہت سے ذرا کھاستی حور نے اپنے گھر میں قدم رکھے۔

”نمیری تو خواہش تھی کہ جب تم اس گھر میں داخل ہو تو پھولوں کی راہگور پہ چلو، دیکھو میں صرف اتنا کر پایا ہوں۔“ پھولوں کی پتیوں کے روش پہ چلتی حور نے ہنسکی مسکرائی۔

سہ پہر کی آگسٹی بھری، گرماش سے عاری دھوپ کی آخری سایے مدھم ہونے لگی، سہ پہر

شام کے گلے لگنے لگی تھی۔

”اس کی ضرورت نہ تھی حیدر۔“

”اس کی ضرورت کیوں نہ تھی حورے!“

”جو شخص تمہیں نہ چاہے، وہ اس قابل ہے؟“

”جس شخص کو میں چاہوں وہ اس قابل کیوں نہ ہو؟“

”تمہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا حیدر!“

”خوشی کے پہلے زینے پہ مایوسی دم توڑ دیتی ہے۔“

”سمجھو مجھے کی زندگی گزارتے ہوئے ایسے سوچنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“

”حورے! ہم زندگی میں سمجھوتے ہی کرتے رہتے ہیں، اگر ہماری زندگی سے سمجھوتے کا باب نکال دیا جائے تو زندگی ایک چلتی سانسیں ہی رہ پاتی ہے۔“ وہ جلتے جلتے فوارہ کے پاس رکی، فوارے کے ساتھ چلتی راہ اندر داخل دروازے کی طرف جاتی تھی۔

”رکو حورے یہاں..... ایک بات پوچھو؟“

حورے رک گئی۔

”ہاں پوچھو۔“

”محبت کرو گی؟“ اس کی جھکی آنکھوں پہ

نظریں مرکوز کیے وہ بولا۔

”نہیں محبت نہیں کرو گی۔“ اس کی جھکی

آنکھیں حیدر کی آنکھوں سے چار ہو گئی۔

”بس وفا کے ساتھ اس رشتے کو نبھاؤ گی۔“

”جس رشتے میں وفا آ جائے، محبت خود ہی

اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔“ حیدر مکمل کے مسکرایا کہ

اب۔

”اب بھر کا استعارہ لاؤ۔“

☆☆☆

فہرست و انس کتب
دُشمنِ بلال



تیسری قسط

”ریکھا! میں..... میں تمہیں بتا نہیں سکتا
آج میں کتنا خوش ہوں؟“ ذوریز آفندی اپنے
آفس میں بیٹھے موبائل کان سے لگائے ریکھا کو
بتا رہے تھے، خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ
رہی تھی۔

”گزشہ اشارہ سالوں میں پہلی بار میں
تمہیں اتنا خوش دیکھ رہی ہوں، کیا میں جان سکتی
ہوں کہ وہ کون سی خوشی ہے جس نے تمہیں یوں
خوشی دی ہے؟“

”ریکھا..... ریکھا مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں..... میں ایک خوبصورت خواب کے زیر
اثر ہوں اور اپنی ہی خوشی کو اپنی نگاہوں سے دیکھ
رہا ہوں۔“

”کاش ذوریز میں تمہارے سامنے ہوتی
اور تمہارا یہ خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ سکتی۔“ ان کی
بے اختیاری کو محسوس کرتے ہوئے ریکھا نے اپنی

خواہش کا اظہار کیا تو ریوالونگ چیئر سے نکلتے
ہوئے وہ مسکرائے۔

”ریکھا آج میں واقعی بہت خوش ہوں،
مجھے اپنی واپسی کے نشان مل گئے ہیں..... آج
..... آج میری بات انوش سے ہوئی ہے، اپنی بیٹی
سے وہ انیس برس کی ہو گئی ہے ریکھا، بالکل مامی
جیسی ہے، معصوم اور سادہ سی اسے دیکھ کر بے
اختیار میرا جینے کو دل چاہا ہے اور میرے دل میں
یہ خواہش جاگ اُٹھی کہ مجھے اللہ سے تھوڑی اور زندگی
مانگنی چاہیے۔“ وہ دیوانہ وار اپنی خوشی کا اظہار کر
رہے تھے۔

”تمہارا رابطہ کیسے ہوا انوش سے؟“ وہ
انجان بنی۔

”میں خود حیران ہوں، اس نے نا جانے
کیسے میزا کو ٹیکٹ نمبر لے لیا؟ وہ مجھے بتا رہی تھی
کافی عرصے سے وہ مجھے ڈھونڈ رہی تھی، ریکھا وہ

مکمل ناول



مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔“ ان کی خوشی دیدنی تھی۔

”تو کیا سوچا تم نے؟“

”مجھے جلد از جلد پاکستان جانا ہوگا، میں

اب یہاں رہ کر اپنی زندگی کے باقی دن ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

”ماہین کا سامنا کیسے کرو گے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا وہ تمہیں Except کرے گی؟“ ریکھا

نے یاد دلایا۔

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے ریکھا کہ ماہی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں، میری بیٹی میرے لئے تڑپ رہی ہے، اس وقت مجھے صرف انوش کی فکر ہے۔“

”تم مرد لوگ کتنے Selfish ہوتے ہو ناں، چند محلوں میں عورت کی ساری ریافتوں، وفاؤں اور قربانیوں کو پیروں تلے روند دیتے ہو۔“

”تم نہیں جانتی ریکھا یہ اولاد بہت عجیب چیز ہوتی ہے اس کی محبت میں انسان خود غرض ہو جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم بھی اب خود غرضی پہ اتر آئے ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”ہا ہا ہا۔“ وہ ہنسی۔

”یو ہنسی سمجھ لو۔“

”ابنی دے یہ بتاؤ، میت کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے اور بہت خوش بھی۔“

”اور تم؟“ انہوں نے کریدا۔

”کیا کرو گے جان کر؟“ اس نے سرد آہ

بھری۔

”میں ضروری سمجھتا ہوں۔“

”ضروری۔“ وہ لفظ ضروری دہراتے

ہوئے ہنسی اس کی ہنسی میں کوکھلا پن تھا۔

”میری خاموش محبت کے مجید جان کر

اداس ہو جاؤ گے اور میں ایسا نہیں چاہتی۔“

”لیکن میں چاہتا ہوں تم اپنی نوکیلی خاموشی میں میت کی محبت کے پھول اگا کر اسے بہار میں بدل دو۔“

”تمہارے کہنے پہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہے، کیا اتنا کافی نہیں ہے تمہارے لئے؟“

”نہیں ریکھا، میں چاہتا ہوں تم اپنے دل کی دیواروں پہ کھدے میرے تمام نقش منا کر انہیں میت اگر وال کی محبتوں سے بھر دو۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”وجود میں اتری ہوئی محبتوں کو خود سے جدا کرنا اتنا آسان ہوتا تو اٹھارہ سال ذوریز آفتندی..... ماہین کی جدائی میں تڑپ کر نہ گزارتا؟“

”تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔“ انہوں نے ہار مانی۔

”لیکن میں ہار گئی تمہارے سامنے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں اب فون رکھتا ہوں۔“

”کتنی آسانی سے میری بات بدل دیتے ہو؟ سنگدل انسان۔“ وہ ہنسی۔

”تم جو.....“ وہ روانی سے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”رک کیوں گئے بولو ناں؟“

”روشنی کی جستجو میں پگھلیں جلا بیٹھنا سراسر بے وقوفی ہے، میت کو وہ مقام دو جو ان کا حق ہے۔“

”اپنے وجود سے کسی کو اپنی روح تک کی رسائی دینے میں وقت لگتا ہے ذوریز، یہ لمحوں کی بات نہیں ہوتی، پرانی محبتوں کو بھلانے اور نئی محبتوں کو اپنانے کے دوران زمانے کی سب دلیلیں اور تاویلیں بے بس ہو جاتی ہیں، ایک

انوش میرے ساتھ جا رہی ہے، آپ گھر کا خیال رکھیے گا۔“ ماہین نے انہیں بتایا۔

”تم نے فکر ہو جاؤ بیٹا۔“ اس کے بعد ماہین اور انوش باہر نکل گئی تھیں، جونہی ماہین نے گاڑی مین روڈ پہ ڈالی، ایک نوجوان ہیلٹ پینے اسپورٹ ہیوی بائیک پہ ان کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگا، ماہین نے تو خاصی توجہ نہ دی لیکن انوش کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا، وہ اس لوفر کو کیسے نہیں پہچان سکتی تھی؟ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ون ویلنگ شروع کی، انوش کو اس پہ رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

”اسٹوپ۔“ وہ زریب بڑبڑائی۔

”انوش! یہ لڑکا ہمیں فالو تو نہیں کر رہا؟“
ماہین کی گاڑی اب ایک برتج پہ تھی، وہ لڑکا مسلسل ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

”آئی ڈونٹ نوام، میں فون پہ بڑی تھی۔“
انوش انجان بنی، اور وہ پھر وہ حسیں مال میں گئے شاہ وزیر بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی رہا، ایک آؤٹ لٹ میں ماہین اپنے لئے کپڑے دیکھ رہی تھیں، جب انوش کے موبائل کی بپ سنائی دی۔

”ہیلو۔“ اس نے فون کان سے لگایا۔

”تم اتنی خوبصورت کیوں ہو؟“ گنیر لہجے میں کہا گیا۔

”شٹ اپ۔“ وہ غرائی۔

”تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟“ ایک سائیڈ پہ جا کر اس نے غصے سے کہا۔

”آپ تو ساری عمر مجھ سے پیچھا نہیں چھوٹے گا تمہارا۔“ اس نے محبت سے کہا۔

”تم کس مٹی سے بنے ہوئے ہو؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”پیاری مٹی سے۔“

”میرا دل چاہتا ہے تمہارا گلابا دادوں۔“

آرزو سے دوسری آرزو تک کا سفر کیسے چھلنی کرتا ہے؟ تم نہیں سمجھو گے، تمہارے خوابوں سے نکل کر میت کے لئے نئے خواب سجانے میں وقت لگے گا مجھے۔“ رکھا کی باتوں نے جواباً ان کی تمام گزارشوں کو چپ لگا دی تھی۔

☆☆☆

”انوش تم ابھی تیار نہیں ہوئی؟“ ماہین نے نیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے لاؤنج کے صوفے پہ لیٹی بی وی دیکھتی انوش سے کہا۔
”تیار ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے مام، کیا یہ حلیہ نہیں چلے گا؟“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”لڑکیوں کو بننے سنور نے کا اتنا شوق ہوتا ہے اور ایک تم ہو؟ ذرہ دلچسپی نہیں ہے تمہیں۔“
”مام اب نہیں ہے تو کیا کروں؟“

”ہماری انوش تو لاکھوں میں ایک ہے، اے مصنوعی سہاروں کی ضرورت ہی نہیں۔“ آیا بی لاؤنج میں مسکراتے داخل ہوئیں۔
”سن لیجے آبابی کی بات۔“

”اللہ میری شہزادی کی قسمت بالکل اس کی طرح پیاری بنائے۔“ ماہین نے انوش کو محبت بھری نظروں سے دیکھا، آیا بھی نے آئین کہا۔
”اچھا یہ بتاؤ رات کھانے میں کیا بناؤں؟“ آبابی نے پوچھا۔

”آبابی..... کچھ بھی بنا لیں لیکن پلیرز..... ٹینڈے اور کرلیے مت بنائیے گا۔“

”اچھا بابا نہیں بتاتی۔“ آبابی مسکرائیں۔
”آبابی، آپ بخنی پلاؤ اور کباب بنا لیں اور اسلم (دھوبی) کو فون کر کے میرے کپڑے منگوالیجے گا۔“ ماہین نے انہیں تاکید کی۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔“

”اوکے مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی آبابی

”مام آپ خود دیکھ لیں ناں، میں ذرا ابھی آئی وہ سامنے شاپ پہ ایک اسکول فیلو نظر آئی ہے میں ذرا اس سے مل کر ابھی آئی۔“

”انوش تم بھی ناں۔“ مایین نے اسے گھورا، لیکن وہ شاپ سے باہر نکل گئی تھی اور مایین پھر سے شاپنگ میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔“ وہ غصے میں اس کے قریب آئی۔

”کبھی تو نارمل بات کر لیا کرو، ہر وقت جلاو بنی رہتی ہو۔“ شاہ دیز نے معصومیت سے شکوہ کیا۔

”نہ کیوں بات کروں میں تم سے؟ تم میرے لگتے کیا ہو؟“

”تم آج ہاں کرو، میں کل بارات لے آؤں، پھر تو سب کچھ ہو جاؤں گا ناں تمہارا؟“

”گھٹیا گفتگو میں تو پی ایچ ڈی کر رکھی ہے تم نے۔“

”تم کچھ بھی کہو، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

”تم جیسے آوارہ لڑکے دن میں نا جانے کتنی ایسی محبتوں کا اظہار کرتے ہوں گے؟“

”میں نے کبھی کسی سے محبتوں کے اظہار نہیں کیے۔“

”مجھے تمہاری کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔“

”تو کیسے آئے گا یقین؟ تمہارے سامنے جان دے دوں اپنی؟“

”مجھے تمہاری جان وان نہیں چاہیے، میں تمہیں آخری بار وارننگ دے رہی ہوں میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ بہت برا ہوگا۔“

”جان تو میں کسی صورت نہیں چھوڑنے والا تمہاری۔“ وہ مسکرایا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ

”اور میرا دل پتہ ہے کیا چاہتا ہے؟“ ہنوز محبت سے۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا دل۔“ وہ پھٹ پڑی۔

”تمہارا حکم سر آنکھوں پہ..... فی الحال.....“

دائیں طرف دیکھو۔“ اس کی بات پہ بے اختیار انوش نے دائیں جانب دیکھا جہاں وہ ایک شاپ کے باہر ایک پلر سے ٹیک لگا نہایت فرصت سے اسے تاڑ رہا تھا۔

”تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے دانت پیسے۔

”تمہارا دیدار۔“ مخمور لہجے میں بتایا گیا، انوش نے غصے میں سوبائل آف کیا۔

”انوش بھی کہاں ہو؟ آج تو مجھے لگتا ہے میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔“

عقب سے مایین ہاتھوں میں دو چار ہنگ کیے کپڑے لے کر اس کے پاس آئی۔

”جی مام وہ..... طاقتور کی کال آگئی تھی۔“

”یہ میں نے تمہارے لئے پسند کیا ہے کیا ہے؟“ مایین نے وہ ہنگ کیا سوٹ انوش کے ساتھ لگایا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی

شاہدیز نے اسے ویرگڈ کا اشارہ دیا۔

”بناؤ تا بیٹا؟“

”جی..... جی مام..... اچھا ہے۔“

”اور یہ میرے لئے کیا بار ہے گا؟“ انہوں نے بیچ کلر کا ایک ٹیس ساسوٹ اسے دیکھایا۔

”بہت اچھا ہے مام اور ویسے بھی آپ پہ تو ہر کلر ہی سوٹ کرتا ہے۔“ وہ غائب دماغی سے بولی۔

”جواب کی وجہ سے مجھے کپڑے بھی زیادہ بنانے پڑتے ہیں، تم ذرا میرے ساتھ آؤ، ایک

وائیٹ ڈریس مجھے تمہارے لئے اچھا لگا ہے۔“

غصے میں تن فن کرتی واپس مابین کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

شدید خوف کے زیر اثر ہمت کر کے وہ عجلت میں بیڈ سے نیچے اتری تھی اور ننگے پاؤں وہ باہر کی طرف بھاگتی تھی، لوگ گھبرا کر ہوں کی بلڈنگ سے باہر نکل رہے تھے، شدید قسم کا زلزلہ آیا تھا جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا، کئی عمارتیں متاثر ہوئی تھیں، کئی گھروں کی چھتیں گر گئی تھیں، ناردن ایریا میں بھی بہت نقصان ہوا تھا، ہر طرف نیوز چینلوں پر زلزلے سے ہونے والی تباہی اور ہلاکتوں کی خبریں سنائی جا رہی تھیں، پریشے شدید خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئی تھی وہ جو چند گھنٹے سوچوں کے گرداب سے نکل کر سوچایا کرتی تھی اب اس کی وہ نیند بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی تنہائی ایک خوف بن کر اسے ڈرانے لگی تھی۔

وہ ساری ساری رات ٹی وی آن کیے رکھتی اس کی ذہنی حالت ابتر ہو رہی تھی، زندگی ایک کے بعد ایک امتحان لے رہی تھی اس کا۔

اسے ایک مہینہ ہو گیا تھا نیا نیا شمار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے، اس کے پاس جو رقم موجود تھی وہ ہوٹل کا بل کلیئر کرنے کے بعد خاصی کم ہو گئی تھی، اب بھی وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں بیٹھے فون کان سے لگائے سمیر سے مخاطب تھی۔

”سمیر تم سوچ بھی نہیں سکتے ایک کمرے میں رہ کر میں ذہنی مریض بنتی جا رہی ہوں۔“

”پری تم سے دور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تمہاری تکلیفوں اور دکھوں کا اندازہ نہیں ہے یا مجھے احساس نہیں ہے، میں تمہارے دل کے سارے موسموں سے واقف ہوں میری جان۔“

وہ لگاؤ سے بولا۔

”پھر بھی..... تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا؟“

شکوہ لبوں سے آزاد ہوا۔

”تم تنہا کب ہو پری؟ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ مجھے کیا تم مجھے اپنے آس پاس محسوس نہیں کرتیں؟“ وہ اسے پھر سے اپنی محبت کے الوٹن میں دھکیلنے لگا۔

”سمیر یہ میری زندگی کے مشکل ترین دن ہیں۔“ وہ رو دینے لگی۔

”ہر مشکل کے بعد آسانی ہے صرف اس بات پر یقین رکھو۔“

”نا جانے یہ مشکل وقت کب ختم ہوگا؟“

”انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔“ اس نے تسلی دی۔

”ایک ایک دن صرف اس امید پر گزار رہی ہوں، کہ ایک دن ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”میرے واپس آتے ہی زندگی کی تمام تلخیاں خوشیوں میں بدل جائیں گی۔“ سمیر نے محبت سے کہا، تو وہ چپ کر گئی۔

”پری چپ کیوں ہو گئی ہو؟“

”بس ایسے ہی۔“ اس کا ذہن بری طرح سے الجھا ہوا تھا۔

”ارے ہاں مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔“ سمیر کو یکدم یاد آیا۔

”کون سی بات؟“

”وہ ماما کو شک ہو گیا ہے کہ میرا تم سے رابطہ ہے میں اب تمہیں روز فون نہیں کر سکوں گا، تم پریشان مت ہونا۔“

”کیا مطلب؟ سمیر میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔“

”صرف چند دن کی ہی تو بات ہے ہنی۔“

اس نے پری کہ بہلانا چاہا۔

”آخر کب ختم ہوں گے یہ چند دن؟“

”وہ سیر..... مجھے بھی تم سے کچھ کہنا تھا۔“
وہ ہنسی۔

”کیا؟ بولناں؟“

”سیر وہ..... میرے پاس بہت کم روپے رہ گئے ہیں، روم چارجر ادا کرنے کے بعد، تم کچھ رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتے تو۔“ وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔

”پری مجھے سمجھ نہیں آتا تم ایک فائینو اسٹار ہوٹل میں کیوں رکی ہوئی ہو، تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ آج کل میرا بزنس Loss میں جا رہا ہے ماما کی سرجری اور علاج پہ لاکھوں خرچ ہو رہا ہے، تم تو جانتی ہو یورپ میں علاج کتنا مہنگا ہے، میں نے تمہیں کہا بھی تھا می می یا ماہ رخ کے گھر قیام کر لو، یا کم از کم کسی سستے ہوٹل میں شفٹ ہو جاتی، مگر..... تم ہو کہ تمہارے Luxury Life style..... پری وقت کے ساتھ انسان کو بہت ساری چیزوں کے لئے کپڑا مارنا کرنا پڑتا ہے۔“ سیر کو شکوے نے اس کی آنکھوں کے کونوں کو پھر سے غم کیا اور اس نے اعتراف کیا۔

”والدین چاہے جیسے بھی ہوں، اپنی اولاد کے شوق، ان کی خواہشات اور ضرورتیں، خوشی خوشی صرف والدین ہی پورے کرتے ہیں ناں خیرے بھی صرف وہی اٹھاتے ہیں۔“

”سیر میں تمہیں فورس ہرگز نہیں کر رہی، صرف بتا رہی تھی۔“ وہ بمشکل ہی بول پاتی تھی۔

”اپنی وے میں اب فون رکھتی ہوں۔“
آنسو دھیرے دھیرے اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

اسے صرف دینے اور خرچ کرنے کی عادت تھی، مانگنا اسے نہیں آتا تھا، آج اس کی عزت نفس بری طرح سے مجروح ہوئی تھی، اس نے سوچ لیا تھا، وہ اپنی کلانی میں موجود گولڈ کا

”مجھے سمجھ نہیں آتا آئی کو مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ وہ ختم ہونے پہی نہیں آتی؟ وہ مجھے دوبارہ بہو کے روپ میں کیسے قبول کریں گی؟ کیا میری زندگی ان کی نفرت سہتے ہوئے گزر جائے گی۔“
سیر کی بات پہ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور آنسو خود بخود آنکھوں سے بہنے لگے۔

”پری ہر بات کو فوراً اپنے ذہن پہ سوار مت کر لیا کرو، تم ایک بہت جذباتی لڑکی ہو پوری بات سنو اور سمجھو بغیر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہو، ماما ابھی بیمار ہیں، ان کا ٹریمنٹ چل رہا ہے پیاری میں انسان ویسے بھی ضرورت سے زیادہ احساس ہو جاتا ہے ان کی طبیعت جو نمی سمجھے گی میں انہیں سب کچھ بتا دوں گا، آئی سوئیرنی، پلیز اپنے دل سے تمام خدشے نکال دو۔“ سیر اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے میری زندگی کہیں کھو گئی ہے۔“

”پری کہیں نہیں کھوئی ہے تمہاری زندگی، اپنی بے یقینی کو تو ذکر آنے والے دنوں کے حسین سننے دیکھا کرو، سیر صرف تمہارا ہے، میں یہاں ایک ایک پل اذیت میں گزار رہا ہوں، پری تمہارے بغیر مجھے زندگی بے معنی لگتی ہے۔“ اس کی محبت کا اظہار پری کو ہمیشہ توانائی بخش دیتا تھا۔

”جانتی ہوں میں سیر، تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔“ اس کی روئی آنکھوں میں چمک اتر آئی تھی۔

”تمہیں اس محبت کا واسطہ، اب پریشان نہیں ہونا۔“ سیر نے ہنوز محبت میں گندھے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔

”اوکے نہیں ہوتی۔“

”ویری گڈ، یہ ہوئی نا بات۔“

بریلٹ بیچ دے گی۔

☆☆☆

”میں اس لڑکے کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہوں شمل۔“ انوش نے جوس کے گلاس میں سڑا گھماتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

”یار وہ لڑکا تم سے محبت کا دعوے دار ہے، بقول تمہارے اس نے تمہیں پر پوز بھی کیا ہے، تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ دیکھنے میں بھی اچھا خاصا ڈھنگ ہے، ویل آف ہے، لڑکیاں تو مرتی ہیں ایسے لڑکوں پر۔“ شمل اس کے مقابل بیٹھی تھی وہ اس وقت کالج کینٹین میں موجود تھیں۔

”تم اچھی طرح سے جانتی ہو، مام کو یہ عشق محبت وغیرہ سے کتنی نفرت ہے، وہ کبھی نہیں مانیں گی، الٹا خفا ہو جائیں گی مجھ سے، انہوں نے بہت پہلے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میری شادی اپنی مرضی سے کریں گی۔“ انوش بہت پریشانی سے اسے بتا رہی تھی۔

”انوش ضروری نہیں ہے جو آنٹی کے ساتھ ٹریڈی ہوئی وہ سب کے ساتھ ہو، محبت ہونا اور پھر جائزہ طریقے سے اپنی محبت کو نکاح کے بندھن میں باندھنا برائی نہیں ہے۔“

”ٹریڈی نہیں صرف غلط فہمی کہو شمل، صرف ایک غلط فہمی کی بنیاد یہ انہوں نے اٹھارہ سال ڈیڈ سے جدائی میں گزار دیئے۔“ انوش کی آواز میں کرب تھا۔

”تم پریشان نہیں ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ شمل نے اسے تسلی دی۔

”نہیں شمل کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا، وہ انتہی گلی سے میرے شہر پہنچ گیا اس نے میرا کالج اور گھر تک دیکھ لیا، میں جہاں جاتی ہوں وہ میرا چچا کرتا ہے، میرے گھر کے باہر گھنٹوں کھڑا ہوتا ہے، بائیک کا ہارن دیتا ہے، تاکہ میں گھر کی میں

آؤں اور کل تو وہ میرا چچا کرتے کرتے شاپنگ مال میں آ گیا، وہ تو شکر ہے مام کی نظر نہیں پڑی اس پر، وہ مجھے بہت تنگ کر رہا ہے، میں نے اسے ہر طرح سے ڈانٹ پھنکار کر دیکھ لیا ہے، وہ بہت ڈھینٹ ثابت ہوا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کیسے اس سے جان چھڑاؤں؟“ انوش فکر مند ہی شمل کو بتا رہی تھی، شمل اس کی بیٹ فرینڈ تھی۔

”یار ایک شخص سیدھے سادھے طریقے سے تمہیں اپنانا چاہتا ہے اس میں برائی ہی کیا ہے؟ وہ تمہیں گرل فرینڈ تو نہیں بنانا چاہتا ناں؟ وہ یقیناً تم سے محبت کرتا ہے، اسی لئے تو شادی کی بات کر رہا ہے میری مانو، تو آنٹی کو سب کچھ بتا دو۔“ شمل نے مشورہ دیا۔

”نہیں شمل تم نہیں جانتی، مام کاری ایکشن کس قدر خوفناک ہوگا۔“ وہ پرسوج انداز میں بولی۔

”تم اسے پیار سے سمجھاؤ کہ وہ تمہارا چچا چھوڑ دے، شاید وہ مان جائے۔“ شمل نے قیاس ظاہر کیا، تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہارے ڈیڈ کب آ رہے ہیں؟“

”انشاء اللہ اسی ہفتے۔“

”تم نے آنٹی کو بتایا؟“

”نہیں۔“

”وہ تمہیں شوٹ کر دیں گی۔“

”پرواہ نہیں ہے اپنی، مجھے صرف ڈیڈ کی فکر ہے، ان کے پاس وقت کم ہے اور میں انہیں ڈھیروں خوشیاں دینا چاہتی ہوں۔“ اداسی اور دکھ انوش کے لہجے میں چل گیا تھا۔

”آنٹی کو کیسے فیس کرو گی؟“

”کر لوں گی، ڈیڈ کے لئے سب کر لوں گی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

”مجھے تو آنٹی کا کاری ایکشن سوچ سوچ کر ہی پریشان کر رہا ہے۔“ شمل نے اظہار کیا۔
”میں جانتی ہوں بہت برا ہوگا، لیکن میں ان دونوں کو قریب لا کر ہی رہوں گی۔“ اس نے یقین سے کہا۔

”انشاء اللہ۔“ شمل نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔

☆☆☆

”ماں! میں نے آپ کو کہا بھی تھا، یہ خالصتاً عورتوں کا کام ہے مجھے اس گولڈ ولڈ کے چکر میں مت گھسیٹیں، مگر میری آپ نے ایک نہیں سنی۔“ انزک آفاق نہایت کوفت سے صابرہ بیگم اور ستارہ پھپھو کے ساتھ گولڈ مارکیٹ میں داخل ہوا۔

”تو بھال ہے جو یہ لاکا ہاتھ آجائے؟ آج کل ملک کے حالات دیکھے ہیں ناں کیا ہو رہے ہیں؟ لاکھوں کا زیور خریدنا ہے اگر واپسی پہ خدا نخواستہ کوئی چور ڈاکو ہمارے پیچھے بڑ گیا تو؟“ صابرہ بیگم نے عصبیلی نظروں سے اسے گھورا تو وہ جزبز سا ہو گیا۔

”بھابھی جب ہم انزک کی شادی کی شاپنگ کریں گے ناں تب دیکھیں گے کیسے بھاگا بھاگا ہمارے ساتھ آیا کرے گا یہ۔“ ستارہ نے مسکراتے ہوئے اسے کہنی ماری۔
”بس پھپھو آپ کا تو کام ہی جلتی پہ تیل ڈالنا ہے۔“

”ارے میں کہاں ڈالتی ہوں جلتی پہ تیل؟ اب نہ مائیں تو وہ اور بات ہے۔“

”اچھا اب بکنہیں۔“ ستارہ مسکرائی، انزک کے ساتھ اس کا خوب دوستانہ تھا۔

”یا اللہ خیر، آج میری خوب درگت بننے والی ہے۔“ انزک نے بے چارگی سے کہا، تو

صابرہ اور ستارہ دونوں ہی مسکرا دیں۔

”بھابھی وہ ہار دیکھیں کتنا پیارا ہے۔“ ستارہ نے ایک دوکان کے قریب سے گزرتے ہوئے بڑے سے ہار کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے نہیں ستارہ، یہ تو دیکھنے میں ہی دس تو لے کا لگ رہا ہے، دو ڈھائی تو لے کا سیٹ دیکھتے ہیں، آخر چوڑیاں بھی بنوائی ہیں پھر کوئل کی ساس کے لئے بھی تو جھمکے بنوانے ہیں۔“ صابرہ نے اسے یاد دلایا۔

”تو پھر ٹھیک ہے بھابھی، فاران جیولر چلتے ہیں اپنی نمو (پڑوسن) کے شوہر کی دوکان ہے۔“ انزک خاموشی سے صابرہ اور ستارہ کے ساتھ چل رہا تھا، اچانک سامنے سے آتی پری کو دیکھ کر انزک ٹھنک گیا تھا۔

”می می یا ماہ رخ میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔“ وہ انزک کو متشکری دیکھائی دے رہی تھی۔

”ماں..... پھپھو آپ دونوں رزیور پسند کریں میں ابھی آیا۔“

”لو اب تم کہاں چل دیئے؟“ صابرہ بیگم نے پوچھا۔

”ماں بس آیا۔“

”ٹھیک ہے ہم فاران جیولرز جا رہے ہیں تم ہمیں وہیں جوائن کر لینا۔“ ستارہ نے بتایا۔

”اوکے۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔

”رکے مس پری۔“ اس کے قریب پہنچ کر انزک نے اسے پکارا۔

”تم یہاں؟“ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی، ادا سی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

”میں انجی بہن کی شادی کے لئے گولڈ لینے آیا تھا آپ کو دیکھ کر رک گیا۔“

”میں بھی ایک کام کے سلسلے میں آئی تھی۔“

وہ نظریں چراتے بولی۔

اثبات میں سر ہلایا تھا۔
”تم مجھے بہت یاد آؤ گے ذوریز۔“ وہ
بولنے بولتے رو پڑی۔
”اور میں تمہاری خوشیوں کے لئے بہت
دعا کروں گا۔“

”تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہو گا ذوریز،
تم..... تم وعدہ کرو مجھ سے تم برابر میڈیسن لو گے
اور اپنا چیک اپ کرو اتے رہو گے۔“

وہ دیوانگی میں ان سے وعدہ لے رہی تھی،
وہ ذوریز کے معاملے میں ایسی ہی تھی دیوانی، وہ
خاموشی سے سر ہلا گئے۔

”چلتا ہوں فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔“
توقف کے بعد انہوں نے ریٹ داچ دیکھی۔

”تمہاری سلامتی اور خوشیوں کی میں نے
ہمیشہ بھگوان سے دعائیں مانگی ہیں، وہ اب پوری
ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“ وہ روتے روتے
مسکرائی، تو ذوریز نے آگے بڑھ کر اس کے سر پہ
تھکی دی۔

”تمہیں میت کے ساتھ مجھے ملنے پاکستان
آنا ہو گا۔“ انہوں نے فرمائش کی۔

”ہاں آؤں گی اور مائی کو بتاؤں گی، میں
نے آج تک کسی مرد کو اتنا با وفا نہیں دیکھا، جتنا
ذوریز آفندی کو میں نے اس کے لئے دیکھا، میں
اسے بتاؤں گی، تمہاری یاد میں پل پل مرتے
ہونے میں نے ذوریز کو دیکھا ہے تمہارے ہجر
میں سلگتے ہوئے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے، موت
سے پہلے اسے بار بار مرتے ہوئے دیکھا ہے،
ذوریز آفندی کے دکھوں کو بولتے ہوئے دیکھا
ہے، اس کی تلاش میں قدم قدم پہ اسے خود سے
جدا ہوتے دیکھا ہے، میں اسے بتاؤں گی ذوریز
سب بتاؤں گی۔“

ریکھا ان کی جدائی میں جل رہی تھی اور بے

”آپ مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں؟
سب ٹھیک تو ہے؟“ وہ تاجا نے کس جذبے کے
تحت پوچھ بیٹھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، تمہیں پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں ہے۔“

”اپنی دے میں اب چلتی ہوں، مجھے دیر ہو
رہی ہے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی اور انزک
آفاق وہیں کھڑا سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

وہ گولڈ مارکیٹ سے اپنا بریلیٹ بیچ کر مین
روڈ پہ آ گئی تھی اور کسی ٹیکسی کے انتظار میں سڑک
کنارے کھڑی تھی، جب دو موٹر سائیکل سوار
تیزی سے اس کے قریب سے گزرے تھے اور
اس کا برس چھٹ کر زن سے موٹر سائیکل بھگا کر
اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ اسے
سنہلنے کا موقع ہی نہ ملا، بے بسی کی انتہا تھی اس کا
چہرہ آنسوؤں سے بھیک گیا تھا اور وہ چیختی تھی
چلائی تھی، لیکن اس کی بے بسی کسی کام نہ آئی، اس
نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وقت اور حالات کے
آگے وہ ایک دن یوں ذلیل و خوار ہو جائے گی،
نصیب نے اسے زیر کر دیا تھا، مجبوری نے اسے
جکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

Toronto pearson
international airport پہ ریکھا ذوریز
آفندی کو سی آف کرنے آئی تھی۔

”ذوریز تمہیں جاتا ہوا دیکھنا میرے لئے
بہت تکلیف دے ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں
بولی۔

”اپنا اور میت کا بہت خیال رکھنا۔“ انہوں
نے تاکید کی تھی، جواباً اس نے آنسو صاف کرتے

ساختہ اس نے ذوریز کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

Rekha i have to go”

”now“ انہوں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”کاش میں تمہیں ہمیشہ کے لئے روک

سکتی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”ریکھا پلیز، سنبھالو خود کو اور واپس لوٹ

جاؤ، میں اپنے ساتھ تمہاری آرزوؤں کا بوجھ لے

کر نہیں جانا چاہتا۔“ وہ بے بس ہوئے اب ان

کی فلائٹ اٹاؤکس ہونے لگی تھی۔

”کبھی بے خیالی میں تمہیں یاد آ جاؤں تو

فون کر لیا کرتا۔“

”مجھے انتظار رہے گا۔“ فرمائش کی گئی تھی،

ذوریز خاموشی سے سر ہلا گئے، اب انہوں نے اپنا

ہینڈکیری پکڑ لیا تھا۔

”میرے وعدے ہمیشہ یاد رکھنا۔“ انہوں

نے جانے سے پہلے ریکھا کو یاد دلایا تھا اور پھر وہ

ہینڈکیری پکڑے پورڈنگ کی طرف بڑھ گئے

تھے، ریکھا دھندلی آنکھوں سے اس گھر کے کوئیں

جیسے شخص کو دیکھتی رہی جس سے اس نے یکطرفہ

محبت کی تھی، وہ آنکھوں میں خواب بن کر اتر

جانے والا شخص تھا، وہ شخص جس سے ریکھا نے

عے تماشا محبت کی تھی، وہ شخص جس کی تھکی ماندہ

زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ شخص جس کی

محبت میں اس نے بری طرح سے مات کھائی تھی

اور اپنا آپ ہار دیا تھا، ذوریز آفندی نے پلٹ کر

نہیں دیکھا تھا اگر دیکھ لیتے تو ریکھا کے لئے

مشکل ہوتی سو وہ دیکھنا چاہتے بھی نہیں تھے۔

☆☆☆

ستارہ بوتیک کے کپڑے دینے کے لئے گھر

سے نکلی، مین روڈ پہ کسی رکشے یا بس کے انتظار

میں کھڑی تھی جب ایک رکشہ اس کے قریب آ کر

رکا تھا وہ جگت میں رکشے کی جانب بڑھی لیکن

رکشے میں موجود سکندر کو دیکھ کر پیچھے ہٹی۔

”ستارہ..... ستارہ روکو۔“ سکندر رکشے سے

نکل کر اس کے پیچھے آیا۔

”ستارہ رک جاؤ، مجھے تم سے بات کرنی

ہے۔“ وہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

”لیکن مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ

تفغر سے بولی۔

”ایک بار..... صرف ایک بار ستارہ.....

مجھے معاف کر دو۔“ وہ لاچارگی سے ستارہ کے

راستے میں آیا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی

سکندر، ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“ ستارہ

نفرت سے بولی۔

”ستارہ ایسے نہ کہو، یہ بتاؤ میری زارا کیسی

ہے؟“ وہ تڑپ کر بولا۔

”مرگئی ہیں ستارہ اور زارا تمہارے لئے،

یہی کہا تھا ناں تم نے مجھے؟“

”خدا کے لئے ستارہ مجھے معاف کر دو، مجھ

سے بہت بڑی بھول ہو گئی، میں نے اپنا گھر خود

اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ ڈالا۔“ وہ اب رورہا تھا۔

”مت بہاؤ یہ مگر مجھ کے آنسو، کچھ سال

پہلے میں بھی تمہارے سامنے ایسے ہی تڑپا کرتی

تھی، ایسے ہی التجائیں کرتی تھی لیکن تم میری ایک

نہیں سنتے تھے، یاد ہے تمہیں کس طرح تم نے

مجھے دھکے مار کر گھر سے نکالا تھا؟ کس منہ سے مجھ

سے معافی کی امید کر رہے ہو؟“ ستارہ ہنوز نفرت

سے کہتی آگے بڑھ گئی تھی، سکندر اس کے پیچھے آیا

تھا لیکن ستارہ ایک بس کے رکتے ہی اس میں

گھس گئی تھی۔

☆☆☆

سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو ڈھانپ

رکھا تھا وہی ملکی بوند باندی ہو رہی تھی۔

کمرے میں جانے کے لئے لاؤنج سے گزرنے لگی تو لاؤنج کے صوفے پہ ماہین کو براجمان پایا۔

”آیا بھی کہاں ہیں؟ نظر نہیں آ رہیں؟ کافی بھی میں نے اپنے لئے خود بنائی ہے رات کے کھانے کا بھی نہیں پوچھا انہوں نے؟“

”آیابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مام، ان کی کمر میں شدید درد ہے میں ابھی انہیں میڈیسن ہی دے کر آ رہی ہوں۔“ انوش نے بتایا۔

”او کیا ہو گیا انہیں اچانک سے؟“ وہ پریشان ہوئیں۔

”بتا رہی تھیں نیچے کمرے سے کچھ نکال رہی تھیں، جب انھیں تو کمر میں شدید درد نکل آیا۔“ انوش نے جھوٹ بولا۔

”دیری سیڈ، صبح انہیں کسی ڈاکٹر کو دیکھاؤں گی میں۔“ ماہین نے کافی کاگ ٹیبل پہ رکھا۔

”مام میں اپنے روم میں جا رہی ہوں، ایک ضروری اسمارٹنٹ تیار کرنا ہے مجھے۔“ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

”اس کا مطلب ہے آج رات کا کھانا مجھے ہی بنانا ہوگا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے صوفے سے اٹھیں۔

انوش سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، ماہین درکنگ وومن تھیں انہیں کوکنگ کا ٹائم بہت کم ملا کرتا تھا، آیابی نے گھر اور کچن کے تمام معاملات سنبھال رکھے تھے، سو وہ صرف سٹنڈ کے کوہی انوش کی فرمائش پہ کچن میں جایا کرتی تھیں۔

وہی ٹیبل کلیننگ کرنے کے بعد وہ چولہا جلا رہی تھیں جب ڈور بتل نے ان کی توجہ مبذول کی تھی۔

ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری بار بتل

”آیابی آپ کو یاد ہے ناں سب؟ کیا کرنا ہے؟“ انوش آیابی کے کوارٹر میں کھڑی ان سے پوچھ رہی تھی۔

”اب اس بڑھاپے میں مجھ سے ایکننگ کرواؤ گی؟“

”میں نے آج تک ماہین سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، مجھے تو بہت عجیب سا لگ رہا ہے یہ سب؟“ آیابی متفکر ہوئیں۔

”آیابی، کچھ نہیں ہوگا، جھوٹ اگر کسی کی زندگی میں بہار لا سکتا ہو تو وہ جھوٹ نہیں ہوتا، بس آپ کو بیمار ہونے کی ایکننگ کرنا ہے۔“ انوش نے انہیں پکڑ کر بستر پہ لٹایا اور کمبل کھول کر ان پہ پھیلا دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ماہین کا رد عمل اللہ جانے کیا ہوگا؟“

”ان کے رد عمل کا آپ سمیت مجھ کو اچھی طرح سے معلوم ہے آیابی، لیکن ڈیڈ اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ہمیں بے حس بننا پڑے گا، مام کو اکیلا کرنا پڑے گا، چھوٹے موٹے جھوٹوں کا سہارا لینا پڑے گا۔“ انوش نے انہیں قائل کرتے ہوئے کہا تو آیابی اثبات میں سر ہلا گئیں۔

”او کے آیابی، میں اب اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، ورنہ مام کو شک ہو جائے گا۔“ انوش واپسی کے لئے پلٹی۔

”ٹھیک ہے بیٹا، اللہ ہمیں ہمارے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔“ آیابی نے دعا کی۔

”انشاء اللہ آیابی، آپ دیکھئے گا، مام اور ڈیڈ کی زندگی میں ایک بار پھر بہار آئے گی، میں ان دونوں کی زندگیوں سے عم کے تمام کاٹنے نکال دوں گی۔“ انوش کے لہجے میں چٹائی تھی۔

آیابی کے کوارٹر سے نکل کر جب وہ اپنے

ہوئی، آج چوکیدار بھی چھٹی پہ تھا، آیا بھی نہیں بیمار تھیں۔

”پتہ نہیں کون ہے بے صبرا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کے پاس گئیں۔

”کون سے بھئی؟“ رات کا وقت تھا ملکی حالات کے پیش نظر انہوں نے فوری دروازہ نہ کھولا خاموشی۔

”کون ہے؟“ انہوں نے دوبارہ پوچھا، اب کے جھجھلاہٹ تھی، جواب نہارت، اس دوران دوبارہ ڈورنیل بجائی گئی۔

”لگتا ہے کوئی گونگا بہرا ہے۔“ انہوں نے زیر لب بڑبڑاتے، جھنجھلائے انداز میں گیٹ کھولا، سامنے جو شخص کھڑا تھا اس نے مایین کے وجود کو ساکت و جامد کر دیا تھا۔

اسے دیکھ کر جسم و جاں پہ عذاب ٹوٹا تھا، دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا، بھاگتے پھرتے کئی لمحے ان دونوں کے بیچ آ کر کہیں ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے تھے، دور کہیں بجلی زور سے چمکی تھی اور بادلوں سے گھرے آسمان کو روشن کر گئی تھی، دونوں کی نظریں ایک دوسرے پہ مرکوز تھیں، مایین کے پورے وجود میں اک سردی لہر دوڑ گئی تھی اس دشمن جاں کو اٹھارہ سال کے بعد اچانک سامنے دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا، ذوریز آفندی اشتیاق بھری نگاہوں سے اپنی مایہ کو دیکھ رہے تھے، جس کی خاطر انہوں نے جلاوطنی کا فیصلہ نہیں کیا، بیگ اور پنک کمر کے امتزاج ڈریس میں اسیس سالہ مایین آج بھی اتنی ہی حسین اور جاذب نظر تھی، مایین کی آنکھیں برسنے لگی تھیں، محبت نے اپنا حصار توڑتے ہوئے سنگدلی سے کہا تھا۔

”کیوں آئے ہو تم؟“ سختی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

”اپنی بیٹی سے ملنے۔“ یک ملک محبت بھری نگاہوں سے مایہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا، مایین کے چہرے پہ آئی سختی نے اب غصے کا روپ اختیار کر لیا تھا۔

”دفن ہو چکے ہیں ہم تمہاری بے وفائی کی قبر میں، اب ان دلوں میں سوائے تم سے نفرت اور بے پناہ درد کے کچھ نہیں ہے، کیوں آئے ہو ہمارے زخموں کو پھر سے تازہ کرنے؟“ ہنوز نفرت سے کہا گیا تھا۔

”میں اب اپنی بے گناہی میں کچھ نہیں کہوں گا، وقت خود ثابت کرے گا کون مجرم ہے اور کون بے قصور، مجھے اپنی بیٹی سے ملنا ہے۔“ وہ گیٹ سے اندر قدم رکھنے لگے، تو مایین نے ان کا راستہ روک لیا۔

”واپس چلے جاؤ ابھی اور اسی وقت۔“
”میں واپس جانے کے لئے نہیں آیا۔“
”میں تمہیں کسی صورت انوش سے ملنے نہیں دوں گی۔“ حتیٰ انداز۔

”اتنا ظلم مت کرو میرے ساتھ۔“ التجا آمیز انداز میں کہا گیا۔

”اور جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا وہ کیا تھا؟ ظلم کی انتہا نہیں تھی وہ۔“ دبی ہوئی چیخ کے ساتھ پوچھ گیا۔

”تم آج بھی غلط فہمی کے گھوڑے پہ سوار ہو۔“ ذوریز آفندی کے لہجے میں افسوس تھا۔

”غلط فہمی۔“ وہ پھینکاری۔
”وہ غلط فہمی نہیں تھی، میں نے خود تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب تم.....“ وہ روانی میں بولتے بولتے رک گئی تھیں۔

”پیچھے ہٹو مجھے اندر جانا ہے اپنی بیٹی سے ملنا ہے۔“ وہ ایک بار پھر آگے بڑھے، بوندا بانڈی اب بارش میں ڈھل رہی تھی، لیکن اس وقت

آئی تھی۔

بارش کی پروا کس کو تھی؟

”مام، یہ کیا کر رہی ہیں آپ، پیچھے ہٹے۔“
”میں اس شخص کو اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی۔“

”مام آپ زیادتی کر رہی ہیں، بیٹھے پیچھے،
ڈیڈ کے ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے۔“ انوش
نے مابین کو ایک سائیڈ پہ کرتے ہوئے گیٹ کھول
دیا تھا۔

”انوش میری جان، میری بچی۔“ ذوریز
نے اسے سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چوما تھا،
خوشی سے ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

”ڈیڈ میں اس لمحے کو ترس رہی تھی، میری
خوشیاں میری کامیابیاں میری زندگی آپ کے
بغیر ادھوری ہے ڈیڈ، میں اب آپ کو واپس نہیں
جانے دوں گی۔“ انوش باپ کے سینے سے لگی
نہایت محبت سے کہہ رہی تھی، مابین پھٹی پھٹی
نگاہوں سے باپ بچی کو دیکھ رہی تھیں۔

”میں اس شخص کو اپنے گھر میں ایک منٹ
بھی برداشت نہیں کروں گی۔“ مابین کی نفرت اور
غصہ کسی صورت کم نہ ہو رہا تھا۔

”مام پلیز جیسر اپ، ڈیڈ میرے کہنے پہ
یہاں آئے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔“
”ایسا ہرگز ممکن نہیں ہو گا اور تمہاری اتنی
جرات کے تم نے مجھ سے پوچھے بغیر، اس شخص کو
یہاں بلایا؟ مجھے بتایا تک نہیں۔“

”مام ڈیڈ سے ملنے کے لئے مجھے کسی کی
پریشن کی ضرورت نہیں ہے۔“

”باپ کو دیکھتے ہی تم خود غرضی پہ اتر آئی؟
یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے اس شخص سے کتنی
نفرت ہے؟“ دکھ مابین کے لہجے سے عیاں تھا۔

”مام پلیز پرانی باتوں کو بھول جائیں۔“
”نہیں بھول سکتی، اس شخص نے زخم میرے

”تم میرا جواب سن چکے ہو، میں تمہیں ہرگز
انوش سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے تمہاری
اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جارحانہ انداز
میں آگے بڑھے تو مابین نے غلٹ میں گیٹ بند
کیا، لیکن گیٹ بند نہیں ہوا تھا، ذوریز آفندی نے
دونوں ہاتھوں سے گیٹ تھام رکھا تھا۔

”چلے جاؤ، نفرت ہے مجھے تم سے، شدید
نفرت۔“ وہ نفرت سے چلاتے ہوئے پوری
فوت سے لیٹ بند کر رہی تھی اور ذوریز اس کی
کوشش کو ناکام بنانے کے لئے گیٹ میں ہاتھ
دیئے کھڑے تھے مابین کے زور سے گیٹ بند
کرنے کی کوشش ان کے ہاتھوں کو زخمی کر رہی
تھی۔

”ماہی پلیز دروازہ کھولو۔“ انہوں نے التجاء
کی۔

”نہیں کھولوں گی، کیوں آئے ہو تم، چلے
جاؤ۔“ وہ روتے ہوئے گیٹ سے ٹیک لگائے
کھڑی تھیں، ذوریز بار بار دروازے سے ہٹ
جانے کی التجا کرتے رہے، لیکن مابین کی بے حسی
نے انہیں وہاں سے ہٹنے نہیں دیا تھا۔

”ماہی خدا کے لئے، ایک بار صرف ایک
بار مجھے میری انوش سے ملنے دو۔“

”نہیں..... نہیں ملنے دوں گی، تم نے
میرے ساتھ بہت ظلم کیا۔“ وہ روتے ہوئے
گیٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، ذوریز کا ہاتھ
اب گیٹ میں پھنسا ہوا تھا، اب ان کے دونوں
ہاتھوں سے خون رہنے لگا تھا۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ تکلیف
دے منظر دیکھ کر انوش کا دل درد سے پھٹ رہا تھا
اور وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے

میرے بارے میں نہیں سوچا؟“
”بہت ہرٹ کیا ہے انوش نے مجھے۔“ وہ
روتے ہوئے بولیں۔

”میری بچی، جوان بیٹی ہے، اب جو ہوا سو
ہوا، اس پر زیادہ سختی مت کرنا، ورنہ باغی ہو جائے
گی اگر وہ اپنے باپ کے ساتھ کینڈا چلی گئی تو، تو
کیا کروں گی تم؟ خالی ہاتھ رہ جاؤ گی، تمہارے
پاس کچھ نہیں بچے گا مابین۔“ آیا بی اے سمجھا رہی
تھیں۔

”کچھ سمجھ نہیں آ رہا مجھے تو، دماغ ماؤف کر
دیا ہے میرا اس لڑکی نے۔“

”ماہین میری بچی، وہ تو نا سمجھ ہے، تم
سمجھا دو غلط شعور رکھتی ہو، میری مانو تو ذوریز کو
معاف کر دو، جانتی ہو تمہاری سب سے بڑی
جیت کیا ہوگی؟ جس نے تمہیں سب سے زیادہ
تکلیف دی ہو، اس سے بدلہ نہ لو اور معاف کر دو
اسے۔“

”جس شخص کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کیا
ہو، اپنے والدین بہن بھائی چھوڑے ہوں، اس
شخص کو معاف کرنا، آسان نہیں ہوتا آیا بی۔“
”میری بچی میں تم پر دباؤ نہیں ڈالوں گی،
جیسے تمہاری مرضی، صرف چند دن کی بات ہے
ذوریز میاں کو جیسے تیسے بھی ہو برداشت کر لو اس
گھر میں، وہ چلا جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا
پھر سے۔“ آیا بی پیار سے اسے قائل کر رہی
تھیں، جو اب وہ خاموش ہو گئی تھی، ان کی خاموشی
میں ان کی آدمی رضامندی پوشیدہ تھی۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ انہوں
نے دھیرے سے آنسو صاف کرتے پوچھا۔

”اٹھا نہیں جا رہا، کل بچن کے نچلے کینٹ
سے کوئی برتن نکال رہی تھی، اٹھی تو وہ درد ہوا کہ
کچھ مت پوچھو۔“ آیا بی نے تکلیف کے تاثرات

جسم پر لگائے ہوتے تو میں بھول جاتی، لیکن اس
نے میری روح کو زخم دیے ہیں وہ نہیں بھر
سکتے۔“

”ٹھیک ہے آپ ڈیڈ کو معاف نہیں کرنا
چاہتیں مت کریں، لیکن یہ اس گھر میں رہیں گے
میرے ساتھ، میں اب ڈیڈ کے بغیر نہیں رہوں
گی۔“ انوش نے از حد محبت سے کہا تو ذوریز نے
شفقت سے اپنی بیٹی کو اپنے حصار میں لیا۔

”چلے ڈیڈ میں آپ کے ہاتھوں پہ بیڈ تچ
کرتی ہوں۔“ انوش انہیں لئے آگے بڑھ گئی تھی
اور ماہین وہیں کھڑی ان باپ بیٹی کو درط حیرت
سے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

ماہین کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے
تھے، وہ آیا بی کے کوارٹر میں آیا بی کے مقابل بیٹھی
رو رہی تھیں، آیا بی کا دل کٹ رہا تھا ان کے یوں
رونے سے۔

”میری بچی مت روائے، مجھے تکلیف ہو
رہی ہے۔“ آیا بی نے اس کے کندھے پر ہاتھ
رکھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی انوش میرے
ساتھ ایسے کرے گی؟ وہ باپ کی محبت میں اس
قدر خود غرض ہو جائے گی؟“

”ابھی وہ بچی ہے معصوم ہے، معاملات کی
زداکت کو نہیں سمجھ سکتی، تمہیں اب عقلمندی سے کام
لینا ہو گا مابین، کچھ بھی ہو، ذوریز اس کا باپ ہے،
وہ اگر چند دن اپنے باپ کے ساتھ گزارنا چاہتی
ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ آیا بی نے
پیار سے انہیں سمجھا یا۔

”آیا بی وہ اچھی طرح سے جانتی ہے میں
اس شخص کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی اور اس
نے گھر بلا لیا ذوریز کو، ایک لمحے میں بھی اس نے

چہرے پہ سجاتے ہوئے ایکٹنگ کی۔

”آپ آرام کیجئے، دل یہ ایک تکلیف دے ہو جہ تھا اس لئے آپ کے پاس چلی آئی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”جیتتی رہو میری بچی۔“ آیابی نے دعا دی۔

”آج آفس نہیں گئی؟“

”نہیں آیابی، رات بھر آنکھ نہیں لگی، طبیعت میں عجیب بوجھل پن ہے، میں نے فون کر دیا تھا آج میں آفس نہیں جاؤں گی۔“

”اچھا کیا، ایک دن کی چھٹی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کم بخت درد نے تو مجھے اٹھنے جوگا ہی نہیں چھوڑا، ناشتہ کیسے بنے گا؟“ آیابی نے کن اکھیوں سے مایہ ناز کو دیکھا جن کے چہرے پہ اب بھی جھنجھلاہٹ کوفت اور غم کے آثار واضح دیکھا کی دے رہے تھے۔

”میں آپ کے لئے ناشتہ بھیجواتی ہوں اور رہی بات ان باپ بیٹی کی تو کھالیں گے وہ کہیں باہر جا کر۔“ ہنوز غصے میں اطلاع دی گئی۔

”ارے نہیں میرے بچے، تمہاری نفرت اپنی جگہ، گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسے نہیں کرتے اللہ ناراض ہوتے ہیں اور ویسے بھی گھر آئے مہمان کو بے عزت کرنا نہایت غیر اخلاقی حرکت ہے۔“ آیابی نے دیر سے کہا۔

”اوں مہمان، میرا دل چاہ رہا ہے اس شخص کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں اور آپ مہمان داری کی بات کرتی ہیں آیابی۔“

”نہ میری بچی ایسے نہیں کہتے، تمہیں اپنے رب کو راضی رکھنا ہے اور اس کی رضا کے لئے تمہیں اپنی نفرت پہ قابو پانا ہوگا میری جان۔“

”عجب دورا ہے یہ آکھڑی ہوئی ہوں اولاد کے سامنے کیسے بے بس ہو جاتا ہے

انسان۔“ وہ دکھ سے بولیں۔

”اولاد سے بڑی آزمائش کوئی نہیں اس دنیا میں۔“ آیابی نے بھی ان کی تائید کی۔

”اوشے آیابی آپ اب آرام کریں میں ذرا کچن میں دیکھوں، کیا گل کھلا رہی ہے میری صاحبزادی، چائے کا کپ تک تو بنا نہیں سکتی، کہیں ہاتھ پاؤں نہ جلا بیٹھے۔“ ان کے لہجے میں انوش کے لئے فکر سی، آیابی مسکرائیں۔

”ہاں تم جا کر دیکھو ایسے۔“ اور پھر مایہ ناز کے کوارٹر سے باہر نکل گئی تھیں۔

جب وہ کچن میں آئیں تو ذوریز کو کچن میں کھڑا پایا، ان کے دونوں ہاتھوں پہ بینڈیج ہوئی نظر آئی۔

”گڈ مارنگ۔“ ٹریک سوٹ میں ملبوس، چھ فٹ سے نکلتا قد خوبصورت ناک نقشہ، بیٹے وقت کے ساتھ ذوریز آندری مزید گر لیں فل ہو گئے تھے، بے ساختہ نہ پہ نظریں اٹھیں تھیں اور اگلے ہی لمحے مایہ ناز انہیں کمر نظر انداز کرتے فریج کی جانب بڑھی۔

انہوں نے مایہ ناز کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا، وہ آج بھی اتنی ہی حسین تھی۔

”مایہ میں نے گزشتہ اٹھارہ سالوں کے ایک ایک دن کے ایک ایک لمحے میں تمہیں یاد کیا ہے تمہیں مس کیا ہے، تمہارے لئے تیار ہوں میں، تمہیں دیکھ کر لگتا ہے وقت تمہیں چھوڑ کر بھی نہیں گزرا۔“ وہ ان کے عقب میں کھڑے ترسی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے، دودھ کا ڈبہ فریج سے نکال کر وہ غصے سے پلٹی۔

”مت سناؤ مجھے اپنی جھوٹی محبت کی یہ رام کہانی، میں نے صرف اور صرف انوش کی خاطر تمہیں چند دن کے لئے برداشت کیا ہے اور مجھے امید ہے تم ایک مہمان کی طرح کچھ دن رہ کر

”مجھ سے یہ امید مت رکھنا کہ میں یہاں بیٹھ کر تمہیں کافی پلاؤں گی، بنا کر دے دی ہے یہ کافی ہے۔“ کھر درے لہجے میں ترخ کر کہا گیا۔
 ”سچ کہا ہے کسی مفکر نے، عورت اور سمندر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا دونوں ہی اشتعال میں آ جائیں تو بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولے تھے، ان کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”بیڑا غرق تو تم نے میرا کیا ہے فوریز آندی۔“ وہ غصے سے گویا ہوئیں۔
 ”وقت میری گواہی دے گا، اب میں تمہیں یقین دلانے کی کوشش نہیں کروں گا۔“ وہ حتیٰ انداز میں بولے۔

”بہر حال میں پرانی باتوں کو دہرانے نہیں آیا، یہ بتاؤ آج آس جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“ انہوں نے ریٹ واپس دیکھی، صبح کے نو بج رہے تھے۔

”میں تمہیں بتانے کی پابند نہیں ہوں۔“
 ”بیوی ہو میری، میرے نکاح میں ہو، میں پوچھ سکتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے لفظ بیوی پہ زور دیا۔

”سب کچھ ختم ہو چکا ہے تمہارے اور میرے بچ۔“ اندر کی آہ نے لبوں پہ دم توڑا۔
 ”ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ بھی تو جوڑے جا سکتے ہیں؟“

”لیکن دل نہیں جڑتے۔“
 مابین کی بات پہ وہ کئی لمحے اسے دیکھتے رہے، ان کا دل جاہا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے مقابل بیٹھائیں اور اسے بتائیں کہ ان کی رائیں کیسے مافی کی یاد میں جاگا کر تھیں ان کے دن چمڑے دنوں کا کیسے سوگ منایا کرتے تھے۔

واپس لوٹ جاؤ گے۔“ درشت لہجے میں کہا گیا، وہ اسے تاسف سے دیکھتے رہے۔

”مہمان تو میں واقعی ہوں، اپنی دے ایک اچھا سا کپ کافی کامل سکتا ہے؟ وہ کیا ہے کہ رات تم نے میرے دونوں ہاتھ زخمی کر دیئے، ورنہ میں خود بنا لیتا۔“ فوریز نے وضاحت کی، تو مافی اس کے بیڈ تاج شدہ ہاتھوں کو دیکھ کر نظریں چرا گئی۔

”انوش کہاں ہے؟“ مافی ہنوز غصے میں تھی۔
 ”انوش سو رہی ہے، صبح فجر کے وقت سوئی ہے۔“

”نینو بناتی ہوں۔“ اٹھ مار جواب کے ساتھ اس نے چولہا جلایا اور وہ زیر لب مسکراتے ہوئے چیئر پہ بیٹھ گئے اور اسے کافی بناتے ہوئے دیکھتے رہے۔

”انوش بتا رہی تھی جا ب کرتی ہو تم؟“
 ”مجھ سے زیادہ سوال جواب مت کرنا، اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو۔“ جواباً وہ خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مابین نے کافی کا گگ اس کے سامنے ٹیبل پہ رکھا۔

”ٹھینکس۔“ وہ دھیرے سے بولے، وہ انور کرتی کچن سے باہر نکلے گئیں۔

”دل کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھوں کو بھی زخمی کر دیا ہے تم نے اب کافی کیسے پیو؟“
 دوریز سے شوے پہ وہ ایک لمحے کے لئے رکی تھی نظریں اس دشمن جاں پہ اٹھی تھیں، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے نظریں ہٹا لیں، اسے دیکھ کر دل دہائی دینے لگا تھا، اس کی سفارش کرتا تھا، اس کی محبت پہ پھر سے سب کچھ قربان کر دینے کے صلاح مشورے دینے لگا تھا۔

محبت میں اپنے اٹھتے قدموں کو چاہتے ہوئے بھی
روک نہیں پاتا، کیا کروں؟ تم نے مجھے بے بس
کر کے رکھ دیا ہے۔“ وہ اسے اپنی بشارتوں میں
مقید کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھو یہ جو تم فلمی قسم کی حرکتیں کر رہے ہو،
یہ چھوڑ دو پلیز۔“

”بی لیوی سب چھوڑ دوں گا، جب تم مجھے
مل جاؤ گی۔“ محبت سے کہا گیا۔

”بی الحال یہاں سے چلے جاؤ۔“ التجاء۔
”او کے چلا جاؤں گا، لیکن وعدہ کرو، کل رات
تم میرے ساتھ کرو گی۔“

”ٹھیک ہے اب جاؤ۔“ انوش نے جان
چھڑانے والے انداز میں کہا، تو وہ واقعی چلا گیا۔

”یار انوش تم خواہ مخواہ اس بے چارے کو
اگنور کر رہی ہو، آج کل کے دور میں ایسے عاشق
کہاں ملتے ہیں یار، اسٹوڈنٹ بنو اور اس پر رحم
کھاؤ، کتنا ذلیل و خوار ہو رہا ہے یہ تمہاری محبت
میں، ایسا سلجک تمہیں پھر نہیں ملنے والا۔“ شمل اور
طانشہ اس کے قریب آئیں۔

”طانشہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے انوش، تم
سیریلی اس کے بارے میں سوچو، ورنہ پچھتاؤ
گی۔“ شمل نے بھی طانشہ کی تائید کی۔

”ایمان سے ایسا لڑکا اگر میرے عشق میں
گرفتار ہوتا تو میں ایک لمحہ نہ لگاتی اس سے دوستی
کرنے میں۔“ طانشہ نے ایک سرزد آہ بھری،
یوں پہلی بار اس نے شاہ ویز کے بارے میں
سنجیدگی سے سوچا۔

☆☆☆

رات کا کھانا ٹیبل پہ لگانے کے بعد وہ
ڈائننگ روم سے نکلے گی تو انوش نے ان کا ہاتھ
تھام لیا۔

”مام پلیز، ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا

ماہی!

کسی دن میرے گھر آؤ

میرے کمرے میں بیٹھو

اور میری ایک ایک شے کو غور سے دیکھو

بک شیفٹ میں پڑی ہوئی کتابیں اور ڈائریاں

میز پر رکھی تمہاری تصویر

اور گلڈان میں مرجھائے ہوئے پھول

سب تمہیں بتائیں گے

دراز میں موجود ٹیبلٹیں

دیواروں پہ کھدے ہوئے میرے حروف

اور بستر پہ میری نقش بے قراری

تم پتے عیاں کرے گی کہ

میری آرزوؤں نے کس کس طرح تمہاری آرزو

کی

اور کیسے میرے خوابوں نے تمہارے صرف

تمہارے

خواب دیکھے ہیں؟؟؟

وہ جذب کے عالم میں بول رہے تھے اور

ان کے سامنے کھڑی ماہین چند لمحوں کے لئے اپنی

نفرت بھول گئی تھی، اس کے اندر اک سناٹا سا چھا

گیا تھا۔

☆☆☆

شمل کی برتھ ڈے پارٹی تھی جو اس نے

ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں Celebrate کر رکھی

تھی، انوش بھی اس پارٹی میں موجود تھی، جب شاہ

ویز نے اسے وہاں آکر حیران کر دیا تھا۔

”تم..... یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ اس

کے پاس کھڑی حیرانگی سے بولی۔

”تمہارے لئے آیا ہوں۔“

”پلیز..... مجھے تماشہ مت بناؤ۔“ اس نے

دبی آواز میں التجا کی تھی۔

”میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، تمہاری

بھی بنانا نہیں آتا تھا۔“ رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے وہ بے ساختہ بولے۔

”وقت سب کچھ سیکھا دیتا ہے، وہ سب کچھ جس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا تک نہیں ہوتا۔“ ٹپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے مایین نے کہا اور چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کہاں جا رہی ہیں مام؟“
”تمہارے ڈیڈ کو کھانے کے بعد گرین ٹی پینے کی عادت ہے اور میں وہی۔“ وہ روانی میں بولتے بولتے رکی ٹھیں اور اپنی خفت مٹانے کے لئے انہوں نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

”تمہاری خاطر اب مہمان نوازی تو بھائی ہی ہوگی مجھے۔“ سوس پین میں پانی ڈالتے ہوئے وہ انوش سے مخاطب ہوئی، چہرے پہ ہنوز غصہ تھا۔

انوش نے مسکراتی نظروں سے ڈوریز آفندی کو دیکھتے ہوئے کٹریں کا نشان بنایا تھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈوریز کو اشارہ کرتے ہوئے وہ چیئر سے اٹھی۔

”ایلسکیو زمی، مجھے لگتا ہے میرا فون بنگ رہا ہے۔“ انوش ڈانگ روم سے نکل گئی، ڈوریز بھی اپنی نشست سے اٹھے اور مایین کے قریب آئے۔

”تمہیں ابھی تک یاد ہے کہ میں ڈنر کے بعد گرین ٹی لیتا ہوں؟“ مایین کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ محبت سے بولے، وہ غصے سے چلی، ڈوریز اس کے سامنے اس کے قریب کھڑے دارنگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”محض اتفاقاً یاد آ گیا تھا، مایین نے اپنے کندھے سے ان کے ہاتھ ہٹائے اور ان کے قریب سے گزرنا چاہا، لیکن وہ پھر ان کے راستے میں آئے۔

”کھائیے ناں۔“
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ناگواری سے ڈانگ چیئر پہ بیٹھے ڈوریز کو دیکھا۔
”مام آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ انوش نے اسرار کیا۔

”بیٹھ جاؤ مامی، تمہاری نفرت اور ناراضگی اپنی جگہ، لیکن خود کو بھوکا رکھ کر سزا مت دو۔“
”مام پلیز ڈیڈ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ انوش نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ بیٹھا لیا اور التجاء کی۔

”ارے واؤ، پالک کو فٹے، تمہیں اب تک یاد ہے یہ ڈش میری ملتی فیورٹ ہے؟“ ڈوریز نے خوشی اور حیرت سے پالک کو فٹے کا سالن اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا، ان کے ہاتھوں پہ اب بھی زخموں کے نشان نظر آرہے تھے۔

”تمہارے لئے نہیں بنایا میں نے، میرا دل چاہ رہا تھا۔“ وہ کھسیا کر بولی۔

”اسی لئے کہہ رہی تھی مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ مسکرائے، تو مایین جربز سی بریانی اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگی، ڈوریز آفندی کے لبوں پہ خوبصورت اور گہری مسکراہٹ رقصاں تھیں، ڈانگ ٹیبل پہ تمام ڈیشن ان کی فیورٹ تھیں، مایین نے لاشعوری طور پہ ان کی پسند کی تمام ڈشیز بنائیں تھیں، کچھ بھی تھا وہ کبھی ان کی زندگی ہوا کرتے تھے، ان کی پہلی اور آخری محبت۔

وہ بے دلی سے کھانا کھا رہی تھیں، بارہا انہیں ڈوریز کی گہری نگاہوں کی پیش خود پہ محسوس ہوتی تھی۔

”ڈیڈ آپ بریانی لیجئے نا۔“ انوش نے بریانی کی ڈش ڈوریز کی طرف بڑھائی۔

”مایین تم نے تو مجھے حیران کر دیا، اتنا ٹیسی کھانا بنانے لگی ہو، بیس سال پہلے تو تمہیں اٹھ

گزرے وقت کی تلخی ایک سختی کا روپ دھار کر ان کے لیے بھی مٹا دیا گئی تھی۔

”بھی محبت بھی فنا نہیں ہوتی، اسے کبھی زوال نہیں آتا، تمہارے بغیر جس طرح میں کرب کی سولی پہ لٹکا ہوں، تم نہیں جان سکتی، تمہاری جدائی نے مجھے اندر سے ختم کر دیا ہے ماما، میں تمہاری جدائی کی بے رحم تاریکی میں گم ہو کر رہ گیا ہوں۔“ وہ دکھ اور بے بسی سے بول رہے تھے۔

”وقت نے اس محبت کو زخموں سے بھر دیا ہے، زور یز آفتی، دل کے تالاب گدھے ہو گئے ہیں، چھید ڈالا ہے مجھے تمہاری بے وفائی کے دکھ نے مر گئی ہیں میری بے چینیوں کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا، بے اعتباری کی میل نے منظر منظر میلا کر دیا ہے، اب اس منظر میں اپنا عکس مت ڈھونڈو، کچھ نظر نہیں آئے گا تمہیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کر کے بچن سے باہر نکل گئی تھیں اور وہ تاسف سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ بیڈ پہ منہ بہ منہ کی لٹی کتاب پڑھ رہی تھی، جب اسے میرس پہ کھٹکے کی آواز آئی تھی، لیکن اس نے سنی ان سنی کی، پڑوس کی بیلی اکثر رات کو مزگشت کے لئے آیا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرس کی طرف کھٹنے والے دروازے پہ کھٹکا ہوا تو وہ سیدی ہو کر اٹھ بیٹھی، اگلے ہی لمحے شاہ ویز اس کے کمرے میں موجود تھا، اسے اسنے سانسے اور وہ بھی اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

”تت..... تم..... تم..... یہاں؟“ گک..... کیوں آئے ہو؟“ وہ از حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

”تمہیں یہ بتانے کے لئے، کہ میں تمہاری

”ایک بار..... صرف ایک..... میری طرف دیکھو تو سہی..... ترس گیا ہوں تمہاری ایک محبت بھری نگاہ کو، محبت بھری مسکراہٹ کو، اتنی ظالم مت بنو ماما۔“ اسے دونوں شانوں سے تھام کر اپنے مقابل اپنے قریب کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے۔

”میری محبتیں صرف تمہارے لئے ہی تھیں، میرے لب صرف تمہی کو دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے، لیکن تم نے سب کچھ ختم کر دیا، برادر کو دیا سب کچھ۔“ اس نے پھر سے ان کے ہاتھ جھٹکے۔

”کچھ بھی ختم نہیں ہوا ماما، میں آج بھی تمہیں صرف تمہیں دل و جاں سے چاہتا ہوں، میرا دل آج بھی صرف تمہارے نام پہ دھڑکتا ہے ماما، میری آنکھیں آج بھی صرف تمہیں دیکھ کر روشن ہوتی ہیں ماما تمہیں صرف میرے لئے بنایا گیا ہے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، اٹھارہ سال میں نے ایک زندہ لاش بن کر کینڈا میں گزارے ہیں اب اور نہیں رہا جاتا ماما۔“ وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگائے دیوانہ وار کہہ رہے تھے، سامنے کھڑی مامین کا ایک مدت کے بعد دل دھڑکا تھا، ان کے لمس نے ایک مدت کے بعد اس کے وجود کو توانائی بخشی تھی، دل نے چپکے سے خواہش کی تھی کہ وہ اسی طرح اس کے آئو تو رہے۔ لیکن مامین کی ضد، نفرت اور کھوسور پن نے ایک لمحہ لگایا تھا انہیں بے حس کرنے میں۔

”چھوڑو میرا ہاتھ اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا وقت گزرنے کے ساتھ محبت بھی فنا ہو جاتی ہے ختم ہو جاتی ہے اور میری محبت اسی دن ختم ہو گئی تھی جس دن تم نے مجھے دھوکا دیا تھا مجھے چیٹ کیا تھا، میری محبت کی تو بین کی تھی، مجھے دو کوڑی کا کر دیا تھا تم نے۔“

بولی۔

”اور میرے لئے وہ میری زندگی کا خوبصورت ترین لمحہ تھا۔“ نیکی سے لپک لگائے وہ مخمور سے انداز میں بولا۔

”تم کیوں کر رہے ہو یہ سب؟“ وہ رو دینے کو تھی۔

”میں کل لچ یہ تمہارا انتظار کرتا رہا، تم نہیں آئی، مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تم نے؟“

”میں تمہارے حکم کی غلام نہیں ہوں، تم جو کہو گے وہ ہوتا چلا جائے گا۔“ ہنوز غصہ، دفعتاً اس کے کمرے کا دروازہ ناک ہوا، تو انوش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”انوش بیٹا تم ٹھیک تو ہو، تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہاری چیخ سنی تو میں پریشان ہو گیا۔“ باہر زوریز آتندی کھڑے اس کی حیرت دریافت کر رہے تھے شکر ہے اس کا دروازہ لاکڈ تھا۔

”جی ڈیڈ وہ..... وہ کک..... کا کروچ دیکھ لیا تھا۔“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

”تمہاری چیخ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، ٹھیک ہے تم آرام کرو۔“

”او کے ڈیڈ۔“ زوریز کے جانے کے بعد اس نے سرگوشی کی۔

”انوش جاؤ یہاں سے۔“

”نہ چائے نہ پانی نہ خاطر نہ مدارت، کچھ تو مہمان نوازی کرو اپنے ہونے والے شوہر کے لئے۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔“ مجبوراً انوش نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”دل تو نہیں چاہ رہا یہاں سے جانے کو لیکن تم اب اتنا فورس کر رہی ہو تو جانا پڑے گا۔“ وہ بیڈ سے اٹھا۔

محبت میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آتے ہوئے شاہ ویز نے وضاحت دی۔

”تنت..... تمہاری اتنی جرأت کہ تم..... تم میرے بیڈ روم میں آ پھنچے؟“ غصے سے عراتے ہوئے وہ اس کا گریبان پکڑنے کی غرض سے آگے بڑھی۔

”مانتی ہوں! پھر مجھے؟“ وہ مسکرایا۔

”دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے دانت پیسے اور شاہ ویز کو دھکا دیا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے میری جان۔“ وہ جوتوں سمیت بیڈ پہ دراز ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ..... یہ..... سب کیا ہے؟ اٹھو یہاں سے اور دفعہ ہو جاؤ، ام ڈیڈ میں سے کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔“ وہ نہایت بدحواسی میں اس کے قریب آئی۔

”پھر تو اور بھی آسانی ہو جائے گی مجھے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”اٹھو..... اٹھو یہاں سے۔“ انوش نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”کم آن یار، اتنی جھی کیا جلدی ہے، یہاں بیٹھو ناں میرے پاس۔“ شاہ ویز نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ بیڈ پہ اس کے مقابل آگری۔

”میں نے تم جیسا مکینہ انسان نہیں دیکھا۔“

”اب تو دیکھ لیا ہے ناں۔“ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو میں شور مچا دوں گی۔“ بیڈ سے اٹھتے ہوئے وہ غرائی۔

”تو روکا کس نے ہے، مجاؤ شور۔“ اس پہ تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

”یہ نہیں وہ کون سی محسوس کھڑی تھی جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔“ وہ زچ ہوتے ہوئے

”پلیز چلے جاؤ۔“ اس نے التجاء کی۔

”لیکن ایک شرط ہے۔“ وہ اس کے مقابل آ

کھڑا ہوا۔

”کیسی شرط؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہیں اقرار محبت کرنا ہوگا، مجھے بتانا ہوگا

کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ اس کے ماتھے

سے بال ہٹاتے ہوئے وہ ہنوز ڈھٹائی سے بولا۔

”تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں سے تمہارا گلا

دبانے کو دل چاہتا ہے میرا۔“ اس کی ہچکلی پہ شاہ

ویر مسکرایا۔

”تمہارا یہ غصہ، یہ خفگی مجھے راتوں کو سونے

نہیں دیتی، دل چاہتا ہے ایک لمحہ نہ لگاؤں اور

لے آؤں تمہیں اپنے پاس۔“ اف یہ محبت۔

”زیادہ لمبی ہونے کی ضرورت نہیں اب

جاؤ۔“

”اقرار محبت؟“

”زبردستی ہر کام کر دیا جاسکتا ہے سوائے

محبت کے۔“

”تم جو بھی کہو، میں نے بغیر نہیں جاؤں

گا۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شاہ ویر

نے گویا فیصلہ نایا تھا۔

”مجھے تم سے محبت ہے،..... محبت ہے.....

محبت ہے..... اب جان چوڑو میری۔“ اس نے

جھنجھلا کر جان چھڑانے کے لئے کہا۔

”کیا کہا تم نے؟ میں نے سنا نہیں۔“ اس

کے کان کھجائے۔

”میں سچ میں تمہیں جان سے مار دوں

گی۔“ انوش نے غصے میں تکیہ اٹھا کر اسے مارا۔

”ظالم مار ہی تو دیا ہے۔“ اس نے سرد آہ

بھری۔

”جاؤ اب۔“ انوش نے اسے میرس کے

دروازے کی طرف دھکیلا۔

”وعدہ کرو کل رات ڈنر میرے ساتھ کرو

کی؟“ وہ جاتے جاتے رکا۔

”اوکے بابا کر لوں گی جان چوڑو میری۔“

”اگر کل تم نے وعدہ خلائی کی تو یاد رکھنا،

اس سے بڑا قدم اٹھاؤں گا۔“ اس نے دھمکی

دی۔

”اوکے وعدہ۔“

”گڈ نائٹ۔“ دروازہ کھولتے ہوئے شاہ

ویر نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ بلایا تھا۔

☆☆☆

ماہین آفس سے لوٹی تو گھر میں غیر معمولی

خاموشی تھی۔

”السلام علیکم آیا بی۔“ ماہین نے ٹی وی

لاؤنچ کے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

”ولیکم السلام جیتی رہو میری بچی۔“ آیا بی

نے پانی کا گلاس ماہین کی جانب بڑھایا۔

”آج بہت خاموشی ہے گھر میں؟ کہاں

ہیں یہ باپ بیٹی۔“ پانی پی کر گلاس ٹرے میں

رکھتے ہوئے انہوں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

”انوش کا کالج سے فون آیا تھا، کہ وہ کالج

سے واپسی پہ محل کے گھر جائے گی اور شام کو

لوٹے گی اور ذوریز میاں تو بے چارے صبح سے

بٹخار میں تپ رہے ہیں، گھر میں بھی بٹخار کی کوئی

ایسی دوا موجود نہیں تھی جو میں انہیں دے دیتی،

انوش بھی گھر نہیں تھی، میں نے ایک دو بار جا کر

دیکھا لیکن ذوریز میاں ہوش و خرد سے بیگانہ

پڑے تھے، بہت محنت ڈرا بیور بھی چھٹی پہ ہے۔“ آیا

بی نے انہیں تفصیل بتائی تو فکر کے آثار ان کے

چہرے سے عیاں ہونے لگے۔

”آیا بھی آپ مجھے فون کر دیتیں، میں

آفس سے جلدی آ جاتی۔“ وہ صوفے سے

اٹھیں۔

”ماہین کیا تم واقعی میرے پاس ہو۔“ ماہین نے دھیرے سے جواب دیا۔

”مجھے اکیلا مت چھوڑنا مانی..... تم..... تم..... زندگی ہو میری..... مجھے میری زندگی سے دور مت کرنا مانی..... مجھے خود سے دور مت کرنا۔“ ان کی آنکھیں بند تھیں، ان کی بے چین آرزوؤں ماہین سے التجاء کر رہی تھیں۔

”انھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں؟“

”نہیں مجھے کہیں نہیں جانا، بس تم پاس رہو، میرے۔“ بخار کی شدت کی وجہ سے ان کی آواز کانپ رہی تھی اور اب انہوں نے ماہین کے ہاتھوں کو کیوں سے لگا رکھا تھا، وہ اپنا ہاتھ کھینچتا چاہتی تھی لیکن ان کی بے بسی ماہین کو بے بس کر رہی تھی۔

”پاگل مت بنو، میڈیسن نہیں کھاؤ گے تو ٹھیک کیسے ہو گے؟“

”مجھے کہیں نہیں جانا، بس تم یہیں رہو، میرے پاس۔“ پھر سے محبت بھری التجاء کی گئی تو ماہین نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پھر سے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پہ رکھنے لگیں۔

”میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی، سچے دل سے تمہیں چاہا، پھر تم نے کیوں اپنے بھروسے کو مسار کیا؟ کیوں میری بات پہ یقین نہیں کیا مانی۔“ اب وہ نیم والی آنکھوں سے اپنے مقابل بیٹھی ماہین سے پوچھ رہے تھے، ان کے لہجے میں ہزاروں شکوے اور دکھ پنہاں تھے۔

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، تم خواہ مخواہ اپنے ذہن پہ بوجھ ڈال رہے ہو۔“ ماہین نے انہیں ٹالا، تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں مانی، میری زندگی کی سب سے

”بس بیٹا فکر اور پریشانی میں مجھے بھی یاد نہیں رہا۔“ نفقت سے آبیانی نے اعتراف کیا۔

”اوکے میں جا کر دیکھتی ہوں۔“ وہ گیٹ روم کی جانب بڑھیں، ماہین جب گیٹ روم میں آئی تو زوریز بند پہ بے سدھ پڑے تھے اور بخار میں تپ رہے تھے۔

ماہین نے جھک کر ان کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا اور پھر ہٹا لیا اور پھر آبیانی سے ٹھنڈا پانی منگوا کر ان کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی سے پٹیاں کرنے لگیں، نا جانے وہ ایسا کیوں کرنے لگی تھیں، انہیں تو نفرت تھی اس شخص سے، پھر وہ کیوں فکر مندی سے ان کے سر ہانے بیٹھے ان کے ماتھے پہ پٹیاں رکھ رہی تھیں؟ ان کے ویران سے چہرے کو دیکھتے ہوئے ماہین نے خود سے پوچھا تھا لیکن گہری خاموشی کے سوا انہیں کچھ بھی سنائی نہ دیا۔

زوریز کے چہرے پہ گویا صدیوں کی مسافت لکھی تھی، جیسے کوئی صحرا میں بھٹک بھٹک کر تھک گیا ہو، اس کے ہونٹوں پہ گہری تاریکی درج تھی، بند آنکھوں میں ستاروں کی داستانیں تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی امیدیں شام کے سائے میں کسی کھوئے ہوئے پیڑ تلے رکھ کر کوئی بھول گیا ہو، بھر آنکھیں، ویران اور اجڑا ہوا دل، اور تھکا ہوا وجود، ماہین کے سامنے تھا، ان کے ماتھے پہ پٹیاں کرتے ہاتھ چند لمحوں کے لئے رکے تھے اور وہ مبہوت سے اس شخص کو دیکھنے لگی، جس کی محبت نے کبھی اس میں زندگی پھونکی تھی، جو کبھی اس شخص کا نام لے لے کر جیا کرتی تھی۔

”ماہین..... ماہین۔“ زوریز کے سوکھے ہونٹوں پہ ان کا نام تڑپا تھا اور پھر دھیرے سے انہوں نے ماہین کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتا چاہتی تھی لیکن نا جانے کیوں، اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔

”عرفان میں پرانی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتی اور اسے میری آخری خواہش سمجھ کر پوری کرنے کی کوشش کرنا۔“

”لیکن بی جان۔“ عرفان نے بولنا چاہا۔
”کچھ مت کہنا عرفان، میں نے بیس سال خود پہ جبر کیا ہے اپنے سینے پہ پتھر رکھ کر جیتی رہی ہوں اب اور جیا نہیں جاتا مجھ سے۔“ بات کرتے کرتے وہ رو پڑی تھیں، عرفان سر جھکا گئے۔

”بی جان آپ پریشان نہ ہوں، جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔“ حمیرا اٹھ کر بی جان کے قریب آئیں اور انہیں تسلی دیتے ہوئے بولیں۔
”عرفان ہو سکے تو تم بھی، ماہین کو معاف کر دو، چھوٹی بہن ہے تمہاری، اس نے جو کیا یقیناً اس کی سزا پالی ہوگی اس نے۔“ بی جان نے التجاء کی۔

”بی جان آپ مجھ سے ایسی التجاء کر رہی ہیں جسے پورا کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔“
”عرفان کچھ بھی مشکل نہیں ہے، بس ذرا سادہ دل سمجھاؤ اور یہ سوچو کہ اگر تمہاری کوئی بیٹی ہوتی تو کیا تم ساری زندگی اس سے یوں خوارہ سکتے تھے؟“

”شکر ادا کرتا ہوں خدا نے مجھے بیٹی نہیں دی، ورنہ اور تا جانے ایسی کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا مجھے۔“ وہ اس وقت شدید غصے میں تھے اور انہوں نے بی جان کی وجہ سے اپنا غصہ کٹرول کر رکھا تھا۔

”عرفان پلیز، یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، بی جان جو کہہ رہی ہیں اس پہ توجہ دیں۔“ حمیرا نے انہیں سرزنش کی تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کر چلے گئے۔
”تا جانے میں اپنی ماہین سے مل پاؤں گی

خوبصورت رفاقتوں کی بازگشت تو صرف تمہارے دم سے تھی، پھر تم نے مجھے کیوں اکیلا کیا ماہی۔“
ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی، ماہین کے پاس ان کے کسی سوال کا جواب نہ تھا۔

☆☆☆

”زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں عرفان، تا جانے کب یہ سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے؟ اب تو مہمان ہوں میں تمہاری۔“ بی جان نے یاسیت سے کہا۔

”اوہو بی جان اللہ رحم کرے، ایسی باتیں مت کیا کریں، اللہ آپ کا سایہ ہم پہ سلامت رکھے۔“ ملک عرفان نے چائے کا کپ نیبل پہ رکھتے ہوئے بی جان کو تنبیہ کی۔

”عرفان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بی جان آپ ایسی مایوسی کی باتیں مت کیا کریں۔“ ان کے مقابل بیٹھی حمیرا بیگم نے بھی عرفان کی تائید کی، وہ تینوں اس وقت شام کی چائے لان میں بی رہے تھے۔

”عرفان میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“
توقف کے بعد وہ پرسوج انداز میں بولیں۔
”جی فرمائیے بی جان۔“

”میں مرنے سے پہلے ایک بار ماہین سے ملنا چاہتی ہوں، اسے سینے سے لگانا چاہتی ہوں۔“ بولتے ہوئے بی جان کی آواز بھگ گئی تھی، حمیرا اور عرفان نے ایک دوسرے کو پرسوج انداز میں دیکھا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے بی جان، ہماری عزت خاک میں ملا کر وہ اس گھر کی عزت کے ساتھ ساتھ ہمارے وقار و محبت اور دنیا کی ہر آزمائش کو شوکر مار کر چلی گئی تھی اس شخص کی خاطر جو.....“ وہ غصے سے بول رہے تھے جب بی جان نے ان کی بات کاٹی تھی۔

کہ نہیں؟“ بی جان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”انشاء اللہ بی جان، اللہ نے جانا تو ضرور ملیں گی۔“ حمیرا نے ان کے کندھے پہ چھلی دیتے ہوئے سلی دی۔

”اللہ تمہاری زبان مبارک کر کے میری بچی، اللہ تمہیں بھی ایسی ہی نیک اور فرمانبردار بہو ملے جیسی اللہ نے تمہاری صورت میں مجھے دی۔“ بی جان نے حمیرا کا ماتھا چومتے ہوئے دعا دی۔

”آمین بی جان۔“

”گلتا ہے عرفان ناراض ہو گیا ہے۔“ بی جان نے ٹھکر سے کہا۔

”ارے نہیں بی جان آپ تو جانتی ہیں، ان کا غصہ دودن کا ہوتا ہے اور ویسے بھی آپ کا کوئی حکم عرفان نے کبھی ٹالا ہے جو یہ ٹالیں گے؟“ حمیرا نے انہیں شانت کیا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”انشاء اللہ بس آپ فکر مت کریں۔“ بی جان نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر توقف کے بعد بولیں۔

”یہ پارس کہاں غائب رہتا ہے؟ ہفتوں شکل نہیں دیکھاتا۔“

”بی جان سارا بزنس تو اسی نے سنبھال رکھا ہے، اسی لئے تو عرفان پہ کوئی برڈن نہیں ہے بزنس کا اور آج کل تو پارس سنگاپور گیا ہوا ہے کچھ انٹرنیشنل کمپنیوں سے میٹنگ ملے تھی اس کی۔“ حمیرا نے انہیں بتایا۔

”ماشاء اللہ، میری مانو تو اب شادی کروادو اس کی۔“ بی جان نے مشورہ دیا۔

”میرا بھی یہی ارادہ ہے بی جان، بس کوئی اچھی سی لڑکی مل جائے۔“ حمیرا خوشی سے بولیں۔

”لو بھلا میرے پوتوں کو لڑکیوں کی کمی ہے

کیا؟“

”کی تو واقعی کوئی نہیں ہے بی جان، آج کل لڑکیوں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے میرے کماؤ بیٹے کو لے نہ اڑے۔“ حمیرا نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میرے اللہ کے حکم سے بہت اچھی لڑکی ملے گی، تم بس ارادہ کرو میرے پارس کی شادی کا، اک مدت سے یہ گھر خوشیوں کو ترس رہا ہے۔“

”آپ کی دعاؤں سے یہ گھر پھر سے خوشیوں سے جگمگائے گا بی جان۔“ حمیرا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

”کیا واقعی تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟“ انوش کی آنکھوں میں چمک تھی، جوس کے گلاس میں اسٹر اٹھاتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے شاہ ویز سے پوچھا تھا۔

”کیا میں اپنی جان دوں گا تم پھر یقین کرو گی؟“ اس کے مقابل بیٹھے ڈنر کرتے ہوئے شاہ ویز نے اس کے حسین چہرے کو دیکھا۔

”نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”اندازہ ہے مجھے۔“ وہ جھینپ گئی۔

”تو پھر کیوں پوچھا تم نے؟“ شاہ ویز نے اس کے ہاتھ پہ دھیرے سے ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔

”بس ایسے ہی۔“ مسکراتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ کھینچا چاہا، لیکن شاہ ویز نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس وقت کا بہت انتظار کیا ہے

انوش، کتنے خواب دیکھے ہیں میں نے تمہیں

سامنے ہے اور جاتی ہو جب تم میرے سامنے
ہوتی ہو تو میرا خود پہ اختیار ختم ہونے لگتا ہے۔“
اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاتے ہوئے
اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جذب سے
کھد رہا تھا۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ ان ہاتھوں سے
تمہارے ان خوبصورت ہونٹوں کو چھو کر دیکھوں
تمہارے ان بالوں کو اپنے چہرے پہ بکھیروں،
تمہاری خوشبو کو تمہاری سانسوں کو محسوس کروں،
تمہاری انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر تمہارے
ہاتھ کی پشت پہ اپنے ہونٹوں کی مہر لگاؤں
اور.....“ وہ جذب اور روانی سے بول رہا تھا۔

”پلیز شاہ ویز۔“ وہ جھینپ رہی تھی اور اپنا
ہاتھ کھینچ رہی تھی۔

”میں نے ہمیشہ تمہیں غصے میں دیکھا ہے،
آج تمہارا یہ روپ دیکھ کر تم پہ قربان ہونے کو دل
چاہتا ہے۔“ شاہ ویز نے اس کا ہاتھ لیوں سے
لگاتا جاہا، لیکن انوش نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا، اس
کے اظہار محبت سے انوش کے چہرے پہ محبت کے
دھنک رنگ اتر آئے تھے۔

”مجھے اب چلنا ہو گا دیر ہو رہی ہے مجھے۔“
وہ اپنی نشست سے اٹھی۔

”او کے میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“
شاہ ویز نے والٹ سے کھانے کا بل ادا کرنے
کے لئے پیسے نکالے۔

”مام سو سو سوال کریں گی مجھ سے، میں نے
انہیں کہا تھا کہ میں طائفہ سے ٹوٹ لے کر آدھے
کھٹے میں واپس آ جاؤں گی۔“ کلائی پہ بندھی
گھڑی دیکھتے ہوئے وہ ہنسنے لگی۔

”کچھ نہیں ہو گا، تم خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہی
ہو۔“ شاہ ویز نے بل ادا کیا اور ٹیکس سے گاڑی
کی چابی اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی اور پھر وہ

اپنانے کے؟ یہ میں تمہیں شاید لفظوں میں نہ بتا
سکوں۔“ سچائی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔
انوش کو خود پہ فخر محسوس ہوا، اس کی ذات کسی
کے لئے اتنی اہم تھی ہو سکتی ہے؟

”نکاح محبت کو مضبوط بنا دیتا ہے شاہ ویز،
اور میں چاہتی ہوں کہ ہم جلد از جلد اس محبت کو
ایک خوبصورت رشتے سے باندھ دیں۔“ وہ
دھیرے سے گویا ہوئی۔

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں انوش، یہ بتاؤ
تم اپنی مام ڈیڈ سے مجھے کب طوار ہی ہو؟“
”انشاء اللہ جلد ہی ڈیڈ سے ملواؤں گی۔“
”اور مام سے کیوں نہیں؟“

”وہ تمہارے اور میرے رشتے کو اتنی آسانی
سے قبول نہیں کریں گی۔“ انوش نے اعتراف
کیا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔
”اس کی وجہ پھر کبھی بتاؤں گی۔“ وہ پرسوج
انداز میں بولی۔
”او کے جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے
شانے اچکائے۔

”مجھے اب چلنا چاہیے۔“
”اتنی جلدی بھی کیا ہے میری جان۔“ وہ
اسے وارنٹی سے دیکھتا ہوا ٹیکس پہ جھکا۔
”یہ..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے گھبرا
کر ادھر اُدھر دیکھا۔

”تمہیں دیکھنا جرم ہے کیا؟“ وہ مسکرایا۔
”لوگ کیا سوچیں گے؟“ اس نے ارد گرد
ٹیکس پہ نگاہ دوڑائی جہاں لوگ کھانا کھانے میں
مصروف تھے۔

”مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے، میں صرف
یہ جانتا ہوں کہ میرے سامنے اس وقت میری
محبت موجود ہے، میری زندگی میرا عشق میرے

گھر میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں وہ ایک کام سے نکل رہا تھا جب کپڑے سلائی کرتی ستارہ نے اسے آواز دی تھی۔

”ازنک بات سنو ذرا میری“ ستارہ پر آمدے میں تخت پوش پہ سلائی مشین رکھے بیٹھی تھیں۔

”جی پھوپھو فرمائیے“ وہ دوبارہ بانیک کھڑی کرنے کے بعد ان کے قریب آیا۔

”بہان بیٹھو میرے پاس“ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے گرہ کھولنے لگیں۔

”میں بانتی ہوں ازنک تمہیں اب نوکری کی ضرورت نہیں رہی، مگر میرے چاند اس وقت ملک کے جو حالات ہیں اس میں نیا کاروبار شروع کرنا رسک لینے والی بات ہوگی۔“

”پھوپھو آپ کہنا کیا چاہتی ہیں محل کر بات کیجئے۔“

”کچھ عرصہ پہلے میں نے پڑوسی کی زری آیا سے تمہاری جاب کے لئے بات کی تھی ان کا بھائی کسی بہت بڑی کمپنی میں بہت بڑا آفیسر ہے۔“

”یہ لو اس کمپنی کا ایڈریس ہے اور یہ جبران بھائی (زری آپ کا بھائی) کا نمبر بھی اوپر لکھا ہے، تم ایک بار ان سے مل لو۔“ ستارہ نے چیٹ اسے تھمائی۔

”پھوپھو کہاں دیں گے یہ نوکری؟ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیں گے ٹر خا دیں گے۔“ ازنک نے چٹ پڑتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

”زری آپا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں اس کمپنی میں نوکری ضرور دلائیں گی تم بس ایک بار جبران بھائی سے مل لو، کیا معلوم، اللہ اپنا

دونوں رسورٹ سے باہر نکل آئے۔

”شاہ ویز مجھے طاقت کی طرف اتار دو میں وہیں ڈرائیور کو بلوا لوں گی۔“ گاڑی میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی انوش نے کہا۔

”لیکن کیوں یار میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں؟“ گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے اس نے انوش سے پوچھا۔

”نہیں شاہ ویز، مام نے تمہیں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔“

”ایک نہ ایک دن تو انہیں علم ہونا ہی ہے پھر اب کیوں نہیں؟“

”تم نہیں جانتے شاہ ویز، مام لو میرج کے سخت خلاف ہیں ان کا ماننا ہے کہ لو میرج کامیاب نہیں ہوتی۔“ انوش نے اسے وضاحت دی۔

”حیرت ہے آج کل کے فاسٹ دور میں تمہاری مام کے خیالات اتنے پرانے ہیں؟“

”اچھو سکی انہوں نے اپنے گھر والوں کی مخالفت منول لے کر ڈیڈ سے لو میرج کی تھی، پھر

دونوں میں کچھ MisunderStanding ہوئیں اور دونوں میں Separation ہو گئی،

تب سے مام لو میرج کے سخت خلاف ہیں۔“ انوش نے اسے تفصیل بتائی۔

”اوہ ویری سیڈ اور تمہارے ڈیڈ؟“

”ڈیڈ بہت Compromising انسان ہیں، معاملات کی نزاکت کو سمجھتے ہیں Broad minded ہیں، انہیں تم سے مل کر

خوش ہوگی۔“ انوش کی بات پہ گاڑی ڈرائیور کرتا شاہ ویز مسکرایا۔

”Thank God“ ورنہ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔“ شاہ ویز ایک جگہ ٹوٹن لیا، گاڑی

اب طاقت کے ٹاؤن میں داخل ہو چکی تھی۔

”چل اک دفعہ سن لیتی اس کی بات، آخر زارا کا باپ ہے وہ۔“ بے جی کا دل نرم ہوا۔
 ”بس رہنے دیں بے جی، آپ کا دل فوراً سے نرم ہو جاتا ہے میں اس شخص کے ظلم کبھی نہیں بھول سکتی، جب سکندر اس رقاصہ کے عشق میں اندھا ہو کر مجھے مارتا پینتا تھا۔“ ستارہ دھکے سے بولی تو بے جی نے ایک سر دآہ بھری۔

”یہ مرد بھی اللہ نے عجیب ہی بنائے ہیں، پردوں کی طرح ڈال ڈال پہ بیٹھنا ان کی فطرت ہوتی ہے، آسمان کی دستوں کو تسخیر کرنے کی خواہش اکثر انہیں اپنے اصلی ٹھکانے سے محروم کر دیتی ہے اور پھر جب در بدر کے دھکے کھاتے ہیں تو انہیں اپنے اصلی ٹھکانے کی قدر آتی ہے۔“

”بے جی سچ کہتی ہیں آپ، لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں میں سکندر کو کبھی معاف نہیں کروں گی، وہ کیا سمجھتا تھا میں ساری زندگی اس کے در پہ اس کی ماریں کھاتی رہوں گی؟ اب ایسا نہیں ہو گا بے جی، آج کی عورت مضبوط ہے، اپنا دفاع کرنا جانتی ہے۔“ ستارہ نے حتیٰ انداز میں کہتے ہوئے پھر سے کپڑے سینے شروع کر دیئے تھے اور بے جی خاموش ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

”انوش اتنی دیر کیوں لگائی تم نے۔“ مایین جارحانہ انداز میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”مام وہ طائشہ نے کھانے پہ روک لیا تھا۔“ وہ جڑبڑی بولی۔

”جب تم نے مجھے کہا تھا کہ تم آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤ گی تو کیا ضرورت تھی وہاں رکنے کی؟ گھڑی دیکھی ہے رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔“ مایین غصے سے بولیں تو انوش سر جھکا گئی۔
 ”سوری مام وہ..... طائشہ نے..... بہت اسرار کیا تھا اور۔“

کرم کر دیں ہم پہ۔“ ستارہ نے یقین سے کہا۔
 ”پھپھو آپ کہتی ہیں تو مل لوں گا جبران صاحب سے، ورنہ امید نہیں ہے مجھے۔“ انزک نے چٹ اپنے والٹ میں رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اللہ خیر کرے گا انشاء اللہ۔“ ستارہ نے امید دلائی اور وہ خاموشی سے بائیک کی طرف بڑھا۔

”ارے ہاں یاد آیا، پھپھو آج تو زارا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا؟“ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے انزک کو یاد آیا۔
 ”ہاں مجھے یاد ہے انزک، تم فکر مت کرو، میں زارا کو دکنشے میں لے جاؤں گی اور ویسے بھی آج صرف اس کا روٹین کا چیک اپ ہی تو ہے۔“

”اگر آپ کہتی ہیں تو میں رک جاتا ہوں۔“ انزک نے پوچھا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے میرے شہزادے، تم جس کام سے جا رہے ہو جاؤ زارا کو آج میں خود لے جاؤں گی۔“ ستارہ نے سلائی مشین چلائی۔

”چلیں ٹھیک ہے پھر، میں اب چلتا ہوں۔“ انزک بائیک گیٹ سے باہر نکالنے لگا۔
 ”اللہ کے حوالے۔“ ستارہ نے ایک لمحے کے لئے سر اٹھایا اور پھر سے سلائی میں مصروف ہو گئیں، توقف کے بعد بے جی چھڑی کے سہارے اس کے قریب آئیں اور سامنے رکھتے موڑے پہ بیٹھ گئیں۔

”اور کیا کہتا تھا وہ کم بخت؟“
 ”کہنا کیا ہے بے جی، معافی مانگ رہا تھا مجھ سے اور زارا سے ملنے کی التجا بھی، میں نے تو صاف انکار کر دیا۔“ ستارہ نے سلائی مشین روکتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

”کہ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“

”کم آن مابین..... کیا ہو گیا ہے اگر وہ تھوڑی دیر اپنی فریڈ کے پاس رک گئی تو۔“
ذویر نے مداخلت کی۔

”بہتر ہوگا کہ آپ میرے معاملات میں ٹانگ مت اڑاؤ۔“ مابین نے غصے میں ذویر کو گھورا۔

”ہم دونوں اس وقت اپنی بیٹی سے بات کر رہے ہیں، تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے یہ۔“ ذویر نے جتایا۔

”اچھا تو اب بڑی محبت جاگ گئی ہے بیٹی کی دل میں، اس وقت کہاں تھے تم، جب میں اس کو پالنے پونے کے لئے اس دنیا کی ٹھوکریں کھا رہی تھی؟“ تنفر سے پوچھ گیا۔

”مجھے شوق نہیں تھا کہ کم زمانے کی ٹھوکریں کھاؤ، وہ فیصلہ بھی تمہارا اپنا تھا تم اکیلی رہنا چاہتی تھی۔“

”ہاں سارے قصور میرے ہی تو تھے۔“ وہ طعنے بولیں۔

”مام ڈیڈ پلیز، آپ دونوں آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟“

”آئی ایم سوری مام آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“ انوش نے معافی مانگی تو مابین تن فن کرتیں اسنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”ریلیکس ڈیڈ آپ بیٹھے یہاں۔“ انوش نے ذویر کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے پہ بٹھایا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ انوش ان کے قدموں میں بیٹھے ہوئے بولی۔

”بہتر ہوں میری جان، بخار کی وجہ سے تھوڑی وکیلنس ہے، وہ بھی ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہوں نے پیار سے بیٹی کا سر

تھپکایا تو انوش نے اپنا سر ان کے گھٹنوں سے ٹکا لیا۔

”جب مام آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھیں تو آپ نے انہیں منع کیوں کر دیا۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ مابین پہ میری بیمار کا عقدہ کھلے۔“ ذویر اب اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

”ڈیڈ آپ مام کو بتا کیوں ہیں دیتے کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”نہیں..... میں مابی کو ہلکت کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے

ہمدردی کرے، محبت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرنے کی خواہش، اس کی ہمدردی پا کر پوری نہیں ہو سکتی۔“ ان کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”مام بہت پچھتا میں گی۔“ انوش دیر سے بولی۔

”چھوڑ دو میں نے بھی سب کچھ وقت کے سپرد کر دیا ہے، آنے والا وقت خود مابی کو بتائے گا کہ کون محرم تھا اور کون مجرم۔“

”ڈیڈ آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کے بغیر ایک ادھوری زندگی گزاری ہے، مام نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اس کے باوجود دنیا کی کوئی بھی چیز آپ کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔“ اس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

”والدین کی کمی چیزوں سے پوری نہیں ہوا کرتی میری جان۔“

”ڈیڈ میں اب آپ کو واپس نہیں جانے دوں گی۔“ انوش نے ان کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے، ذویر ہنسکرائے۔

”اور تمہاری مام کا کیا ہوگا جو مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہے۔“

”ان کے معاملے میں آپ کو تھوڑا صبر کرنا پڑے گا، پھر وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے

ضرورت نہیں ہے، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ؟“ دوزیز نے اس کے کندھے پہ چمکی دی، تو اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

☆☆☆

ستارہ شام کو زارا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے والی تھی لیکن ستارہ کو زارا کی میڈیکل رپورٹ والی فائل نہیں مل رہی تھی، پورا گھر چھان مارا تھا۔

”پھپھو ایک بار انزک بھائی کے روم میں بھی چپک کر لیٹے ہیں لاسٹ ٹائم وہی آپ کو لے کر گئے تھے ہاسپٹل، کیا معلوم انہوں نے فائل اپنے روم میں ہی کہیں رکھ دی ہو؟“ کوئل نے ستارہ کو یاد دلایا تھا۔

”ہاں بالکل یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ ستارہ نے تائید کی اور پھر وہ دونوں انزک کے کمرے میں آ گئیں۔

”تم سائیڈ ٹیبل کے درواز چپک کرو میں الماری میں دیکھتی ہوں۔“ ستارہ نے کوئل سے کہا اور خود الماری کی طرف بڑھ آئی، الماری کے درواز میں چپک کرتے کرتے ایک کاغذ نے ستارہ کی توجہ مبذول کروالی تھی۔

اور وہ کاغذ دیکھتے اور پھر پڑھتے ہوئے ستارہ کے اوسطان خطا ہو گئے تھے۔

”یہاں تو کہیں نہیں ہے پھپھو۔“ کوئل مایوسی کے عالم میں ستارہ کے عقب میں آکھڑی ہوئی۔

”یہ کیا ہے پھپھو؟“ کوئل نے حیرت سے ستارہ کو دیکھا، جو آنکھیں پھاڑے ساکت و جامد کاغذ کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہائے اللہ..... یہ..... یہ تو انزک کا۔“ ایک ہاتھ سے وہ کاغذ پکڑے دوسرا ہاتھ دل پہ رکھے وہ درط حیرت میں جھلائی۔

(باقی آئندہ ماہ)

یقین سے کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو، اچھا مجھے ایک بات بتاؤ، یہ ماہین ہمیشہ سے تمہیں ایسے ہی ڈانٹتی ہے۔“ ان کی گفتیش پہ انوش مسکرائیں۔

”نہیں ڈیڈ بس بھی کبھار غلطی بھی تو میری ہی تھی ناں۔“ انوش نے اعتراف کیا۔

”آئندہ ایسی غلطی مت کرنا ورنہ پھولن دیوی چھوڑے گی نہیں تمہیں۔“ دوزیز کے ساتھ ساتھ انوش بھی ہنس دی، لفظ پھولن دیوی یہ۔

”ڈیڈ مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“ توقف کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”کیسی بات؟“

”ڈیڈ وہ..... وہ مجھے شاہ ویز کے بارے میں آپ کو بتانا تھا۔“ جھجکتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

”کون شاہ ویز؟“ وہ حیران ہوئے۔

”شاہ ویز مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ ہاتھ کی انگلی کو مسلتے ہوئے اس نے اپنے دل کی بات بتائی۔

”کیا مامی جانتی ہے شاہ ویز کے بارے میں؟“ انہوں نے استفسار کیا، انوش نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں ڈیڈ، پہلے آپ شاہ ویز سے مل لیں، پھر مام کو بتاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے میری جان، تم جب کہو گی میں مل لوں گا شاہ ویز سے۔“

”ڈیڈ مجھے آپ کی سپورٹ چاہیے، مام اتنی آسانی سے شاہ ویز کو ایکسیپٹ نہیں کریں گی، جب انہیں یہ علم ہوگا کہ شاہ ویز مجھے پسند کرتا ہے اور..... وہ پوتے بولتے الجھ کر رک گئی۔

”میرے بچے تمہیں پریشان ہونے کی

مشہور واکار اسٹوریٹ

تحسین اختر

ہوا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے انزک، کامیابیاں تمہارے قدم چومیں۔“ ستارہ آبدیدہ لہجے میں اسے دعا میں دیتی بستر سے اٹھیں۔

”آج زارا کا باپ اس قابل ہوتا تو.....“ بولتے بولتے ستارہ کی آواز رندھ گئی۔

”زارا ہماری آنکھوں کا تارا ہے پھپھو، آپ اس گھٹیا شخص کا نام مت لیا کریں، وہ آپ کو

ڈھلتی شام کے سائے آفاق منزل کی منڈیروں سے رخصت ہو رہے تھے، جب وہ کمر میں داخل ہوا تو زارا بخار میں تپ رہی تھی، ستارہ پھپھو زارا کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں، سب اس کے گرد متشکر سے بیٹھے تھے۔

”اٹھیے پھپھو، میں نے زارا کا چائلڈ اسپیشلسٹ سے اپوائنٹ منٹ لے لیا ہے۔“ وہ اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتا کمرے میں داخل

ناولٹ

سوٹ ہی نہیں کرتا تھا اسے اپنی زندگی کا بھیانک چیلنر سمجھ کر بھول جاتیں۔“ انزک کی بات پہ اثبات میں سر ہلاتی ستارہ الماری سے اپنی چادر نکالنے لگی۔

اور پھر آدھے گھنٹے کے بعد وہ ڈاکٹر کے پاس موجود تھے زارا کے کچھ ٹیسٹ لئے گئے تھے جن میں ٹائی فائیڈ بخار سامنے آیا تھا، ڈاکٹر نے کچھ انجکشن اور میڈیسن لکھ دی تھیں۔

ستارہ کے شوہر سکندر نے دوسری شادی کر لی تھی، سکندر ایک جوئے باز شخص تھا اور بازار حسن کی ایک رقاہ۔ نیلم افروز کا عاشق تھا اور جو کماتا جوئے میں ہار دیتا نیلم افروز پہ بچھا کر دیتا۔

ستارہ نے اسے راہ راست پہ لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ سدھرا سکندر، ستارہ کو بری طرح سے مارنا پیتا تھا، ایک دن اس نے ستارہ کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا اور خود نیلم افروز سے



بارہویں قسط



تھا، حر کے سبھی دوست احباب اس محفل میں سوگوار انداز میں شریک تھے، مریم کی صورت آنا نہ چاہتی تھی، مگر منصور کے اصرار کے آگے وہ اپنے نہ آنے کا کیا جواز پیش کرتی، منصور یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ بانی ہر جگہ وہ خوش خوشی جاتی ہے مگر حر عباس کے گھر جانے سے کیوں ہچکچاتی ہے اس لئے منصور کو کسی بھی قسم کے شک سے بچانے کے لئے وہ آگئی تھی، اندر کمرے میں عورتوں کا انتظام تھا اور باہر لان میں آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا، وہ گھر کے اندر عورتوں کی محفل میں آکر بیٹھ گئی تھی، محفل اپنے جو بن پر مچی۔
”کسی نے خوب کہا ہے۔“

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد مجلس اختتام پذیر ہوئی تھی۔
مجلس کے بعد کھانے کا انتظام تھا، ملازمین کھانا سرود کرنے لگے تھے، اب عورتیں دل ہلکا کرنے کے بعد باتوں میں مشغول ہو گئی تھیں، مریم کو بھی کئی عورتوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

مریم نے کھانا کھانے کے بعد منصور کے موبائل پر کال کی تھی کہ گھر چلیں، منصور نے اسے باہر آنے کا کہا تھا، وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھی اور بڑے ہال سے باہر نکل گئی تھی۔

یہ اتفاقی حادثہ تھا یا کچھ اور بہر حال اسے باہر نکلنے کی جلدی تھی یا پتہ نہیں حر عباس کو اندر آنے کی، وہ دونوں بری طرح آپس میں کھرائے تھے، حر عباس نے مریم کو گرنے سے پہلے ہی سنبھال لیا تھا، مریم لڑکھڑانے سے کم مگر اس پر حدت بانہوں کے کسی سے زیادہ شیشائی تھی، وہ یوں بدک کر پیچھے ہٹی تھی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو، حر عباس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی، بڑے

شادی کر لی زارا اس وقت صرف ایک سال کی تھی، سکندر نے پلٹ کر کبھی ستارہ اور زارا کی خبر تک نہ لی، پھر کچھ ہی عرصے کے بعد انہیں علم ہوا کہ سکندر روہی چلا گیا ہے۔

ستارہ ایک بوٹیک کے لئے کپڑے سلائی کر کے اپنی اور زارا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی، یوں وقت گزرتا رہا۔
واپسی یہ زارا کی دو انیاں لینے کے لئے انزک نے ایک میڈیکل سٹور کے سامنے گاڑی روکی تھی، قریب سے ایک رکشہ گزرا تھا اور رکشہ چلانے والے کو دیکھ کر حیرت سے ستارہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

☆☆☆

رات بارہ بجے کا وقت تھا پری کو نیند نہیں آ رہی تھی خود کو بھلانے کی خاطر وہ موبائل پر فیس بک دیکھ رہی تھی، دفعتاً اس کا بیڈ زور سے ہلا تھا اور پھر کمرے کی ہر چیز ہلنے لگی تھی۔
باہر سے لوگوں کے بھاگنے اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگی تھیں اب اس کے سائیڈ ٹیبل سے چیزیں نیچے گرنے لگیں،

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا وہ آج زمین میں دفن جائے گی۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ آفاق منزل میں پریشانیوں کے بادل جھٹتے جا رہے تھے، کوئل کے سسرال والوں کو شادی کی تاریخ دے دی گئی تھی اور گھر میں چھوٹی موٹی چیزوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔

انزک آفاق آج کل چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرنے کا سوچ رہا تھا، اسی حوالے سے وہ آج کل اپنے دوستوں سے صلاح مشوروں میں

حر عباس کے گھر محفل مجلس کا انعقاد کیا گیا

دونوں بعد دشمن جان کا سامنا ہوا تھا مگر رومانی زبردست ہوئی تھی، وہ مسکراتا ہوا اپنی سمت مڑ گیا تھا اور وہ تملاتے ہوئے باہر آگئی تھی۔

☆☆☆

”علوی ہاؤس“ میں بڑے پیمانے پر فنکشن کا انعقاد کیا گیا تھا اور یہ فنکشن یاشر علوی اور چنگی یاشر کے لئے تھا، اس کلاس کی ایکسٹرنل یہ بھی ہے کہ اندر ہی اندر چاہے جتنی مرضی محمودی جتنی رہے مگر ڈپلومیسی یہی ہے کہ باہر دنیا کو سب اچھا ہے ہی دکھانا ہے، یاشر علوی کی شادی سے بے شک کوئی خوش نہ ہوا تھا مگر اس وقت تمام فیملی ممبرز اس فنکشن میں یوں شریک ہو رہے تھے اس سے بڑھ کر خوش کوئی اور نہ ہو۔

یاشر علوی نے سب دوستوں اور اپنے آفس کے سبھی لوگوں کو بلایا تھا، باقی تو سب ہی آئے تھے مگر حریم نہ آئی تھی، گو کہ اسے یاشر علوی کی شادی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر مشائخ جس طرح اس کی دشمن بن چکی تھی اور جس طرح اس سے خار کھائے بیٹھی تھی، وہ مگر بھی اس کا سامنا خود سے نہ کرنا چاہتی تھی، یاشر نے خود کرن سے پوچھا بھی تھا کہ حریم کیوں نہیں آئی، انہوں نے اس کی طبیعت کی خرابی کا بتا دیا تھا جو اس نے سب سے خود ہی کہا تھا۔

اس فنکشن کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ ریشم علوی بھی امریکہ سے آئی تھی اور اس وقت چنگی سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لئے وہ ”منوسٹ وانڈ“ بنی ہوئی تھی۔

مریم منصور کے ساتھ آئی تھی، سبھی اس سے اوپری دل کے ساتھ ملے تھے، انہوں نے آج تک منصور کو مریم کے لئے قبول نہیں کیا تھا، مریم کو آج بھی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چنگی بہت خوش تھی، اسے پاکستانی فنکشنز،

ویسے ہی بہت اٹریکٹ کرتے تھے اس لئے اس نے یاشر کی مام سے کہہ کر خود اپنے لئے ڈیپ ریڈ کلر کا لہنگا بنوایا تھا اور اب اتنا بھاری بھر کم لہنگا اس نے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، اس لئے اس نے ادھر ادھر پھرنے اور لوگوں سے ملنے کا ارادہ ترک کیا تھا اور اس پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

”تھک گئی ہو۔“ یاشر اسے بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

”ارے نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھی۔

”پھر یہاں کیوں آ کر بیٹھ گئی ہو، ابھی تو میں نے تمہیں اور بھی بہت سارے لوگوں سے ملوانا تھا، یہ لہنگا اور یہ زیور یہ مجھے چلنے دیں گے تو میں کسی سے ملوں گی۔“ وہ اپنے ڈرائیو کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ اس کی بات سمجھ کر یاشر نے قہقہہ لگایا تھا، بہت سے لوگوں نے اس خوبصورت لہنگی کو مڑ کر اور رشک سے دیکھا تھا، یاشر کے سرکل کی بہت ساری لڑکیاں اس پر مرقی تھیں اور علوی انڈسٹریز کے اگوتے سپوت کو ہاتھ سے کب جانے دینا چاہتی تھیں، مگر یاشر کب کسی کے ہاتھ آیا تھا، وہ تو جس دور دیں کی چنگی کی سنہری زلفیوں کا یوں اسیر ہوا تھا کہ باقی ہر لڑکی پیچھے رہ گئی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے ہم بھی یہیں بیٹھیں گے۔“ وہ بھی اس کے برابر بیٹھے ہوئے بولا تھا۔

اس محبت پر چنگی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”اوہ یہ لو برڈز اکیلے ہی چونچیں لڑا رہے ہیں، ہم بے چاروں کو بھی پوچھ لو جی اتنی دور سے آئے ہیں۔“ ریشم اپنی ریشمی ساڑھی سنبھالتے ہوئے اوپر اسٹیج پر آئی تھی اور یاشر کے کندھے پر دھپ لگا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی، اتنے میں

غصہ آنا تو اس پر چلتا تھا۔
”چلو چھوڑو یہ رام کہانی اور آؤ ہم بھی اسٹج پر جا کر کچھ کس بنواتے ہیں، چلو کیا یاد کرو گے۔“
وہ نواذ کا بازو تھام کر کچھ سچ چلنے لگی تھی۔

☆☆☆

”حریم میں آپ سے ناراض ہوں۔“ یاشر نے آفس میں حریم سے کہا تھا۔
”کیوں سر، کوئی غلطی ہو گئی۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”جب میں نے بلایا تھا تو آپ کیوں نہیں آئیں۔“
”سر میری طبیعت خراب تھی۔“ وہ نظر چرا کر بولی تھی۔

”ہاں مجھے پتہ چل گیا تھا، مگر خدا نخواستہ اتنی زیادہ تو خراب نہیں تھی کہ آپ میرا اتنا اہم فنکشن مس کر دیتیں۔“
”سوری سر، مگر واقعی اس دن میری بہت طبیعت خراب تھی، ورنہ میں ضرور آتی۔“

”چلیں مان لیا، مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔“
”ویری سوری سر، بس میری مجبوری تھی۔“
”اُس اوکے۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا، حریم کی جان میں جان آئی تھی، ورنہ ان دنوں جس ذہنی ٹینشن سے وہ گزر رہی تھی، اس قسم کے حالات میں وہ باس کی طرف سے مزید کسی ٹینشن کی محتمل نہیں ہو سکتی تھی۔

بے شک روز و شب وہی تھے، وہی آفس تھا اور وہی ہاسٹل، مگر جب سے گھر چھوٹا تھا تب سے جیسے سب کچھ بدل گیا تھا، دل کی دنیا جو بدل گئی تھی اس لئے سب کچھ بدلا بدلا لگتا تھا، وہ خود کو بھری دنیا میں اکیلی اور تنہا محسوس کرتی تھی، یوں جیسے کسی نے بھری بھیر میں ہاتھ چھوڑ کر تنہا کھڑا کر دیا ہو، اپنی مٹی اپنے گاؤں اپنے رشتوں کو

اس کے کیوٹ اور گورے چٹے بچے بھی شوق سے آکر ماموں اور مامی کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے، فوٹو گرافرز نے کمرے سیدھے کئے تھے اور دھڑا دھڑ تصویریں لینے لگے تھے۔

”یار کیا قیامت لگ رہی ہو۔“ فواد تنویر کب سے مشائیم کے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا اور وہ جان بوجھ کر اسے لفٹ نہیں کروا رہی تھی، بلیک ستاروں والی سلیولیس اور بلیک لیس میکسی میں وہ غضب ڈھا رہی تھی، علوی خاندان کی اس آخری کنواری رہ جانے والی بیٹی پر یہ تنکڑوں نظریں جمی ہوئی تھی، تمام لڑکے اس کے قریب آنا چاہتے تھے، اسے اپنانا چاہتے تھے مگر اسے بہت بار ایسے تجربے ہوئے تھے کہ اب وہ بھی کسی کے جھانسنے میں نہیں آنے والی تھی، ایک واحد فواد تنویر اپنی کھری اور بچی فطرت کی وجہ سے اس کے قریب تھا، مگر آج تو اسے بھی لفٹ نہیں مل رہی تھی۔

”یہ بات تو ایک گھنٹے میں کئی بار میں سن چکی ہوں۔“ اس نے فواد کو ستانے کا ارادہ ترک کیا تھا اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو کر بولی تھی۔

”اچھا تو اسی لئے اتنا کڑ رہی ہو۔“ وہ بھی تنک آگیا تھا، اس لئے حساب برابر کیا تھا۔
”دیکھو آج کے اس فنکشن میں میرے جیسا کوئی اور ہے۔“ وہ ساری محفل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بولی تھی۔

”بہت سے ہیں، مگر یہ بات کرو کہ جن کی نظروں میں تم سائی ہو پھر انہیں کوئی اور نہیں بھاتا۔“

”اچھا اگر میرے جیسے بہت سے ہیں تو جاؤ ان کے پاس، پھر میرے پیچھے کیوں خوار ہو رہے ہو۔“ فواد نے شرارت ہی شرارت میں اس کی گردن میں انکے سر سے کو تھوڑا سا نیچے کر دیا تھا،

دور از زمین و آسمان
اک سرزمین عشق ہے
اس کے گستان پر فضا اس کی بہاریں
دل نشین!
اس کی زمین خوشنما اس کی فضا میں سرمریں
اس کے نظارے دل کش، اس کی ہوا میں
عزیزین!
مثل بہشت گل فشان!
اک سرزمین عشق ہے

رات کا کچھ حصہ بیت گیا تھا اور کچھ ابھی
باقی تھا، اس کے سیل فون پر نہال نے یہ دل کو چھو
لینے والی نظم واٹس ایپ کی تھی، وہ پڑھتی گئی تھی اور
ہر لفظ ہر حرف پر اس کی پلمیں تشکرانہ عاجزی سے
جھکی جاتی تھیں۔

”سو گئی ہو؟“ ساتھ ہی میسج آیا تھا۔
”نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ پوچھنے لگا تھا۔

”بس سونے لگی تھی۔“

”مجھے یاد کیے بغیر۔“

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔“ اس نے بھی ٹائپ
کیا تھا۔

”میں کیا جانوں۔“

”اچھا جناب جو بندہ سرزمین عشق کی باتیں

کرتا ہے وہی نہیں جانتا مقام حیرت ہے۔“

”ہا ہا ہا تمہاری اردو بہت اعلیٰ پائے کی ہو گئی

ہے۔“ اس نے چھیڑا تھا۔

”پہلے بھی تھی، ابھی نہیں ہوئی۔“

”چلو یہ بھی مان لیتے ہیں، جناب ہم اس

دنیا میں اور کرنے ہی کیا آئے ہیں، سوائے آپ

کی ماننے کے۔“ رات کے پرفسوں ماحول میں

اس کی گھیر آواز حریم کے دل کے سارے تار ہلا

گئی تھی، وہ اب کے خاموش ہو گئی تھی۔

چھوڑنا آسان تھوڑی ہوا کرتی ہے، یہ تو وہی جان
سکتا ہے جو اس تکلیف کو جھیل چکا ہو۔
وہ ابا کی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی،
بس اسی دن سے ڈرتی تھی، مگر ابانے آگے کے
حالات نہیں سوچے تھے اور لیتی بیگم سے ناٹ جوڑ لیا
تھا اور لیتی بیگم نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے، وہ
کیسے بھول سکتی تھی، اگر نہال اور ان کی امی کا
حوصلہ اور ساتھ نہ ہوتا تو وہ شاید زندہ بھی نہ رہ
سکتی، انہوں نے اسے ٹوٹ کر بکھرے نہیں دیا
تھا۔

”ٹک ٹک ٹک۔“ یاشر نے اسے گہری
سوچوں میں ڈوبا دیکر کرئیل پر اپنا پین بجایا تھا،
وہ چونک کر حال میں واپس آئی تھی۔

”جج..... جی سر۔“

”آپ کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔“

”نہیں، کہیں نہیں۔“ اس نے ہاتھ میں
پکڑی ہوئی فائل سینے سے لگائی تھی اور اٹھ کھڑی
ہوئی تھی۔

”سر میں جاؤں اب۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ یاشر کا فون آ رہا تھا، اس
نے سر ہلایا تھا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”اف جان چھوٹی۔“ یاشر کے کمرے سے
نکل کر وہ لمبی لمبی سائیس لینے لگی تھی۔

مشائم نام کی بلا اس کی جان کو چٹ گئی تھی،
اس سے ڈرتے ہوئے اور کسی بھی بدمزگی سے
بچنے کے لئے وہ نہیں گئی تھی۔

☆☆☆

اک سرزمین عشق ہے

ہنگامہ عالم سے دور، آفت گرہستی سے دور

اس مگر کی دنیا سے دور، اس ظلم کی بستی سے دور

اس رات اس دن سے الگ، اس اوج اس بستی

سے دور

”جب میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں پھر تمہیں ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“
 ”مگر کیا..... حریم کیا مجھ پر یقین نہیں۔“ وہ دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ اسے پکار کر بولا تھا۔

”اس پوری دنیا میں ایک ہی تو شخص ہے جس پر مجھے خود سے بھی زیادہ یقین ہے۔“ اس نے اپنے جذبات کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالا تھا۔

”اور پھر بھی ڈرتی ہو۔“

”بی بی، یو، یار، نہال تمہارے ساتھ ہے۔“
 ”اچھا اب سونے بھی دو گے یا یونہی باتوں میں لگائے رکھو گے۔“ وہ نیند کے ہاتھوں بے حال ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”بڑی بد ذوق لڑکی ہو تم، میں تمہیں اپنے دل کی باتیں بتا رہا ہوں اور تمہیں نیند کی پڑی ہے۔“

”بائے میں سو گئی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر فون بند کر دیا تھا، دوسری طرف نہال بد مزہ ہو کر برے برے منہ بناتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

موجود کام ڈھونڈنے کے چکروں میں تھا یا دوستوں کے ساتھ ٹائم ضائع کرتا تھا، یہ وانیہ کو نہیں پتہ تھا بس اتنا پتہ تھا کہ وہ سارا سارا دن کھر سے باہر گزاردیتا تھا، جن حالات میں وانیہ کی دل جوئی ضروری تھی یا اسے حقیقت میں پیار و محبت کی ضرورت تھی، انہی حالات میں وہ تنہا اور الگ ہوتی جا رہی تھی، موجود نے پہلے کی طرح اس کا خیال رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا، بلکہ وہ جب بھی کوئی بات کرتی وہ چڑچاتا تھا، سارا دن وہ چھوٹے سے قلیٹ میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھرتے

”بولونا۔“ وہ مدہم سی آواز میں بولا تھا، حریم کو لگا اس نے اس کے بالکل کان کے قریب سرگوشی کی ہے۔

”ہیلو! حریم سو گئی ہو۔“ کوئی آواز نہ پا کر اس نے پکارا تھا۔

”ہوں نہیں۔“ وہ اس جادوگر کی جادوگری سے نکل کر بولی تھی۔

”ادوہ میں سمجھا، سو گئی ہو شاید۔“

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں ہو سکتا، اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں۔“

”آج یا شرم صاحب آفس میں پوچھ رہے تھے کہ میں ان کے گھر ان کے فنکشن میں شامل کیوں نہیں ہوئی۔“ اس نے اس پرفسور ماحول سے نکلنے ہوئے نہال کو بتانا شروع کر دیا تھا۔

”اچھا پھر تم نے کیا کہا۔“
 ”کیا کہتی بس یہی کہ میری طبیعت خراب تھی۔“

”ویسے بائی دا وے، محترمہ حریم شہباز صاحبہ، آپ وہاں کیوں نہیں گئیں حالانکہ میں نے منع تو نہیں کیا تھا۔“ اسے حریم کو چھیڑ کر پھر مزے لے کر اچھا لگتا تھا۔

”میں مشائم کی وجہ سے نہیں گئی، بس یہی اگلوانا تھا نا مجھ سے۔“

”یار ناراض تو مت ہو، میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا، ویسے بھی تمہیں مشائم سے ڈرنے یا چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں کوئی اس کے باپ یا بھائی کی پرارپی نہیں ہوں جس پر وہ ہر وقت اپنا حق جتاتی رہے اور یہی بات سمجھانے کے لئے تو میں نے کئی بار اسے منہ توڑ جواب دیا ہے۔“

”ہاں اور اسی بات کو لے کر وہ تماشہ لگاتی ہے اور مجھے تماشہ بننے سے ہی تو ڈر لگتا ہے۔“

نکل رہا ہے۔“

آج کوئی اس کا خیال نہیں رکھنے والا تھا، اس نے انگلی دوسرے ہاتھ سے دبائی تھی اور کچن سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی، دل جیسے ذرا سی دیر میں ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا، پھر کہاں موصد یاد رہا تھا اور کہاں اس کا من پسند کھانا۔

بس من کے اندر برسات تھی جو کھل کر ہو رہی تھی اور وہ اس برسات میں اندر ہی اندر ڈوب رہی تھی۔

☆☆☆

بارش کی برستی بوندوں نے جب دستک دی دھواڑے پر محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا ہوا کے ہلکے جھونکے کی جب آہٹ پائی کھڑکی پر محسوس ہوا تم گزرے ہو احساس تمہارے جیسا تھا میں نے گرتی بوندوں کو روکنا چاہا ہاتھوں پر اک سرد سا پھرا جاسا ہوا وہ بس تمہارے جیسا تھا تنہا میں چلا پھر بارش میں تب اک جھونکے نے ساتھ دیا میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے وہ ساتھ تمہارے جیسا تھا پھر رک گئی وہ بارش بھی رہی نا باقی آہٹ بھی میں سمجھا مجھے تم چھوڑ گئے انداز تمہارے جیسا تھا وہ بڑے سے لان کے ایک کونے میں بنے ہوئے تالاب کے کنارے پر رنگ برنگی روشنیوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور یاد کا دیا تنہا شخ کے نام پر ہی جل رہا تھا بے شک آج کی شام فواد تنویر کی سنگت میں بہت حسین اور خوشگوار گزری تھی مگر وہ اک شخص جو دل کا مکالمہ ایسے قبضے میں لے کر بیٹھا تھا کہ نہ نکلتا تھا اور نہ کسی اور کو اندر آنے دیتا تھا۔

باشراور پنگی چھ بجے کی فلائٹ سے ناورن ایریاڑ گھونسنے نکل گئے تھے، پنگی نے سوئٹز لینڈ تو بہت بار دیکھا تھا جبکہ باشرا سے اپنے پاکستان

پہرے گزار دیتی تھی، ٹی وی بھی کتنا دیکھ لیتی بس کوئی کام جیسے زندگی میں کرنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ ہاں آج کل ایک کام وہ بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے کر رہی تھی اور وہ تھانیٹ یہ سوشل میڈیا یہ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈنے کا، مگر وہ دونوں شاید سوشل میڈیا استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی ہر کوشش بے کار ہوتی نظر آتی تھی، وہ گھنٹوں بیڈ پہ لیٹی فیس بک پہ سرچ کرتی رہتی تھی مگر بے سود۔

”موصد کے لئے آج کچھ اچھا سا بناتی ہوں۔“ آج موڈ کچھ اچھا تھا اور باہر موسم بھی خوشگوار تھا، اس لئے وہ ساری کسلندی اور سستی ایک طرف ڈال کر بڑی ہمت سے اٹھی تھی۔

کچن میں سبزیاں کاٹتے ہوئے اس نے اپنی انگلی بھی کاٹ لی تھی، درد اتنا شدید تھا کہ وہ بلبلاتا رہی تھی، اس نے پورا تھل کھول کر خون سے تر تر انگلی تل کے نیچے کر دی تھی اور خود رونا شروع کر دیا تھا۔

”یہ تمہاری انگلی پہ زخم کیسا ہے۔“ حالانکہ وہ زخم نہیں تھا بس ایک چھوٹا سا نشان تھا جو جانے ماما کو کیسے نظر آ گیا تھا۔

”یہ..... ماما یہ میں کل کچن میں پانی پینے گئی تو میرا ہاتھ ذرا سا گرم برتن سے چھو گیا تھا۔“ اس نے ہنس کر کہا تھا، اور اتنی سی بات پر ممانے سارے ملازموں کو لائن حاضر کر لیا تھا کہ وانیہ کچن میں گئی تو کیوں اور پھر اس کو زخم آیا تو کیسے، وہ سارے کیا مفت کی تنخواہ لے رہے ہیں، وہ ایک ایک پر برس رہی تھیں، وہ ماما کی اس محبت پر بیٹھے مسکراتے ہوئے جوس کے سیپ لیتی رہی تھی۔

”اور آج کیا ماما کا دل نہیں تڑپا ہوگا، کہ ان کی لاڈلی بیٹی کی انگلی کیسے کٹ گئی اور کیسے خون

ہے۔“ خان بابا نے دوبارہ اپنی چارپائی کی جانب جاتے ہوئے اسے دکھ کر سوچا تھا اور ایک وہ لوگ تھے دن بھر کے کام کاج کے بعد چارپائی پر گر تے ہی ایسی نیند آتی تھی کہ صبح کی خبر لاتی تھی اور ایک یہ لاکھ پتی کروڑ پتی تھے جو ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتے تھے۔

جب صبح کی اذانیں ہونے لگیں تو وہ اندر آئی تھی اور میز ہیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی تھی اور نہ آتے ہی بستر پر ڈھس گئی تھی، نہال کی یاد کا دیا ساری رات جلتا رہا تھا اور ملا پھر بھی کچھ نہیں تھا، وہ خالی کی خالی تھی، مگر کہتے ہیں ٹاکہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے، ساری رات کے جاگنے کے بعد اب وہ بھی منٹوں میں بے سدھ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”اوجا حارہ ادھر آ جا اپنے باپ کو روٹی دے آ، وہ منہ خود تو چلی گئی مگر اس کا ماتم ہی ختم نہیں ہوتا، دیکھا ایک دن خود ہی ٹھوکریں کھا کے واپس اسی گھر میں آئے گی اور میرے سامنے اگر ناک سے بھی لکیریں نکال کے معافی مانگے گی تو میں ایسے معاف نہیں کروں گی، صبح اٹھتے ہی لٹنی کا واویلا شروع ہو جاتا تھا جس میں روزانہ ہی نت نئے انداز میں حریم کو کوٹنے جاتے تھے۔“ اس نے چنگیر میں روٹی رکھی تھی اور اوپر سالن کی کٹوری رکھ کر حارہ کو تھمائی تھی، وہ ذرا دور نیم کے درخت کی چھاؤں تلے گم صم لیٹے باپ کے پاس لے گئی تھی۔

”لے لیا کھانا کھالے۔“ اس نے کہا تھا۔

”لا ادھر بھوک تو نہیں ہے، مگر کھانا تو بڑے گا ورنہ تمہاری ماں سارا دن بولتی رہے گی۔“ شہباز نے اٹھ کر چنگیر اپنے سامنے کی تھی اور بے دلی سے نوالہ توڑنے لگا تھا، حارہ واپس چلی گئی

کے وہ علاقے دکھانا چاہتا تھا جو سوئٹز لینڈ سے بھی زیادہ خوبصورت تھے، پتنگی کے آنے سے گھر میں جو نامعلوم سی پلچل مچی تھی، وہ عارضی طور پر آج دم توڑ گئی تھی اس لئے اسے اندر بھی سناٹا محسوس ہو رہا تھا اور باہر بھی۔

”تم میرے دل سے نکلتے کیوں نہیں ہو۔“

اس نے اندر ہی اندر خود کو ڈانٹا تھا، وہ پتنگی یہ نہ جانتی تھی کہ دل کے دروازے بس ایک بار کھلتے ہیں، بار بار نہیں جو اندر آ گیا، وہ اندر ہی رہ جاتا ہے اور جو باہر نکل گیا، وہ بس باہر ہی رہ گیا۔

اس نے غصے اور طیش میں اٹھ کر لہلہاتے پودوں کو جڑ سے اکھاڑنا شروع کر دیا تھا، خان بابا ذرا دور چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اس کی نظر پڑی تو دوڑ کر آیا تھا۔

”لڑے بی بی یہ تم کیا کرتے ہو۔“ اس سے پہلے کہ وہ پودوں کو مزید نقصان پہنچاتی، خان بابا سامنے آ گیا تھا۔

”ہٹو بی بی، یہ میرے بچے ہیں، تمہیں انہیں برباد کرنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ چلایا تھا۔

”ہٹو، ہٹو، خان بابا پودوں کے معاملے میں بہت حساس تھا، اگر اس کے پودوں کو کچھ ہو جاتا تو وہ برداشت نہیں کر پاتا تھا کہ سامنے کون ہے اور کیوں ہے۔“

”ابھی بھی اس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ مشائیم مالک ہے اور وہ مالی۔“ بس وہ اپنے نرم و نازک پودوں کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مشائیم پودے کو چھوڑ کر دور ہٹ گئی تھی، خان بابا کی سانس میں سانس آئی تھی۔

مشائیم اب صاف سترے تالاب کے کنارے کھڑی پودوں سے توڑے پتے ایک ایک کر کے پانی میں ڈالنے لگی تھی۔

”پتہ نہیں ان صاحب لوگوں کو کس چیز کا غم

تھی۔

”کیا کہتا ہے۔“ لبتی بیگم نے میڈا بناتے ہوئے عاجزہ سے کہا تھا۔

”کچھ نہیں اماں، ابا کھانا کھا رہا ہے۔“

”اچھا چل تو بھی اب بیٹھ کر ناشتہ کر لے، مجھے سارا بقی پتہ ہے وہ کیسے روٹی طلق سے اتارتا ہے، وہ رانی صاحبہ تو چھوڑ کر چلی گئی مگر باپ کی ہڑک ختم نہیں ہوئی، میں تو کہتی ہوں یہ بھی اس کے پیچھے شہر ہی چلا جائے تو اچھا ہے، اس کا سوگ ختم نہیں ہوتا اور مجھے ہر وقت خرچے کے لالے بڑے رہتے ہیں کہ خرچہ پانی کہاں سے پورا کروں۔“

اس نے دھپ کی آواز کے ساتھ روٹی توے پر ڈالی تھی اور روز کارو بنا دیا تھا، جہاں حریم سے جان چھوننے کی خوشی تھی وہیں اس رقم کے ہاتھ سے جانے کا غم بھی تو تھا جو وہ ہر ماہ اس کے ہاتھ پر رکھتی تھی۔

”اماں فون آیا ہے۔“ کا کے نے اندر سے موبائل لا کر لبتی بیگم کو تھمایا تھا، لبتی بیگم نے آٹے سے تھنڑے ہاتھوں سے فون پکڑ کر کانوں سے لگا لیا تھا۔

”ہائے میں مر گئی۔“ لبتی بیگم کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر آئے کی برات میں جا گر ا تھا، توے پر ڈالی روٹی جل جل کر سیاہ ہونے لگی تھی۔

”ہائے میری ماں جانی، ہائے میری پیاری بہن ہائے میری پیاری۔“ لبتی بیگم کے دل خراش بین اور آواز صحن سے نکل کر گرد و پیش میں بھی گونجنے لگی تھی، شہباز روٹی چھوڑ کر اس کی جانب بھاگا تھا، ماں کو دیکھ کر سارے بچے بھی بھاں بھاں کرنے لگے تھے، ان کے گھر سے آنے والا شور باہر تک گیا تو لوگ اس شور کے عادی تھے، مگر لبتی بیگم کے بین، وہ تو راہ چلتوں کو روکتے تھے،

آن کی آن میں ان کا صحن محلے داروں سے بھر گیا تھا، لبتی کی بہن گزر گئی تھی، اس کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے، عورتیں اسے سنبھالنے میں لگ گئی تھیں اور لڑکیاں بچوں کو پکڑ کر ہاتھ منہ دھلانے لگی تھیں کہ ان سب کو خالہ کی موت پر ابھی جانا تھا۔

”ہائے صبح کیسی خبر سن لی، کیچھ منہ کو آنے لگا ہے۔“ محلے کی ایک سیانی عورت دل تھام کر بولی تھی۔

”بہن، اسی لئے تو کہتے ہیں صبح کوئی اللہ رسول کا نام لیتے ہیں یوں ہر وقت کی کل کل اچھی نہیں ہوتی۔“

”اے بہن چپ کر۔“ لبتی کے کانوں میں آواز پڑ گئی تو قیامت آجائے گی، پہلی واپی نے کہا تھا، دوسری نے منہ میں زبان لے لے تھی، واقعی لبتی بیگم کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔

☆☆☆

سالن والی پلیٹ تیر کی طرح اڑتی ہوئی سامنے دیوار سے ٹکرائی تھی اور دیوار پر نقش و نگار بنا گئی تھی۔

وہ سہم کر دیوار سے جا لگی تھی، وہی وانیہ جو کبھی شہزادیوں جیسی آن بان رکھتی تھی اور اب کنیروں کی طرح کھڑی تھی۔

”یہ کھانا بنایا ہے، دھیانی کہاں ہوتا ہے تمہارا۔“ اس نے مکس سبزی بنائی تھی اور شاید بے دھیانی میں نمک کی جگہ چینی ڈال دی تھی، موحد کو بھوک لگی تھی مگر پہلے نوالے نے منہ ایسا دمڑا اور مزاج اتنا گرم کیا تھا کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور پیالی اٹھا کر دیوار پر دے ماری تھی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں۔“ وہ بولی نہیں تھی بس کمرے سے باہر نکل گئی تھی، موحد کو یہ اپنی اور بھی انسٹ لگی تھی، وہ تن فن کرتا ہوا اس کے پیچھے

جیکہ سارا جسم کانپ رہا تھا وہ دیوار پر سالن سے
بے نقش و نگار بھی صاف نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

امیر جنجوعہ کافی دنوں کے بعد یاشر علوی کے
آفس آیا تھا، یاشر ان دنوں اپنی نیگم کے ساتھ
نادر دن ایریاز کے ٹرپ پر تھا، مگر اس نے فون پر
حریم کو خاص ہدایت جاری کر دی تھی کہ وہ امیر
جنجوعہ کو کہنی دے اور اس کو بورہ ہونے دے۔

”سر کافی لیں گے یا چائے۔“ وہ یاشر کی
بات مان کر یاشر کے کمرے میں امیر جنجوعہ کی
مہمان نوازی میں مصروف تھی۔

”آپ کو ابھی تک یہ بھی نہیں پتہ کہ مجھے
چائے پسند ہے یا کافی۔“ وہ زیر لب مسکرایا تھا اور
ساتھ ہی حریم کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑی
تھیں۔

”سر مجھے تو نہیں پتہ کہ آپ کو کیا پسند ہے،
پلیز بتادیں تو مجھے منگوانے میں آسانی ہوگی۔“ وہ
امیر جنجوعہ کا پھیلا دیکھ بھی رہی تھی اور محسوس بھی کر
رہی تھی، مگر نظر انداز کرنا اس کی مجبوری تھی۔

”چلیں آج آپ کی پسند سے کچھ پیتے
ہیں، جو دل کرتا ہے پلا دیں، آپ تو ان موی
ہاتھوں سے زہر بھی پلا دیں گی تو ہم بخوشی پی لیں
گے۔“ حریم نے انٹرکام پر بیون سے کافی اور
ساتھ کچھ لانے کو کہا تھا اور خود را دور ہٹ کر بیٹھ
گئی تھی۔

”وہ آپ کے لباس کی غیر موجودگی میں
یہاں کتنا سکون ہے۔“ اس نے سگار سلگا لیا تھا
اور ایک کمینہ سا قہقہہ لگایا تھا، حریم کو دل ہی دل
میں غصہ تو بہت آیا تھا مگر پی گئی تھی۔

بیون کافی اور دوسری چیزیں رکھ گیا تھا، اس
نے اٹھا کر امیر جنجوعہ کے سامنے رکھنا شروع کر
دی تھیں۔

ہی گیا تھا۔

”وانیہ میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ وہ
خاموشی سے کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھی، چونکہ موحد کا
رد عمل بے حد غیر متوقع تھا اس لئے وہ پورے جسم
سے کانپ رہی تھی، اسے اب اکثر ڈپریشن کے
دورے پڑنے لگے تھے، ایسے میں اس کے ہاتھ
پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے، دل کی دھڑکن تیز ہو
جاتی، جسم کا پٹنے لگنا، کمزوری محسوس ہونے لگتی،
دماغ ماؤف ہو جاتا، اب بھی اس کی یہی حالت
ہو رہی تھی جبکہ موحد اس کی حالت سے بے خبر
بولے جا رہا تھا۔

”پلیز موحد میری طبیعت خراب ہو رہی
ہے، ابھی مجھ سے کچھ بھی مت پوچھو۔“ وہ بڑی
ہمت کر کے بولی تھی۔

”اجھا ایک کام خراب کرو اور اوپر سے
محترمہ کی طبیعت بھی خراب ہو جاتی ہے، یہ نازک
مزاجی گئی نہیں ابھی۔“ وہ استہزاء سیہ انداز میں کہنے
لگا تھا۔

”وانیہ میری زندگی تو عذاب ہو گئی ہے،
مجھے بتاؤ میں تمہارا کیا کروں۔“

”موحد مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، میری
طبیعت کا خراب ہونا اب مجھ سے برداشت نہیں
ہوتا۔“

”زیادہ ڈراٹے کرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔“ وہ دوبارہ پائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا
تھا، جو چھوٹی موٹی بے منٹ گارمنٹ کی دکان
سے ہوتی تھی وہ اس کی اپنی عیاشی کے لئے ہی
تھی۔

اس وقت بھی وہ کھانا کھانے باہر نکل گیا
تھا، پیچھے وانیہ رہ گئی تھی اور اس کے ہم راز اس
کے آنسو، کتنی دیر بعد وہ اٹھنے کے قابل ہوتی اور
اندر جا کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھی، اس حالت میں

وہ حریم کو دایہ لگا سکتے ہیں، جبکہ وہ نادان لڑکی نہیں جانتی تھی کہ ان کو اپنی ماں بہنوں کی ضرورت پڑے تو وہ پیسے کی خاطر ان کو بھی آگے کر سکتے تھے یہ حریم کیا چیز تھی۔

باشر علوی کے انڈیل بت پر حریم کی طرف سے پہلی بار دراڑ پڑی تھی، اسے یاشر سے نفرت محسوس ہوتی تھی، آج پہلی بار اسے یاشر اور مشائم حقیقی معنوں میں بہن بھائی لگے تھے، ایک بیسی فطرت رکھنے والے، ایک جیسے مفاد پرست، ایک جیسی سوچ رکھنے والے۔

”حریم آپ ہمیں کافی نہیں پلوانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں، ہم اپنے ہاتھوں سے آپ کو تو کافی پلوا سکتے ہیں۔“ امیر جنجوعہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور کافی کا کپ حریم کے پاس لے آتا تھا، اس نے حریم کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کا منہ پکڑا تھا اور ساتھ ہی کافی اس کے منہ سے لگا دی تھی، حریم کو اس سے اس بے باکی کی توقع نہیں تھی، اس نے ہاتھ مار کر کافی کا کپ پیچھے کیا تھا، گرما گرم کافی پیچھے گر گئی تھی، اگر امیر جنجوعہ تیزی سے پیچھے نہ ہٹتا تو یہ گرما گرم کافی اسے ہی جلائی۔

”بدتمیز لڑکی۔“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا تھا۔

”حریم؟“ زبان میں ابھی بھی مشکاس بھری تھی، حالانکہ اس وقت اگر حریم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اسے شوٹ کر دیتا، اس نے برداشت کی آخری حد پار کر کے پھر اسے دھتے سے اور پیار سے پکارا تھا اور اس کا بازو پکڑا تھا۔

”کچھ خدا کا خوف کریں امیر جنجوعہ صاحب، میں آپ کی بیٹیوں کے برابر ہوں جس سے آپ رومانس جھاڑ رہے ہیں، کیا آپ کو پیسے اور دولت نے اتنا اندھا کر دیا ہے کہ آپ کو ہر

اجتے میں امیر جنجوعہ کے سیل فون پر یاشر کی کال آئی تھی، ویسے بھی آج کل اسے امیر جنجوعہ کی طرف سے بزنس میں بہت فائدہ ہو رہا تھا اس لئے وہ اتنی بڑی آسامی کو ہاتھ سے نکالنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

”جنجوعہ صاحب کوئی مسئلہ تو نہیں آپ کو، آپ کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے کہ آپ کی خدمت میں کوئی کمی رہ گئی۔“

”ارے یاشر صاحب شکایت تو بنتی ہے آپ کی طرف، یہ دیکھ لیں کافی ہمارے سامنے رکھ کر آپ کی حریم صاحبہ غیروں کی طرح کھڑی ہیں، اگر یہ کافی ہمیں اپنے ہاتھوں سے پلائیں گی تو ہماری ساری شکایتیں مٹ جائیں گی۔“

”اچھا، حریم سے میری بات کروائیں۔“ یاشر نے پریشان ہو کر کہا تھا، امیر جنجوعہ نے سیل فون حریم کی طرف بڑھایا تھا۔

”حریم یہ جنجوعہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں، تمہیں پتہ ہے نا ہم ان کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتے، اس لئے جو ان کی خوشی ہے وہی تمہاری خوشی ہونی چاہیے۔“

”مگر سر، پلیز حریم، تم اب کوئی بچی نہیں ہو تم بزنس کی باریکیاں سمجھتی ہو، تمہیں اس فیلڈ میں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے، مجھے جنجوعہ صاحب کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی چاہیے۔“ یاشر نے حریم کی اگر مگر نے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا، حریم نے سیل فون امیر جنجوعہ کے حوالے کیا تھا اور خود سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”لگتا ہے آپ کے پاس کافی سخت ہیں آپ کو پریشان کر دیا ہے انہوں نے۔“ اس کے چہرے پر کئی سائے لہرا رہے تھے، وہ یاشر کو اتنا مفاد پرست نہیں سمجھتی تھی کہ اپنے بزنس کے لئے

”نہال ہم ان جیسے بڑے لوگوں کے ساتھ کوئی بھی پھڑا فورڈ نہیں کر سکتے اس لئے ان کے لئے ہمارا خدا ہی کافی ہے، وہ ان کے اعمال کا حساب ضرور لے گا، تم کچھ نہیں کرو گے۔“

حریم نے نہال کو اتنا جذباتی دیکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم اب اس آس میں قدم نہیں رکھو گی۔“

”اگر میں نے دوبارہ وہاں جانا ہوتا تو میں اتنا کچھ کہہ کر نہ آتی، میں خود ایسے مفاد پرست باس اور ایسی جاب پر لعنت بھیجتی ہوں۔“

”شاباش بیٹی، رزق کا انتظام اوپر والے نے کرنا ہوتا ہے اور اب بھی وہی کرے گا، اس لئے ہم میں سے کسی کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اتنے میں حریم کے موبائل پر یاشر کی کال آنے لگی تھی، یقیناً امیر جنجوعہ کی درگت بنی تھی وہ کہانی یاشر تک پہنچ گئی ہوگی، حریم نے کال کاٹ دی تھی، یاشر کے دل میں جانے کون سا لاوا پک رہا تھا کہ وہ بار بار حریم کو کال کئے جا رہا تھا، حریم اب اس دھوکے باز کی آواز بھی سننا نہ چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنا سیل فون ہی آف کر دیا تھا۔

”حریم جاؤ بچے اٹھ کر منہ دھو کر آؤ، بس جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا، اب زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”نہیں آئی، آپ بیٹھیں میں خود ہی بنا لیتی ہوں۔“

”ہوں، یہ ہوئی تا بات چلو پھر جاؤ اور ہم ماں بیٹے کے لئے بھی چائے بنا کر لاؤ۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا تاکہ دونوں کا دھیان بٹ جائے حریم اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

مجبور لڑکی اپنی محبوبہ لگتی ہے، جاب کرنے والی ہر لڑکی مجبور ضرور ہوتی ہے مگر بے شرم اور بے غیرت نہیں اور حریم شہباز بھی انہی چند لڑکیوں میں سے ایک ہے، لعنت بھیجتی ہوں امیر جنجوعہ تم پر اور تمہارے اس یاشر علوی پر، یہ لو پکڑو فون اور بتاؤ اس کو بھی کہ میں نے تمہارے ساتھ کتنی بدتمیزی کی ہے۔“ حریم نے ٹیکل پر پڑا امیر جنجوعہ کا سیل فون اٹھا کر اس کے منہ پر مارا تھا جو نیچے گر کر چٹکا چور ہو گیا تھا اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

”حریم..... حریم..... کیا ہوا؟ کہاں جا رہی ہو، پلیز بات تو سنو۔“ اس نے اپنی چیزیں بیگ میں ڈالیں اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی دوسری لڑکیاں اسے غصے میں یوں جاتا دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑی تھیں لیکن تب تک وہ لفٹ میں جا کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

☆☆☆

”میں چھوڑوں گا نہیں، اس امیر جنجوعہ کو، اس کی ہمت کیسے ہوئی تمہارے ساتھ بدتمیزی کرنے کی۔“ وہ پائلٹ جانے کی بجائے سیدھا نہال کے گھر آئی تھی، اس حالت میں نہال اور اس کی امی ہی اسے سمیٹ سکتے تھے، نہال کی دوسری بات پتہ چلی تو وہ غصے سے بھرا اٹھا تھا۔

”نہال تم کچھ نہیں کرو گے، جتنا کچھ میں اسے کہہ آئی ہوں، اس بے غیرت کے لئے اتنا ہی بہت ہے، اگر اس کا ضمیر زندہ ہوا تو چلو پھر پانی میں ہی ڈوب مرے گا۔“

”ایسے لوگوں کے پاس ضمیر ہی کب ہے بیٹی۔“ نہال کی امی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن امی جان ایسے لوگوں کو ان کی اوقات تو یاد دلانا پڑتی ہے تا۔“

گاؤں لازمی آتا ہے، میری سہیلی ہی میری خُوف میں شامل نہیں ہوگی تو میری خوشی کیا ہوگی بھلا۔
 ”چاندنی یہ تو نے کیسی بات کر دی، تو سب جانتی ہے، ابابا ماں نے جس طرح مجھے گ سے نکالا میں کیسے ان کے سامنے تمہارے گھر سکتی ہوں، ہاں تمہارا گھر دوسرے گاؤں میں ہ تو میں اڑ کر آ جاتی۔“

”جھیلے انہوں نے نکالا ہے تمہیں، ہم نے نہیں، ہمارے گھر کے دروازے تو تم پر پہلے ک طرح کھلے ہیں اور میری اماں تو کہتی ہوں کہ جیسے چاندنی میری دھجی ہے ایسے ہی حریم بھی میری دھج ہے، تو اپنے گھر والوں کے لئے ہم سب ک محبتوں کو چھوڑ دے گی۔“ چاندنی کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

”میں تم لوگوں کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں، تم لوگوں کی محبت کی خوشبو تو میری سانسوں میں رچی بسی ہے، بس میری مجبوری ہے، میں نہیں آ سکتی گاؤں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں شادی بھی نہیں کرتی۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

”تو تو بچوں کی طرح روٹھ جاتی ہے، شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی اور اسی تاریخ کو جو تمہارے گھر والوں نے رکھی ہے۔“
 ”تو کون ہوتی ہے مجھے کہنے والی، میں جو مرضی کروں۔“

”وہ تیرا انجھا تجھے ایسا کرنے دے گا۔“
 حریم خود بھی اداس ہو گئی تھی، اس نے شرارت سے اسے چھیڑ کر بھلایا تھا۔

”میرا انجھا تجھ سے تو آگے نہیں۔“
 ”اچھا اب اداس نہ ہو، رب سوہنا تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تمہاری جھولی تنگ پڑ جائے میری تو بس ہی دعا ہے۔“

”حوری..... حوری..... یہ میں ہوں چاندنی۔“ چاندنی کی آواز موبائل سے ابھری دور حریم کے سارے درد جگا گئی تھی۔

”چاندنی تو۔“ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھی تھی، اپنے گاؤں سے آنے والی ہوا بھی اسے چھو جائے وہ ان دنوں بس یہی دعا اور مناجات کرتی تھی، یہاں تو سگی ساسی ہم جولی کی آواز دل سے نکلا رہی تھی، وہ خوش بھی ہوئی تھی اور رونے بھی لگی تھی۔

”حوری کیا حال ہے، تو ٹھیک تو ہے نا۔“ چاندنی نے پوچھا تھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ تم ٹھیک ہو، خالہ چاچا، باقی گھر والے، میرے گھر والے، میرا ابابا، سب کیسے ہیں۔“ اس نے ایک ہی سانس میں ایک ساتھ سارے رشتوں کا پوچھا تھا۔

”اور ہاں وہ تیرا انجھا کیسا ہے۔“ ساتھ ہی چاندنی سے جڑے ایک اہم رشتے کا خیال آیا تو پوچھ لیا تھا۔

”سب ٹھیک ہیں، میرے گھر والے والے بھی تیرے گھر والے بھی، تیرا ابابا بھی سب ٹھیک ہیں۔“ اس نے بھی حریم کی تسلی کروائی تھی۔
 ”آج تجھے کیسے میں یاد آگئی۔“

”لے دس بھلا تو مجھے بھول سکتی ہے، تو تو جانتی ہے میرے پاس موبائل نہیں ہے، ابابا اور بھائی رکھتے نہیں دیتے ورنہ میں تجھے اب تک جانے کتنی دفعہ فون کر چکی ہوتی۔“

”پھر آج کہاں سے اور کیسے کر لیا۔“

”آج بھائی سے مانگ لیا، بڑا دل کر رہا تھا تم سے بات کرنے کو، بڑے دنوں سے تمہیں یاد کر رہی تھی، ویسے بھی میرے دن رکھ لئے ہیں، اگلے مہینے کی دس کو شادی ہے میری، اور تمہیں

تمہارے دشمن۔“ چاندنی نے جلدی سے کہا تھا۔
”بس انہوں نے مجھے جینا سکھایا اور نیا
حوصلہ دے۔“

”اللہ پاک انہیں اسی کا اجر دے گا، جو کوئی
کسی کے ساتھ نیکی کرتا ہے اس کی نیکی بھی ضائع
نہیں ہوتی۔“

”ہاں انہیں اس نیکی کا اجر ضرور ملے گا۔“
”اچھا حوری رکھتی ہوں، تم اپنا خیال
رکھنا۔“

”اور تم بھی، اور ہاں اپنے راجے کو میرا
سلام کہنا اور شادی کی مبارک باد بھی دینا، تم
دونوں کا گفٹ تمہیں پہنچ جائے گا۔“

”ہمیں گفٹ کی نہیں تمہاری اور تمہاری
محبت کی ضرورت ہے حوری۔“
”میری محبت تو ہمیشہ سے تمہارے ساتھ
ہے۔“

”اللہ حافظ حوری۔“
”اللہ حافظ۔“ حریم نے فون بند کر دیا تھا،
آج بڑے دنوں بعد دل چاندنی سے بات کر کے
ہلکا چلکا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اکیلے رہتے رہتے تنگ آ گئی تھی، آج
موحد کے جانے کے بعد اس نے گھر کو لاک کیا
تھا اور ٹیکسی لے کے دامن کوہ کی طرف آ گئی تھی،
ہلکی پھلکی دھوپ پہاڑوں کو عجیب روشنی بخش رہی
تھی، بہت سارے لوگ خوش باش چہروں کے
ساتھ ہلکے منارہے تھے، انجوائے کر رہے تھے،
بچوں کی قلقاریاں اور بیگمات کے منظر تھے
چہرے خوبصورت مناظر کے ساتھ عجیب ہی تال
میل دکھا رہے تھے، وانیہ ایک بیچ بیٹھ گئی تھی اور
ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی، اتنے میں ایک ستر پتھر
سالہ بوڑھی عورت اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم میری شادی میں نہیں آؤ گی تو کیا میں
اداس بھی نہ ہوں۔“ چاندنی کے دل کو ہی ایک
بات کھا گئی تھی۔

”اچھا سنو، تمہاری خالہ تمہاری اماں کی
بہن فوت ہو گئی ہے۔“ باتوں باتوں میں چاندنی
کو یاد آیا تو جلدی سے بولی تھی۔

”ہائے اللہ، وہ کب، وہ تو اچھی بھلی
تھیں۔“ حریم نے دل کر دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”چار پانچ دن ہو گئے ہیں، تمہاری اماں
سارا ممبر لے کر وہیں بیٹھی ہوئی ہے، ابھی تک گھر
واپس نہیں آئی۔“

”اور بابا۔“ اس نے دھیرے سے پوچھا تھا،
ابا کے نام پر گلے میں پھندا سا لگا تھا۔

”وہ بھی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ہے،
اس کی اتنی مجال کہاں کہ انہیں چھوڑ کر واپس آ
جائے۔“ چاندنی نے غمی سے کہا تھا۔

”خالہ کو ہوا کیا۔“ حریم کو حقیقتاً افسوس ہو رہا
تھا۔

”بلڈ پریشر زیادہ ہو تو دماغ کی شریان
پھٹ گئی۔“

”اوہ، اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے۔“
”بس یہ تمہاری اماں کے بول ہی اس کے
آگے آئے ہیں۔“

”نہ چاندنی، ایسے نہیں کہتے، بس ہر وقت
اللہ سے خیر اور معافی مانگتی چاہیے۔“

”چل اب یہ بتا وہ تیرے نہال صاحب
کیسے ہیں؟“

”ہاں ٹھیک ہیں، اگر وہ یا ان کی امی جان
نہ ہوتیں تو آج شاید میں بھی نہ ہوتی، انہوں نے
جس طرح مجھے سلی دی اور دوبارہ سے جینا سکھایا
وہ دونوں نہ ہوتے تو میں شاید مری جاتی۔“

”اللہ نہ کرے، ایسے نہیں کہتے، مریں

بہت دفعہ مجھے اپنے پاس بلایا ہے اس نے، لیکن میرا دل نہیں مانتا اپنا شہر اور اپنا گھر چھوڑنے کو۔
 ”تو یہاں کون رہتا ہے آپ کے پاس۔“
 ”وانیہ کو ان کے لہجے اور باوقار انداز سے اتنا تو پہچان چلا گیا تھا کہ وہ کوئی عام عورت نہیں پڑھی لکھی ہیں، لیکن اتنی پڑھی لکھی ہوں گی یہ وانیہ کو اندازہ نہیں تھا۔“

”مائی ڈاٹر، یہاں میرے پاس بہت سے لوگ ہیں، میری بیٹی، داماد اس کے بچے بہت سارے لوگ۔“
 ”اچھا۔“

”چلو اب بتاؤ جلدی سے یہ کیوں کہا کہ تمہاری قسمت خراب ہے، اصل میں میری سوئی ابھی اسی لئے وہاں انجی ہوئی ہے کہ یہ ہم یوزھوں کی خرابی ہوئی ہے کہ جس بات پر سوئی انک جائے تو بس انک جاتی ہے۔“

”ماں باپ کی مرضی کے بغیر اپنے گھر کے ڈرائیور سے شادی کی اور محبت کی اس سے بے تحاشا، میرا باپ پورے شہر کا بیٹھ تھا، اور میں بیٹھ عماد الدین کی انگوٹنی وارث، مگر محبت نے اندھا کر دیا تھا، انہوں نے مجھے عاق کر دیا تو میں اور موحّد یہاں اس شہر میں آ گئے، یہاں ایک فلیٹ خریدا اور میرے پاس جو بھی بینک بیلنس تھا اس سے موحّد کو چھوٹا سا بزنس کروادیا، چونکہ ہم نے اپنے گھر کی بنیاد ہی ماں باپ کی بددعاؤں پر رکھی تھی اس لئے کیسے خوش رہتے، نہ بزنس چلتا ہے اور نہ ہمارا گھر، اب تو مجھے لگتا ہے آئی ہمارے درمیان پہلی سی محبت بھی باقی نہیں رہی۔“ وہ دور پہاڑوں پر چھائے بادلوں پر نظر ٹکا کر بولی تھی۔

”تو ماں باپ سے معافی مانگ لو، ان کا دل بڑا ہوتا ہے، وہ معاف کر دیتے ہیں۔“
 ”وہ ملیں تو میں ان سے معافی مانگوں، وہ تو

”اکیلی آئی ہو بیٹی۔“ وہ زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکی تھیں، ”وانیہ سے پوچھنے لگی تھیں۔“
 ”جی..... جی اکیلی۔“ وانیہ پہلے تو مخاطب کئے جانے پر چوکی تھی پھر بولی تھی۔
 ”شادی شدہ ہو۔“
 ”جی۔“

”بچے ہیں۔“ اس کے انٹرویو کا آغاز ہو گیا تھا۔
 ”نہیں۔“

”کوئی بات نہیں، اللہ پاک دے گا، اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے، میاں کہاں ہے تمہارا۔“
 ”شاپ۔“

”اچھا اچھا اپنا کاروبار ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولی تھیں۔
 ”جی، بس برائے نام ہی ہے، زیادہ چلتا نہیں ہے۔“

”اسی لئے تمہارے چہرے پر مایوسی واضح لکھی دکھائی دیتی ہے۔“ وہ غور سے اسے دیکھ کر بولی تھیں۔

”جب قسمت ہی خراب ہو تو پھر مایوسی خود بخود آ جاتی ہے۔“ وہ اندر کا غبار کئی دنوں سے جمع کیے بیٹھی تھی، وہ انجان سی بزرگ خاتون کے سامنے نکلنے کو تیار تھا۔

”کیا مطلب، اللہ خیر کرے، کیا ہوا؟“
 ”چھوڑیں آپ، آپ اپنے بارے میں بتائیں۔“

”بات بدل رہی ہو، چلو کوئی بات نہیں، میں اپنے بارے میں بتا دیتی ہوں، میں ریٹائرڈ پرنسپل ہوں ایک کالج کی، ایک جوان بیٹا ہے جو باہر سٹیل ہے، اس کی بیوی اور میرا پوتا ہیں رہتے ہیں اس کے ساتھ، اچھا فرمانبردار بچہ ہے میرا،

وانیہ نے ان کے ہاتھ سے آکس کریم چھین لیا تھی۔

”میں بھی آپ کو یہ نہیں کھانے دوں گی، کیونکہ بعد میں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”ہا ہا ہا دیکھا اسے کہتے ہیں محبت، اب مجھے برا لگا کہ تم نے میری پسندیدہ چیز چھین لی لیکن تم نے تو یہ میری محبت میں کیا، یہاں پر میں بھی جج ہوں اور تم بھی بس سمجھنے کی بات ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“

”تم نے اپنے شوہر کی پسندیدہ چیز چھین لی ہے، وہ اس لئے ناراض ہو، چونکہ تم نے محبت میں یہ سب کیا اس لئے تم بھی دل میں اس سے ناراض ہو۔“

”آئی میں نے تو اس سے کچھ نہیں چھینا۔“

”کیوں نہیں، اس کی زندگی، اس کی آزادی۔“

”اگر اسے اپنی آزادی عزیز تھی تو نہ کرتا مجھ سے شادی۔“

”تم نے اپنا گھر اور ماں باپ تک چھوڑ دیئے، بیٹی تم اسے کیسے چھوڑتی، مائنڈ مت کرنا بچے۔“ بات کچھ معقول تھی وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”فری چلیں نا، گھر چلتے ہیں۔“ ایک نو دس سال کا بچہ دوڑتا ہوا پھولی سانسوں کے ساتھ آکر بولا تھا، اس کے ساتھ ان کا ڈرائیور بھی تھا۔

”بس کھیل لیا، ہو گئی سیر۔“ وہ محبت سے بچے کی طرف دیکھ کر بولی تھیں۔

”ہاں اب چلیں نا۔“

”ہاں چلو میں آتی ہوں۔“ وہ لڑکا ڈرائیور کے ساتھ چل پڑا تھا، وہ بھی اپنا بیگ سنبھالنے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”یہ لو۔“ انہوں نے ایک کارڈ وانیہ کی

سے غائب ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنا کوئی رخ تک نہیں چھوڑا۔

”تمہیں وہ یاد آتے ہیں۔“

”یاد، کسی بات کرتی ہیں آپ، میرے دل سے، وہ نکلے ہی کب ہیں، میں تو دن رات انہیں یاد کرتی ہوں۔“

”تمہارا شوہر تمہارا خیال نہیں رکھتا۔“

”پہلے رکھتا تھا، اب نہیں رکھتا اور جب سے میں خالی ہاتھ ہوئی ہوں تب سے تو مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے بیزار ہو گیا ہے۔“

”وہ بیزار نہیں ہوا، تمہاری بیزاری نے اسے بیزار کر دیا ہے، یہاں تک خود آئی تھی تو اسے بھی ساتھ لے آئی، اس کا بھی وقت اچھا گزر جاتا اور کھوئی ہوئی محبت کو بھی آسرا مل جاتا۔“

”اسے کہوں تو وہ مجھے لے کر نہیں آتا۔“

”کیا کہتا ہے۔“

”مذاق اڑاتا ہے میرا۔“

”تم نے خود کو مذاق بنا لیا ہے، اس لئے وہ تمہارا مذاق اڑاتا ہے۔“

”تو پھر کیا کروں، آپ ہی بتائیے۔“ وہ اس کے پاس سے اٹھی تھیں، وانیہ دل میں ہنسی تھی کہ انہیں کبھی کوئی دل نظر نہیں آیا تو اٹھ کر چلی گئی ہیں، مگر چند منٹوں بعد ہی وہ واپس آگئی تھیں، ان کے ہاتھ میں دو آکس کریم تھیں۔

”پکڑو کھاؤ۔“ ایک انہوں نے اسے تھما دی تھی اور دوسری خود کھانے لگی تھیں۔

”مجھے شوگر ہے، گھر والے مجھے میٹھا کھانے نہیں دیتے، چونکہ مجھے آکس کریم بہت پسند ہے بالکل بچوں کی طرح، اس لئے میں رہ نہیں سکتی اور جب بھی موقع ملتا ہے ضرور کھاتی ہوں بعد میں چاہے میری طبیعت خراب ہو جائے۔“ وہ مزے سے آکس کریم کا پیرا تارنے لگی تھیں۔

طرف بڑھا یا تھا۔

”یہ کیا ہے۔“

”یہ میرا نمبر ہے اور یہ خوشبو ہے جو مجھے بہت پسند ہے میں عراق گئی تھی تو وہاں سے لے کر آئی تھی، اس وقت تمہیں دینے کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہیں جو میں بطور تحفہ تمہیں دیتی جو تمہیں میری یاد دلاتا رہتا کہ کبھی ہم ملے تھے۔“ ساتھ ہی انہوں نے چھوٹی سی شیشی دانہ کی طرف بڑھا دی تھی۔

”بہت شکریہ۔“ دانہ نے دونوں چیزیں تھام لی تھیں۔

”میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ دانہ نے کہا تھا۔

”چلتی ہوں اور ہاں ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمت اور حوصلہ کبھی مت کھونا اگر تم نے یہ کھو دیا تو سمجھو اپنے آپ کو کھو دیا۔“ وہ چلی گئی تھیں اور وانیہ انہیں دور تک جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

”کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ مریم والہی پر خاصی تھکی تھکی اور کہیں کھوئی ہوئی لگ رہی تھی، منصور نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ وہ بے دلی سے بولی تھی۔

”تھک گئی ہو۔“

”نہیں تو۔“

”پھر چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔“

”دیے ہی۔“ اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”آکس کریم کھائیں۔“

”نہیں دل نہیں چاہ رہا۔“

”میرادل تو چاہ رہا ہے۔“

”تو آپ کھالیں نا۔“

”اکیلا کھا سکتا ہوں، تمہارے بغیر۔“

”چلیں پھر میں بھی کھا گیتی ہوں۔“

”محض میرا ساتھ دینے کے لئے۔“

”نہیں، آکس کریم نہ بھی دل کرے تو کھا لینی چاہیے۔“

پھر باقی کا راستہ منصور کی باتوں میں ہی کٹا تھا، وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی تھی۔

”مریم آؤ کچھ دیر لان میں واک کرتے ہیں۔“ گھر پہنچ کر وہ لیٹ گئی تھی جب منصور نے کمرے میں جھانک کر اسے کہا تھا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”یار آؤ نا۔“

”جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میرادل نہیں کر رہا تو آپ کیوں پیچھے بڑ گئے ہیں آپ کو سمجھ نہیں آتی، آپ اکیلے واک کر لیں میرا من نہیں، ان کے پیار بھرے ہنسلے اور بلاوے پر وہ جھنجھلا کر بولی تھی، یوں جیسے اپنے آپ میں نہ ہو۔“

”مریم میں نے کیا کہہ دیا ایسا، تم کیسے بی ہو کر رہی ہو۔“ وہ اس کے لہجے پر حیران ہوتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

”آپ جائیں بس یہاں سے مجھے تنہا چھوڑ دیں اس وقت، میں آپ سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے کروٹ بدل کر منہ پھیر لیا تھا۔

منصور کو اس کی بدتمیزی پر نہایت غصہ آیا تھا، وہ بھی واک وغیرہ بھول کر بچوں کے کمرے کی طرف چلے گئے تھے، مریم ان کی آواز سننا نہیں چاہتی تھی ان کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی، تو وہ بھی اپنی بے عزتی نہیں بھول سکتے تھے، وہ آج کی رات بچوں کے کمرے میں ہی سونے والے تھے۔

(باقی آئندہ)

URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdutube.com



بشری سیال

سینے سے شرابور تھا، وہ رات پانی رکھنا بھول گئی تھی، اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے، وہ بیروں میں جوتا پہنے، دوپٹہ اوڑھے باہر نکلی، لیکن کی طرف جاتے ہوئے اسے کارڈور میں سے گزرتے ہوئے ماما لاؤنج میں چلتی نظر آئیں۔

”ماما! وہ ان کے پاس آگئی۔“
”آپ جاگ رہی ہیں؟“

موسیٰ علی آج کل آفس سے کافی لیٹ آ رہا تھا، اکثر وہ جب آتا فردا سو رہی ہوتی، آج بھی وہ لیٹ تھا، فردا بھی یونیورسٹی کے بعد آفس لوڈ پھر گھر میں معصوب کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے بہت تھکی ہوئی تھی، اس لئے رات کا کھانا کھاتے ہی سو گئی۔

”موسیٰ!“ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی، اس نے بے حد ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، اس کا پورا بدن

URDU TUBE

ناولٹ

بہت لیٹ ہو گیا ہے۔“ ان کا رنگ زرد ہونے لگا۔

”آپ بیٹھیں یہاں۔“ فروا نے ہاتھ پکڑ کر انہیں صوفے پر بٹھا دیا، وہ ان کے لئے پانی لے آئی۔

”میں نے اسے کال بھی کی ہے، وہ رسیو نہیں کر رہا۔“

خود فروا کی جان پر بن آئی تھی، موسیٰ علی اس

”فروا مجھے نیند نہیں آرہی، دل عجیب طرح سے گھبرا رہا ہے۔“ وہ شکل سے ہی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

”ماما!“ فروا کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔

”میں نے ابھی بہت برا خواب دیکھا ہے۔“ اس نے پیشانی کو پونچھتے ہوئے کہا۔

”فروا میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، موسیٰ آج

کر بھاگ کر باہر آئے تھے۔

☆☆☆

عروبہ غنفر نے تیزی سے آنسو پونچھ ڈالے تھے، وہ اب فارقلیط حسن سے اپنے آنسو اپنے درد اور تکالیف چھپانی تھی، مگر وہ اس کے آنسو دیکھ چکا تھا، دھیرے دھیرے چلا ہوا اس کے قریب آ رہا۔

”السلام علیکم!“ عروبہ غنفر نے اسے سلام کیا تھا، مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔
”اکیلے اکیلے کافی پی جا رہی ہے۔“ اس نے دھیمے پن سے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ عروبہ کے ہاتھ سے پکڑا اور سیب لیا۔
”زبردست۔“ اس نے کپ واپس عروبہ کو

تھمایا۔

”بہت مزیدار ہے کافی۔“ عروبہ غنفر نے کوئی جواب نہ دیا، چند ثانیے یوں ہی خاموشی رہی۔

”میں کھانا گرم کرتی ہوں، آپ اندر آ جائیں۔“ وہ مڑنے لگی تو فارقلیط حسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بور نہیں ہوتی تم یہ ایک سے جملے بول بول کر..... کھانا گرم کرتی ہوں، آپ کے کپڑے نکال دیے ہیں، چائے بنا دوں، کافی پیئیں گے۔“ عروبہ غنفر نے نظریں اٹھا کر فارقلیط حسن کی جانب دیکھا۔

”جو انسان آپ سے اتنی محبت کرے، آپ کو اتنا چاہے، اسے معاف کر دینا چاہیے عروبہ!“ وہ بول رہا تھا اور عروبہ غنفر خاموشی سے اسے سن رہی تھی اور پچھلے ڈیڑھ سال سے یہی تو ہو رہا تھا۔ یہ خاموشی جواب کہ گفتگو کے بیچ ٹھہری ہے یہی اک بات ساری گفتگو میں سب سے گہری ہے ”میں نے جتنا تمہیں چاہا ہے، اپنی زندگی

کا شوہر تھا اور اب بہترین دوست بھی، جو ہر بات اور ہر کام میں اس سے رائے لیتا اور اسے اہمیت دیتا تھا، پڑھائی سے لے کر ہر چیز میں اسے سپورٹ کرتا تھا، اس کی خواہش تھی کہ فردا اس کا آفس جوائن کرے، مگر فردا اپنے بابا کا آفس جوائن کرنا چاہتی تھی تو یہاں بھی موسیٰ علی نے اس کی مرضی کو اہمیت دی۔

”میں دوبارہ کرتی ہوں فون۔“ فردا نے ٹیبل پر بڑا ان کا موبائل اٹھا کر کال ملائی۔
”نہیں اٹھا رہے۔“ راشدہ بیگم کی آنکھوں میں جھجکاتے آس کے دینے ٹھمانے لگے۔

”پالہ! میرے بچے کی حفاظت فرما، وہ ایسا لاپرواہ تو نہیں۔“ فردا دوبارہ کال ملانے لگی، کال رسیو ہوئی تھی۔

”موسیٰ آپ کہاں ہیں؟ کال کیوں نہیں رسیو کرتے؟ ہم لوگ اتنے پریشان ہیں۔“ ماما نے ہاتھ بڑھا کر اس سے موبائل لینا چاہا۔
”کیا؟“ وہ زور سے چلائی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ سر کو بار بار ہانپتی میں پلا رہی تھی، ماما خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ماما!“ فردا کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ گیا تھا، وہ دزدیدہ نگاہوں سے ماما کو دیکھ رہی تھی، اس پل ماما کا جی چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں، اسے بولنے سے منع کر دیں، یا اپنی سامعتوں کو ضائع کر دیں، وہ ایک پل، ایک صدی کے برابر لگتا تھا انہیں۔

”موسیٰ کو..... کسی نے..... گولی مار دی۔“ الفاظ تھا یا سیسہ جو راشدہ بیگم کے کانوں میں اتر پڑ گیا تھا وہ جھٹی جھٹی نگاہوں سے فردا کو دیکھ رہی تھیں، فردا زور زور سے رو رہی تھی، جبکہ راشدہ بیگم کا وجود ساکت ہو گیا تھا، ظفر علی شورش

میں کبھی کسی کو نہیں چاہا، کیا تم میری غلطی کو معاف نہیں کر سکتی؟“ وہ سوال کر رہا تھا، التجا کر رہا تھا اور عروہ غفتر خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“ عروہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔

”تم کہو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا فارقلیط!“ وہ کسی روپوش کی طرح بول رہی تھی، جذبات سے عاری، احساسات سے بے پرواہ اس کا چہرہ ساٹ تھا، آنکھیں بھی ہوئی تھیں، وہ پتھر کی کوئی اداسی صورت دکھائی دیتی تھی۔

”دل سے معاف کر دو عروہ!“ وہ لجاجت سے گویا ہوا۔

”دل سے معاف کیا۔“ وہ اسی انداز سے بولی اور ہاتھ میں پکڑی ٹھنڈی کافی لے کر واپس پلٹ گئی، فارقلیط حسن اسے جاتے دیکھتا رہا، دونوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی ہوئی تھی جسے فارقلیط حسن ہر رات، گرانا اور ہر صبح وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند نظر آتی، فارقلیط حسن چاہ کر بھی سب کچھ ٹھیک نہ کر پا رہا تھا اور عروہ غفتر خواہش اور کوشش کے باوجود سب کچھ بھلا نہ سکی تھی، وہ اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی تھی، اس کی ہر بات مانتی تھی، کسی چیز یا بات کے لئے ضد کرنا چھوڑ دیتا تھا، کیونکہ اسے فارقلیط حسن پر جو مان تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، زین ندیم کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، وہ اچھی طرح

جانتا تھا کہ وہ ایک خندی اور نادان لڑکی ہے، اپنی خند میں کچھ بھی کر سکتی ہے، فی الحال جو چوکیدار تھی اس کا کوئی حل اسے نظر نہ آ رہا تھا۔

”یا اللہ! کہاں ڈھونڈوں اسے۔“ اس نے نگاہیں اٹھا کر دور تک پھیلے درختوں کے سلسلے کو دیکھا۔

”کہاں جا سکتی ہے؟“ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

”سرا؟“ گل خان بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا۔

”میڈم..... میڈم..... وہاں بیٹھا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا، جہاں مصنوعی آبشار بنی ہوئی تھی اور اس کے ارد گرد بہت خوبصورتی سے چھوٹے چھوٹے پہاڑ بنائے ہوئے تھے۔

”ام نے ان کو بتایا کہ سر بہت پریشان ہیں، وہ کہنے لگا، اچھی بات ہے۔“ زین ندیم خاموشی سے اٹھ کر اس سمت چل دیا، وہ ایک اونچے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر اسے سخت غصہ آیا، مگر وہ بی گیا۔

”اندر چلو۔“ وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا تو وہ چونکی، اسے دیکھا اور زادیہ نظر بدل لیا۔

”میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں۔“ وہ شس سے مس نہ ہوئی تو زین ندیم اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”مجھے اندر تحشتن فیل ہو رہی ہے، میں یہاں ٹھیک ہوں آپ جائیں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی تو چند ثانیے وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اس کا بازو دو بوج لیا۔

”گھر ملازموں سے بھرا ہوا ہے، پہلے ہی بہت تماشہ کر چکی ہیں آپ، میں مزید نہیں ہونے دوں گا۔“ اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور ساتھ لے

کر چلے لگا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ، وحشی، جنگلی انسان۔“ وہ چلائی، زین ندیم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، وہ کلائی کو سہلاتے ہوئے اس کو کھورتے ہوئے، تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی جانب بڑھی اور اس سے پہلے بیڈروم میں داخل ہوئی۔

وہ اندر آیا تو اتنا بیک غصے کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، اس کی جانب دیکھے بغیر وہ ایک فائل اٹھالایا اور اسے دیکھنے لگا۔

”نفرت کرتی ہوں میں آپ سے۔“ اس کی جانب دیکھے بنا تیز تیز ٹہلتے ہوئے وہ ایک دم زور سے بولی۔

”مجھ سے کچھ کہا؟“ زین ندیم نے فائل سے سر اوپر اٹھایا۔

”نہیں، دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ شدید صدمے سے دوچار تھی۔

”بہت خوبصورت اور بڑا ہے آپ کا یہ قید خانہ۔“ وہ اس سے کچھ فاصلے پر آ بیٹھی تھی، زین ندیم نے سر اٹھا کر اس کے چہرے، تنے ہوئے نقوش کو دیکھا اور دوبارہ فائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”خود آپ بھی بہت خوبصورت ہیں۔“ اس کی بات پر وہ زیر لب مسکرایا۔

”شکریہ!“ اس کی مسکراہٹ اسے مزید غصہ دلا گئی۔

”مگر یاد رکھیے گا، میں کبھی بھی امپریس نہیں ہوتی ان چیزوں سے، میں کبھی بھی آپ کی نہیں ہو سکتی۔“ وہ اسے باور کرا رہی تھی، اس کی بات پر زین ندیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”دماغ خراب ہے آپ کا۔“ وہ بولا تو انتہا بیک کو گویا پتھلے لگ گئے۔

”دماغ نہیں، قسمت خراب ہے میری، جو

میری شادی نواز سے نہیں آپ سے ہو گئی۔“ وہ اسے غصہ دلانے اور نیچا دکھانے کے لئے کہہ رہی تھی۔

”آپ کو غصہ نواز سے شادی نہ ہونے پر ہے، یا مجھ سے شادی ہونے پر ہے؟“ اس کے سکون میں ذرا فرق نہ آیا تھا، بلکہ وہ اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے بول رہا تھا، انتہا بیک کا جی چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔

”کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو؟“ اس نے فائل زین ندیم کے ہاتھ سے کھینچ کر دور پھینکی۔

”ایک خوبصورت، ذہین، ذمہ دار، نرم مزاج، خوش مزاج آفیسر..... اور تو کچھ نہیں۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے سے بتایا۔

”اونہم، خوش فہمیاں۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی، زین ندیم فائل لے کر بیٹھ گیا، جب کسی طرح بھی وہ اسے ہراناہ کی تو موبائل اٹھا کر نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔

”ہاں نواز کیسے ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی، زین ندیم نے ایک نظر اس کو دیکھا اور دوبارہ فائل پر جھک گیا، جب تک وہ جاگتا رہا، وہ فون پر نواز سے بات کرتی رہی، مگر زین ندیم اسے نظر انداز کرتا رہا۔

☆☆☆

”عدیل!“ علیہ کو اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی، سب کچھ اس کے سامنے واضح ہو گیا تھا، کچھ بھی کہنے سننے کو نہیں بچا تھا، ایک لمحے کو اس کا جی چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے اور کبھی پلٹ کر نہ دیکھے اور باقی زندگی اس فریب میں گزار دے کہ عدیل صرف اور صرف اس کا ہے، وہ اس کی آواز سن کر مڑا اور سناٹے میں آ گیا۔

”علیہ!“ وہ گود میں اٹھائے بچے کو لے کر

کچنی میں جاب دلائی۔“ وہ تیز بول رہا تھا۔
”مجھے تمہاری اس رام کہانی سے کوئی دلچسپی
نہیں ہے۔“ وہ تضحیک بولی۔

”میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں ابھی
یہاں سے چلی جاؤ، میں تم سے باہر آ کر بات
کروں گا۔“ وہ آواز کو حتی المقدور تارل کرتے
ہوئے بولا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں
بولی۔

”بہت برا ہو گا تمہارے ساتھ۔“ وہ وارن
کر رہا تھا۔

”مزید کیا برا کرو گے۔“ وہ آنکھوں میں
امنڈتے آنسو پیٹتے ہوئے بولی۔

”تم نے اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے
لئے میرے خوابوں میں آگ لگائی ہے، میں
تمہارے گھر میں آگ لگا کر اسے راکھ کا ڈھیر بننا
دیکھ کر جاؤں گی۔“ عدیل کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ
کیا کرے، صومیہ مارکیٹ سے لوٹنے ہی والی
تھی۔

”علیہ تم۔“ بات اس کے منہ میں ہی رہ
گئی تھی، بیرونی دروازہ کھلا تھا، عدیل نے دزدیدہ
نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھا تھا اور پھر
علیہ نے اس کے متغیر ہوتے چہرے کو دیکھ کر اس
کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا، جہاں
دروازے سے اندر ایک موٹی اور چھوٹے قد کی
لڑکی آنکھوں میں حیرت و استعجاب لئے کھڑی ان
دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

غففر علی ریسپشن سے معلومات لے کر تیزی
سے مڑے، انہیں آپریشن تھیٹر کے باہر ہی فردا نظر
آگئی تھی، وہ حد درجہ خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی۔
”فردا! میرے بچے۔“ غففر علی آگے

اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم یہاں کیوں آئی؟“ عدیل کا رنگ لٹھے
کی مانند سفید ہو رہا تھا، وہ تیزی سے اس کے
قریب آیا اور پریشانی کے عالم میں مڑ کر بند
دروازے کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

”دھوکے باز انسان۔“ شدید دکھ کی حالت
میں اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔

”پلیز علیہ باہر چلی جاؤ، ورنہ بہت گڑبڑ
ہو جائے گی۔“ وہ منت کر رہا تھا۔

”جھوٹے انسان، تمہیں کوئی شرمندگی
نہیں، ذرا احساس نہیں، تم نے مجھے کتنا بڑا دھوکہ
دیا۔“ وہ زور سے چلائی۔

”دیکھو علیہ یہاں کوئی تماشہ نہ کرنا، اگر
صومیہ آگئی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔“ وہ بہت
گھبرایا ہوا تھا۔

”اس کی اتنی فکر اور میری کوئی پرواہ نہیں۔“
وہ شاکد تھی۔

”دیکھو علیہ میری جان تم باہر آؤ، میں
تمہیں.....“

”دور رہو مجھ سے۔“ علیہ نے اس کا ہاتھ
جھٹکا۔

”تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے اور
اب میں تمہاری بیوی کو تمہاری اصلیت بتاؤں
گی۔“ وہ اس کے سائیڈ سے ہو کر آگے بڑھی اور
صوفے پر جا کر بیٹھ گئی، عدیل کی جان پر بن آئی
تھی۔

”علیہ میں بہت مجبور ہو گیا تھا، دل میں
ڈھیروں امیدیں لے کر، میں اپنے اور تمہارے

خواب پورے کرنے یہاں آیا تھا، مگر مجھے کوئی
اچھی جاب نہ مل رہی تھی، میں بہت پریشان تھا،
تب ایک دن مجھے صومیہ مل گئی، اس کا باپ بہت
بڑا بزنس مین ہے، اس نے مجھے اپنے چاہ کی

ساتھ بیٹھ گئے۔

☆☆☆

عروبہ دونوں بچوں کے ساتھ لوگ روم میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی، دونوں اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے، ماہوش بھائی کی نسبت زیادہ ایکٹو اور چالاک تھی، فارقلیط حسن اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور باتوں پر ہنستا تھا، وہ ہمیشہ شہیرے کھلونے چھین لیا کرتی تھی۔

”پاپا، پاپا“ فارقلیط حسن اندر داخل ہوا تھا اور ماہوش اسے دیکھتے ہی چلانے لگی تھی، مگر وہ پہلے عروبہ کے پاس آیا، اسے بازو کے گھیرے میں لے کر اس کے گال کو مس کیا۔

”مڈائیونگ“ وہ ہنستا ہنستا سے مسکرایا۔

”السلام علیکم!“ عروبہ غنفر نے بھی جوابا مسکرا کر اسے جواب دیا تھا۔

”آپ کی بیٹی، آپ کے پاس آنے کے لئے بے چین ہے۔“ عروبہ نے اس کی توجہ ماہوش کی جانب مبذول کروانا چاہی، جو فارقلیط حسن کو متوجہ نہ پا کر کچھ خفا دکھائی دینے لگی تھی، جبکہ شہیر بہت خاموشی سے فارقلیط حسن کا بازو تھامے کھڑا تھا۔

”اب تم صاف کہو میں تم سے دور ہو جاؤں۔“ اس نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے ذرا سا آگے کو جھک کر بیٹی کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔

”چائے پیتے گے یا کافی؟“ وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ ایک دم بچھسا گیا تھا، دونوں بچے اس سے خوب لاڈ کر رہے تھے۔

”میں سوچ رہا ہوں اس دفعہ بچوں کا برتھ ڈے ہم پاکستان جا کر سلیم یٹ کریں۔“ اس نے عروبہ کی طرف مشورہ طلب نظروں سے

بڑھے اور اسے سینے سے لگالیا، انہیں سامنے پا کر اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

”کیسے ہوا یہ سب۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی ڈھارس بندھا رہے تھے، مگر فردا کا وجود درخت سے کٹی شاخ کی مانند تھا، وہ جیسے بے جان ہوتی جا رہی تھی۔

”پاپا! پلیز ڈاکٹرز سے کہیں موسیٰ کو بچا لیں۔“ ان سے الگ ہو کر وہ اب ہاتھ جوڑ کر ان سے التجاء کر رہی تھی، غنفر علی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے بیٹے اور وہ اسے بچالے گا۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دے رہے تھے۔

”میری زندگی میں سے پرائیمر کبھی ختم نہیں ہوں گے، مجھے ایسا لگنے لگا تھا، کہ اب برا وقت گزر گیا ہے اور زندگی میں صرف سکون ہی ہوگا، مگر میں غلط تھی، اللہ نے نہ بھی میرے ساتھ اچھا کیا ہے اور نہ بھی کرے گا۔“ اس کی بات پر وہ لحظہ بھر کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔

”اللہ بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا بیٹا۔“ وہ نرمی سے بولے تھے۔

”اس نے میرے ساتھ ہمیشہ برا کیا ہے۔“ وہ ان کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔

”کچھ لوگوں کو سب کچھ دے دیتا ہے اور کچھ کو بس تڑپاتا اور ترستا ہے، کبھی چین نہیں لینے دیتا، اگر موسیٰ کو کچھ ہوا تو میں..... میں اس سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ غنفر علی خاموش ہو گئے تھے، وہ جانتے تھے اس وقت وہ کچھ نہیں سنے گی، اس لئے کچھ بھی کہنا بے معنی تھا، وہ اسے شانوں سے پکڑ کر وینک ہال کی جیبرز تک لائے تھے، جہاں موسیٰ علی کے غم سے ٹھہرا ہوا والدین بیٹھے تھے، غنفر علی نے فردا کو بٹھایا اور خود بھی اس کے

دور کر دیا ہے۔

”گرینڈ پا۔“ ماہوش بھاگ کر ان کی گود میں چڑھ گئی تھی۔

”ڈیلی!“ عروبہ آگے بڑھی اور حسن بھڑاد نے اسے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، ان کے گھر کا سونا پن لگوں میں غائب ہوا تھا، انہوں نے بچوں کی شاعری سالگرہ منانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لئے بھرپور انتظامات کر رہے تھے، وہ فارقلیط حسن سے کچھ کچھ کھینچنے سے تھے اور ہمیشہ کی طرح وہ بس انہیں دیکھنے گیا۔

☆☆☆

نویلہ، فروا کے لئے بہت پریشان تھی، فروا کا بی بی مار بارڈاؤن ہو جاتا تھا، اس کی حالت نویلہ سے دیکھی نہ جا رہی تھی، وہ غنفر علی کی خاص ہدایت پر فروا اور موسیٰ علی کے پیرنس کے لئے کھانا تیار کروانے کھڑی تھی، مصعب کو بھی وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

”نویلہ!“ وہ کچن میں تھی، جب صوفیہ اس کے سر پر پہنچ گئیں۔

”جی ماما!“ وہ مڑی۔

”میری بات سنو۔“ وہ اسے کہہ کر باہر نکل گئیں، نویلہ ان کے پیچھے آئی تھی۔

”تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اس لڑکی کے غم میں گھٹنے کی، اپنی پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر اس کی خدمتیں کرنے کی۔“ نویلہ نے متاسف نظروں سے ماں کو دیکھا تھا۔

”باپ تمہارا آفس کو بھلائے اس کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے، پتا نہیں کب سمجھو گے تم باپ بیٹی۔“ وہ شدید الجھن اور غصے کا شکار تھیں۔

”ماما ایسا مت کہیں، بابا اور فروا آپنی بہت پریشان ہیں۔“ نویلہ نے انہیں کچھ بھی سخت کہنے سے روکا، مصعب بھی پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

دیکھتے ہوئے کہا تھا، وہ فوراً مان گئی۔

”جیسے آپ کو ٹھیک لگے۔“ اس نے فوراً حامی بھر لی فارقلیط حسن اسے دیکھنے گیا۔

”بھی تو کسی بات سے انکار بھی کر دیا کرو۔“ وہ جیسے شکوہ کر رہا تھا۔

”آپ کبھی کچھ غلط کہتے ہی نہیں، انکار کیوں کروں؟“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”مجھے کبھی کبھی یہ وہم ستانے لگتا ہے عروبہ کہ میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔“ اس کے لہجے میں حسرت تھی، خوف تھا، ایک محسوس کی جانے والی پیاس تھی۔

”آپ اتنا وہم مت کیا کریں، میں ہمیشہ سے آپ کی ہوں اور آپ ہی کر رہوں گی اور میں صرف آپ کے ساتھ ہوں، مجھے آپ کے علاوہ اور کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ فارقلیط حسن اسے دیکھنے گیا، ایک ایک لفظ کو اپنی روح میں اتارتا گیا، اسے عروبہ پر، اس کے الفاظ پر گہرا یقین تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں میری محبت پر یقین نہیں رہا، مگر عروبہ وقت تم پر خود ثابت کرے گا کہ تم میرے لئے کیا ہو، میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، وقت نے ہماری محبت کے خلاف سازش ضرور کی، مگر کامیاب نہیں ہوا، نہ ہی میں اسے کامیاب ہونے دوں گا عروبہ۔“ عروبہ اس کے لئے کافی لائی تھی، اسی رات عروبہ نے پیکنگ شروع کر دی تھی، کیونکہ دو دن بعد وہ لوگ پاکستان جا رہے تھے۔

”عروبہ! میری بیٹی۔“ حسن بھڑاد سب سے زیادہ اسے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، فارقلیط حسن اور عروبہ نے انہیں کچھ نہ بتایا تھا، مگر وہ جانتے تھے دونوں کے درمیان کچھ ایسا ضرور ہوا ہے، جس نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے

طرف مڑی۔

”جھوٹ..... جھوٹ..... بول رہی ہے۔“
وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

”عدیل!“ علیہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں اس کی بیوی ہوں، یہ تم سے جھوٹ بول رہا ہے، اس نے مجھے بھی دھوکہ دیا ہے، تمہیں بھی دھوکہ دے گا۔“ علیہ تیز بول رہی تھی۔

”نکل جاؤ تم میرے گھر سے۔“ اس نے آگے بڑھ کر بچہ عدیل کی گود سے لیا اور اسے دھکا دیا۔

”ایسا مت کہو صومیہ ڈارلنگ۔“ اس نے آگے ہوتے ہوئے ہاتھ اس کے شانے پر رکھا جسے اس لڑکی نے فوراً جھٹک دیا۔

”میں جان سے مار دوں گی اسے۔“ وہ زور سے چلائی اور اندر چلی گئی۔

”بہت برا کروں گا تمہارے ساتھ۔“ علیہ کو گھورتے ہوئے وہ اس کے پیچھے گیا، تقریباً

پندرہ بیس منٹ بعد دونوں واپس آئے تھے، یہ وقت علیہ نے سولی پر لٹکتے ہوئے گزارا تھا۔

”تم یہاں سے چلی جاؤ علیہ، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“ وہ جیسے کسی گہرے خواب سے چونکی تھی۔

”طلاق دیتا ہوں۔“ علیہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے یا حقیقت۔

”نن..... نہیں۔“ اس کے لب کسی بے بس قیدی پرندے کی مانند فقط پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”طلاق دیتا ہوں۔“ عدیل جیسے کسی بڑے بوجھ سے آزاد ہوا تھا، وہ پتھر کی بے جان صورت بنے، لب نیم واکے اس بے وفاء، دغا باز اور خود غرض شخص کو دیکھ رہی تھی، جس نے اپنے خواب

”مجھے تمہارا فروا کے ساتھ اتنا فریک ہوتا بالکل پسند نہیں ہے، باپ بزنس اس کے حوالے

کرنے پر چلا ہوا ہے، بیٹی اپنا فوجر بھلائے اس کی خدمتیں کر رہی ہے، سنی میری خواہش تھی کہ تم

یا علیہ باپ کے ساتھ بزنس سنبھال لو، لیکن تم لوگوں نے بھی میری بات کو اہمیت ہی نہیں دی۔“

وہ بیٹیوں سے سخت کبیدہ خاطر نظر آ رہی تھیں۔

”ماما ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ نویلہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”میرا انٹرسٹ بزنس میں نہیں ہے اور علیہ کی شادی ہوگئی اور بے فکر رہیں فروا آپنی خود

بھی کچھ نہیں لینا چاہتیں، پھر ان کے پاس کی چیز کی کمی نہیں ہے، اتنا بڑا گھر، بزنس اور پراپرٹی

ہے موی بھائی کے پاس۔“ اس نے تسلی دی۔

”مگر افراد کو بہت شریف سمجھتا ہے غصہ، بیٹی کو جاتے جاتے بھی ظفر کے گھر چھوڑ گئی، آخر کو

پرانا پارا نہ تھا۔“ نویلہ نے متاسف نظروں سے ماں کی جانب دیکھا۔

☆☆☆

”عدیل! یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ چلتی ہوئی ان لوگوں کے قریب آئی اور علیہ کو گھورتے

ہوئے جیسے پن سے عدیل سے سوال کیا تھا۔

”عدیل کی بیوی۔“ قبل اس کے عدیل اس سے کچھ کہتا علیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”واٹ؟“ وہ زور سے چلائی، عدیل کا حال تو ایسا تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

”کواس کر رہی ہو تم۔“ وہ علیہ پر جھنجھی۔

”اپنی حد میں رہو۔“ عدیل کی گود میں موجود بچہ اس لڑکی کے پاس جانے کے لئے بے

چین تھا، مگر اسے اس وقت ہوش کہاں تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے عدیل؟“ وہ عدیل کی

بچانے کی خاطر اسے اجاڑ دیا تھا۔

”نہیں عدیل۔“ وہ زور سے چلائی۔

”تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے، مگر اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

”نکلو یہاں سے۔“ وہی لڑکی آگے بڑھی

اور علیہ کو دھکے دینے لگی، عدیل بے بسی سے یہ

سب دیکھ رہا تھا، مگر وہ اس کی روک نہ سکتا تھا۔

”میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گی، اللہ تم

کو برباد کرے جیسے تم نے مجھے کیا۔“ وہ رو دی

تھی، عدیل نگاہیں چرانے لگا، اس لڑکی نے

علیہ کا ہینڈ کیئر بھی اس کے ساتھ ہی باہر پھینک دیا

تھا۔

”یا اللہ!“ اجنبی دیس کی اس سردخالم بے

وفا فضا میں اپنی تنہائی، بے بسی اور بربادی کے

خیال نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، وہ گھر کے باہر

بیڑھیوں پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی، اس نے

زندگی میں پہلی بار اللہ کو پکارا تھا، آسوس کی

گالوں پر پتے ہوئے ٹھوڈی سے لٹکنے لگے تھے۔

ایک بادل گر جا اور بارش برسنے لگی، اس

نے بے بسی سے نگاہیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور

اپنا ہینڈ کیئر کھینچی ہوئی تیز تیز سڑک پر چلنے لگی،

اس نے جینز کے اوپر لاٹک کوٹ پہن رکھا تھا،

گلے میں مفلر لٹکائے وہ بے خیالی سے چلی جا رہی

تھی کہ سامنے سے آتی گاڑی سے ٹکرائی۔

”آہ۔“ اس کے منہ سے چیخ برآمد ہوئی،

ہینڈ کیئر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

☆☆☆

زین ندیم نے انتہائی بیک وقتانہ کے لئے

نہیں جگا جگا تھا، وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا

تھا جب وہ جاگ اٹھی۔

”گڈ مارننگ۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب

آئی، زین ندیم ہنر برش کر رہا تھا، وہ ڈریسنگ کو

لیک لگا کر کھڑی ہوئی، اس نے کوئی جواب نہ

دیا، بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”موڈ آف ہے آپ کا؟“ وہ استہزائیہ

انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔“ مختصر جواب آیا۔

”چھانچھ لگا میرے نواز سے بات کرنے

پر آپ نے مانڈ کیا۔“ وہ اسے چڑانے کی کوشش

کر رہی تھی مگر اسے ناکامی ہوئی تھی۔

”جب آپ مجھ سے بحث کرتی ہیں تو کافی

بہادر اور کانفیڈنٹ لگتی ہیں اور جب نواز سے

متعلق بات کرتی ہیں تو ایک کمزور ہاری ہوئی بے

وقوف لڑکی لگتی ہیں۔“ زین ندیم کی بات پر لفظ بھر

کو وہ خاموش ہو گئی تھی، مگر اگلے ہی لمحے خود کو

سنبھال کر گویا ہوئی۔

”جیلس ہو رہے ہیں۔“ وہ تپا دینے والے

انداز میں مسکرائی تھی۔

”ادنیہ جیلس۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”تمہاری سوچ اور کردار پر حیرت ہوتی

ہے۔“ اس نے برش واپس رکھا اور پرفیوم اٹھا کر

اچھرے کرنے لگا۔

”میرے کردار پر بات کرنے سے پہلے

اپنے گریبان میں جھانکیں ایک کمزور بے بسی لڑکی

کو زبردستی باندھ کر رکھا ہوا ہے۔“ وہ تملاتی تھی۔

”کمزور، بے بسی اور آپ۔“ وہ حیرت

سے بے ہوش ہونے لگا تھا۔

”بہادری کے جو مظاہرے آپ نے

میرے سامنے کیے ہیں، اس کے بعد کون کافر

آپ کو کمزور اور بے بسی سمجھے گا۔“ وہ اب کلائی

میں گھڑی باندھ رہا تھا۔

”لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، شادی سے

پہلے ہم جو بھی تھے، مگر شادی کے بعد ہم اپنے قول

دینے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ زین ندیم نے اس پر فوراً واضح کیا تھا۔

”مگر میں زیادہ عرصہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ وہ بھی دوبدو بولی تھی، بناء کسی لحاظ یا جھجک کے۔

”میں بلاوجہ اس رشتے کو ختم نہیں کر سکتا۔“ وہ جان چھڑاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو ابھی بھی وجہ چاہیے۔“ وہ طنز سے گویا ہوئی۔

”یہ وجہ میں ماما کو نہیں بتا سکتا۔“ اس نے فوراً یاد کر دیا۔

”جس دن کوئی ایسی وجہ میرے سامنے آئی، جو میں ماما کو بتا سکوں، میں خود آپ کو چھوڑ دوں گا۔“ اسے کہہ کر وہ رکنا نہیں تھا، باہر کی جانب بڑھ گیا، جبکہ انٹیا بیک غصے سے بھرپور نگاہ اس پر ڈال کر رہ گئی، زین ندیم اس کے لئے ایک استحسان بننا جا رہا تھا۔

☆☆☆

غنفر علی نماز پڑھنے گئے تھے، فردا ہاسپٹل کی سیر حیاں اتر کر نیچے آ گئی، اس کے ارد گرد خوب شور تھا، بھیڑ بھی لوگ آ جا رہے تھے مگر اس وقت اس کے اندر گہرے سنائے پھیلے ہوئے تھے، وہ بے خیالی میں ہی ہاسپٹل سے باہر نکل آئی تھی، وہ بے نیازی سے سڑک پر چلی جا رہی تھی، چلتے چلتے وہ ہاسپٹل سے بہت دور نکل آئی تھی، مگر اسے کچھ خبر نہ تھی نہ ہی کچھ ہوش تھا، وہ بس چلتی جا رہی تھی، سامنے ہی ایک سبز گنبد والی عمارت تھی، وہ اس کے باہر سڑکیوں پر بیٹھ گئی، ذہن اس وقت گہری سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

”پریشان ہو؟“ ایک سانولی سی عورت اس سے کچھ فاصلے پر آ بیٹھی تھی، فردا گہرے خیال

اور فضل کے لئے ایک دوسرے کو جوابدہ ہیں۔“ وہ اب اپنا لپ ٹاپ بیک میں ڈال رہا تھا۔
”میں کسی جہمی بات کے لئے آپ کو جوابدہ نہیں ہوں زین صاحب۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

”مرد عورت کے کردار پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے، عورت اگر با وفا ہو تو مرد خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین مرد سمجھتا ہے۔“ وہ اسے کہہ رہا تھا، وہ خوب سمجھ رہی تھی۔

”میں نے پہلے دن ہی آپ پر سب کچھ واضح کر دیا تھا۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”نا جانے آپ معصوم ہیں، بے وقوف یا.....“ اس نے تصدیقات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میں جو بھی ہوں یہ آپ کا ہیڈک نہیں ہے، آپ مجھے طلاق دیں اور خود کو اور مجھے اس اذیت سے نکالیں۔“ اس نے حل پیش کیا۔

”بہت خود غرض ہیں آپ۔“ زین ندیم کہہ بیٹا نہ رہ سکا۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“ اسے تو کسی چیز کسی انسان اور رشتے کی پرواہ نہ تھی، نوازی کی محبت نے اسے خود غرض بنادیا تھا۔

”جو محبت والدین کی عزت، محبت اور وقار کی دجیاں اڑانے کو کہے، وہ محبت نہیں خود غرضی ہوتی ہے، بربادی کی ابتداء۔“ زین ندیم نے اسے متاسف نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

زین ندیم فطرتاً حساس انسان تھا، وہ دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشیوں کو قربان کر دینے کو ترجیح دیتا تھا۔

”آپ کو میرے پیرئس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ برہم ہوئی، وہ ہر بار اس کے سامنے اس کی باتوں سے ہار جاتی تھی۔

”میں اپنی ماما کی فکر کر رہا ہوں، انہیں دکھ

سے چونکی تھی، مگر کوئی جواب نہ دیا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

”وہ یا تو اسے آزما رہا ہے جس کی محبت پر اسے بہت یقین ہوتا ہے، یا پھر اسے آزما رہا ہے جس کا یقین اس کی محبت پر ڈالنا ڈول ہو رہا ہوتا ہے۔“ فروا اب بھی کچھ نہ بولی تھی، بس خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔“ وہ سامنے لگے نیم کے درخت کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ صرف چند لوگوں سے محبت کرتا ہے اور انہی کو ہر چیز سے نوازتا ہے، باقیوں کو صرف ترساتا ہے۔“ اس عورت نے فروا کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”بہت بدگمان ہو اس سے؟“ عورت نے سوال کیا۔

”میں ناراض ہوں اس سے۔“ وہ بولی تو عورت اس کی بات پر ہنس دی۔

”انسان کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اس سے ناراض ہو۔“ وہ مسکاتے انداز میں بولی۔

”انسان کو کوئی اختیار دیا ہی کب گیا ہے۔“ وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

”یہ بہت بڑے بزرگ کا دروازہ ہے، یہاں لوگ دور دور سے منٹیں مانگتے آتے ہیں، تم بھی منت مانگو، تمہارے بھی دل کی مراد پوری ہو جائے گی۔“ اس نے نگاہیں اٹھا کر تعجب سے اس عورت کو دیکھا۔

”میں کیوں اپنے ہی جیسے انسان سے مانگوں کچھ، دل کیا تو اللہ سے مانگ لوں گی۔“ اس نے انکار کیا۔

”استغفر اللہ۔“ عورت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”تم تو بہت بھکی ہوئی ہو، دین کے راستے پر چلنے والے، اللہ کے ولی کو اپنے جیسا کہہ رہی ہو۔“ وہ خاصی حیران اور خفا دکھائی دے رہی تھی، فروا نے چپ سادھ لی۔

”ان سے کوئی بھی نہیں مانگتا، نہ ہی اللہ کے سوا کوئی دے سکتا ہے، ہاں ان جیسے اللہ کے پیاروں کا واسطہ دے کر جب اللہ سے مانگا جائے تو وہ ضرور عطا کرتا ہے، واسطہ اور وسیلہ اسلام میں جائز ہے، بیٹی، حضرت آدمؑ کی تو بہ حضرت محمدؐ کا واسطہ دینے سے قبول ہوئی تھی۔“ اس عورت نے تفصیلاً سمجھایا۔

”مجھے پتا ہوتا یہ در بار ہے تو یہاں آ کر نہ بیٹھتی، جہاں غیر اللہ کے نام پر کھانے تقسیم ہوتے ہیں۔“ فروا طفر سے گویا ہوئی۔

”انسوس ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر بیٹی، کسی نے کتنا غلط بتایا ہے تمہیں۔“ وہ متاسف نظروں سے فروا کو دیکھ رہی تھی۔

”غیر اللہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ فروا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”اللہ کے پاک کلام میں سے ہی سورتیں اور آیات پڑھی جاتی ہیں اور اللہ کی مخلوق کو ہی کھانا کھلایا جاتا ہے، یہاں غیر اللہ کا کیا ذکر؟“ فروا چند ثانیے اسے دیکھتی رہی اور پھر سے گویا ہوئی۔

”اور یہ جو لوگ درباروں پر آ کر قبروں کو سجدہ کرتے ہیں یہ کیا ہے؟ حالانکہ آپؐ نے فرمایا تھا میری قبر کو میرے بعد سجدہ گاہ نہ بنالینا۔“ وہ درستی سے بولی۔

”کوئی سجدہ نہیں کرتا، آپؐ دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا کوئی مسلمان اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کر سکتا ہے، کلمے کی تو پہلی شرط ہی لا الہ الا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور پھر آپؐ نے یہ بھی فرمایا

کو؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”وہ دے چکے۔“ اس کے چہرے پر شدید اذیت رقم تھی۔

”آپ فکر نہیں کریں۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولا، اسے تکلیف میں دیکھ کر وہ خود بھی دکھی ہو گیا تھا۔

”مجھے ان کے بغیر رہنا نہیں آتا۔“ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنا درد کہہ گئی، دل بھرانے لگا، آنکھوں کے گوشے ہیسکنے لگے، تنہائی کا احساس، اس سے ہمیشہ کے لئے دور جانے کے احساس سے اس کو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

”وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، آپ کو ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔“ دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا، اس نے فوراً سانس دیکھا اور اپنی بیٹی کو دیکھ کر وہ ڈر گئی، مگر وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی اپنے شوہر کے قریب آئی۔

”آپ کے آفس کا ٹائم ہو رہا ہے، ناشتہ کر لیں آکر۔“ وہ خاصی روکھائی سے بول رہی تھی، وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

”اگر آپ یہاں آئی گئی ہیں تو پلیز ان سے کچھ مت کہیے گا، میں نہیں چاہتی کہ انہیں کچھ پتہ چلے۔“ وہ خاصی ناراض دکھائی دے رہی تھی، حلقے سے بھر پور لہجے میں بولی تو وہ خاموشی سے بیٹی کے چہرے کو دیکھنے لگی، مگر کچھ کہہ نہ سکی۔

”وہ چلے جائیں تو میں آپ کو ناشتہ دیتی ہوں۔“ وہ جاتے جاتے مزی۔

عین ممکن ہے میں پلٹ آؤں اس کی آواز میں بلاؤ مجھے میں نے بولا تھا یاد مت آنا جموٹ بولا تھا یاد آؤ مجھے وہ باہر نکل گئی تھی، اس پر یادیں ایک مرتبہ

تھا، مجھے اب اپنی امت سے شرک کا کوئی ڈر نہیں، مجھے اب اپنی امت سے شرک کا کوئی ڈر نہیں، سوائے شرک خفی کے، موسیقی کو حرام قرار دیا ہے، ہم اسے نہیں چھوڑتے، بندے کے خوف یا رضا کی خاطر اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔“ اس نے تفصیلاً سمجھایا۔

”میں پھر بھی نہیں مانتی ان درباروں کو۔“ فردا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بد بختی ہے تمہاری، خدا سے ڈرنا چاہیے اس کے پیاروں کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے۔“

”اوتھ، دربار پر منت مانتے سے میرا کام ہو جائے گا۔“ اس نے سبز عمارت کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا اور واپسی کی راہ لی۔

”آؤ گی، بیٹیں واپس آؤ گی، جب سکون کھو جائے گا، جب نقصان اٹھاؤ گی تو ضرور آؤ گی۔“ وہ عورت بول رہی تھی مگر فردا اس کی مزید کوئی بات نہ سننا چاہتی تھی اس لئے تیز قدم اٹھاتی اس سے دور ہونے لگی تھی، وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

وہ واپس بیڈ پر جا بیٹھی اور تسبیح پڑھنے لگی، دروازہ ہلکی سی دستک سے کھلا تھا، اس کے انداز نشست میں فرق نہ آیا، نہ ہی اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔

”السلام علیکم!“ وہ اس کے سامنے کھڑا اسے سلام کر رہا تھا، اس نے کمزور سی آواز میں جواب دیا، مگر اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

”میں آج جاؤں گا ان کے پاس، بات کروں گا ان سے۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”میں نے بتایا نہ وہ مجھے..... طلاق.....“

”ایسے کیسے دے سکتے ہیں وہ طلاق آپ

پھر یلغار کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

علیہ کی آنکھ کھلی تو فوری طور پر تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی، کہ وہ کہاں ہے، لیکن آہستہ آہستہ تمام حیات بیدار ہوئیں تو سب کچھ یاد آنے لگا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“ وہ اپنے قریب اجنبی مردانہ آواز سن کر چونکی اور اٹھ کر بیٹھنے لگی، مگر ٹانگ میں اٹھنے والی ٹیسے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔

”آپ میری گاڑی سے کرا گئی تھیں۔“ اس کی خوفزدہ سوالیہ نظروں کو پڑھتے ہوئے وہ شستہ انگریزی میں بولا علیہ اسے دیکھ گئی، اس وقت وہ ایک بیڈ پر پڑی ہوئی تھی، کمرے میں موجود واحد کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا، باہر گہری سیاہ رات پھیل چکی تھی، اس نے کلائی پر بندھی کھڑکی کو دیکھا۔

”مائی گاڈ۔“ رات کے ایک بجے کا وقت تھا، اسے یہاں آئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے، وہ لڑکا کمرے سے باہر نکل گیا تھا، واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھا۔

”یہ کھالیں، پھر میڈیسن دیتا ہوں آپ کو۔“ اس نے سہارا دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا، مگر علیہ نے اسے وہیں روک دیا، وہ ٹرے اس کے پاس رکھ کر پھر باہر نکل گیا۔

”ماما!“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”عدیل میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ نفرت سے بولی، وہ مسلسل روئے جا رہی تھی، جب وہی لڑکا دوبارہ اندر آیا۔

شکل سے وہ انگریز ہی لگتا تھا، اس کے نقوش انگریزوں جیسے تھے، مگر رنگت مشرقی مردوں جیسی تھی۔

”تم نے یہ کھایا کیوں نہیں؟“ وہ علیہ سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے ہموک نہیں ہے۔“ اس کی آواز بھرا مٹی اور پھر سے آنسو بہنے لگے۔

”تم رو رہی ہو؟“ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا وہ اس سے پوچھ رہا تھا، علیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں؟“ اب وہ وجہ جانتا چاہتا تھا اور جواب میں علیہ نے اسے ساری بات بتادی، وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، اس کے چہرے کے تاثرات بہت عجیب ہو رہے تھے۔

”تمہارے بچے ہیں؟“ علیہ کو اس کے سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ بولا تو علیہ حیرت سے اسے دیکھ گئی۔

”میرا نام ڈاکٹر تیسور عباس ہے، تم جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتی، چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو۔“ وہ باہر نکل گیا اور علیہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اس نے پاکستان کال کر کے ماما کو بتا دیا تھا کہ وہ عدیل کے پاس پہنچ گئی ہے، وہ فون پر اپنی طلاق کا بتا کر انہیں بریطان نہیں کرنا چاہتی تھی، اگلے دو روز تک وہ بمشکل تھوڑا سا چلنے کے قابل ہوئی تھی، اس دوران ڈاکٹر تیسور عباس نے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا، کھانے سے لے کر میڈیسن تھا، وہ ایک نرم مزاج، ہمدرد اور مہربان شخص تھا۔

☆☆☆

عروہ اور فاروقیٹ حسن دونوں ہی بے حد خوبصورت لگ رہے تھے، دونوں بچوں کے برتھ ڈے کا ایسا شاندار اہتمام کیا گیا تھا کہ لوگ

برسوں یاد رکھتے، فارقلیط حسن عروہ کو بتائے بغیر غنفر ہاؤس والوں کو انوائٹ کرنے گیا تھا، مگر وہاں جا کر اس پر جو انکشافات ہوئے تھے، انہوں نے اسے شکزد کر دیا تھا، اس نے بہت کوشش کی کہ عروہ کو فروا کے متعلق بتائے، اسے یہ بتائے کہ وہ اس کی دوست نہیں سگی بہن ہے، مگر وہ ہمت نہ کر سکا۔

”عروہ!“ رات گئے فنکشن ختم ہوا، سب لوگ بہت تھک گئے تھے، فارقلیط حسن کے کزنز اور دوست اس کے پاس بیٹھے تو انھیں کا نام ہی نہ لیا، وہ اب بہت کم ہی کسی کو میسر آتا تھا۔

”بی!“ وہ نماز پڑھ چکی تھی اور اب سونے کی تیاری کر رہی تھی، دونوں بچے سو چکے تھے۔ ”کل تمہارے پاپا کی طرف چلیں۔“ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا، عروہ غنفر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے انکار کیا، اب وہ لیٹ چکی تھی۔

”تمہارا جی نہیں چاہتا ان سے ملنے کو۔“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”نہیں۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔“ وہ بولا تو عروہ اٹھ بیٹھی اور اس کی جانب دیکھا۔

”آپ ایک ہی بات کو بار بار کیوں دوہراتے ہیں، جس بات کو میں بھلا چکی ہوں آپ مجھے وہ بار بار کیوں یاد دلاتے ہیں۔“ اسے اندازہ نہ ہوا تھا اور وہ اچھی خاصی برہم ہو گئی، جواب میں فارقلیط حسن خاموش ہو گیا، تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”دیکھیں فارقلیط۔“
”تم اگر بھلا چکی ہوتی تو یہ رویہ نہ ہوتا

تمہارا، تم اسی ایک بات کو لے کر کیا ہماری ساری زندگی خراب کرو گئی؟ کیا میری محبت، میری چاہت، میرا خلوص کچھ بھی یاد نہیں تمہیں؟“ وہ بہت کوشش کرتا تھا کہ اس کے اور عروہ کے درمیان سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے، مگر کچھ روئے کچھ الفاظ کے ٹھاء بھلائے نہیں جاسکتے اور عروہ غنفر کا دل بھی سہم گیا تھا، وہ سب بھلا نہ پار رہا تھا، جو فارقلیط حسن نے اسے کہا تھا۔

”میرے رویے کو کچھ نہیں ہوا، آپ کو صرف وہم ہے۔“ وہ دوبارہ لیٹ چکی تھی۔

”میں اگر تم سے دور ہو گیا نہ تو تم سہہ نہیں پاؤ گی عروہ!“ وہ جتلا رہا تھا۔

”دھمکی دے رہے ہیں؟“ اس نے رخ نہیں موڑا تھا۔

”احساس دلارہا ہوں تمہیں۔“ وہ حشکن زدہ لہجے میں بولا۔

”سنو۔“ وہ اٹھ کر گیا اور کچھ دیر میں واپس آ گیا، عروہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”آنکھیں بند کرو۔“ وہ سہہ رہا تھا، عروہ نے جھٹ سے آنکھیں بند کیں۔

”اب کھولو۔“ فوراً حکم کی قیل ہوئی۔

”واؤ۔“ فارقلیط حسن کے ہاتھ میں بہت خوبصورت ڈائمنڈ برسلٹ تھا۔

”بہت خوبصورت ہے۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی، اس کے ساتھ ہی ایک چپن تھی جس میں ڈائمنڈ سے ”عروہ“ لکھا ہوا تھا، فارقلیط حسن نے اسے برسلٹ پہنا دیا تھا۔

”اب یہ چپن تم مجھے پہنا دو۔“ وہ محبت بھرا اصرار کر رہا تھا، عروہ نے اس کی بات مان لی تھی، دونوں مسکرا رہے تھے، فارقلیط حسن خوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

زین ندیم خلاف معمول جلدی گھر آ گیا تھا،
انیتا بیک اسے کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی، وہ ماما
کو کال کرنے لگا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ سائیں۔“ وہ ان
سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح کافی مسکرا
رہا تھا، انیتا بیک اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی
تھی۔

”آپ جب حکم کریں گی، میں حاضر ہو
جاؤں گا۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بول رہا تھا، انیتا
بیک نے اسے گھور کر دیکھا، مگر وہ اسے انور کر رہا
تھا۔

”میں خود آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔“ اس
نے کچھ دیر بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔
”کس سے بات کر رہے تھے؟“ اسے سے
رہانہ گیا تو پوچھنے لگی۔

”اپنی کرل فرینڈ سے۔“ وہ گہری سنجیدگی
لہجے میں سوتے ہوئے بولا۔
”تو یہ ہے آپ کی شرافت۔“ وہ غصے سے
بولی۔

”تم جیلس ہو رہی ہو؟“ وہ ہنسی دباتے
ہوئے بولا۔

”میری جوتی ہوتی ہے جیلس، مجھے کیا
ضرورت ہے جیلس ہونے کی۔“ وہ غصہ دباتے
ہوئے بولی۔

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ وہ اس کے
چہرے کو جا چتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرا آپ سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے
کہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”رشتہ تو ہے، آپ نہ مانیں تو الگ بات
ہے۔“ زین ندیم اپنی پیکنگ کر رہا تھا۔

”میں دو دن کے لئے کوئٹہ جا رہا ہوں،
آپ پیکنگ کر لیں، آپ کو کراچی چھوڑ دوں گا،

آپ اپنے پیرشس سے مل لیں۔“ اس نے بات کا
رخ بدلا۔

”مجھے نہیں ملنا ان سے۔“ اس نے فوراً
انکار کیا۔

”وہ آپ کے پیرشس ہیں، آپ کو یاد کرتے
ہیں، آنٹی کی کچی دفعہ مجھے کال آئی ہے، آپ ان
سے بات بھی نہیں کرتیں۔“

”میرا جودل چاہے گا میں وہی کروں گی،
آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں۔“ وہ کس
قدر بدتمیزی سے بولی۔

”میں آپ کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا،
آپ کراچی ماما کے پاس چلی جائیں۔“ اس نے
کہا۔

”میں کوئی بچی نہیں ہوں، رہ سکتی ہوں
اکیلی، بلکہ بہت سکون سے رہ سکتی ہوں۔“ اس
نے رو دکھائی سے کہا۔

”آپ اکیلی رہ سکتی ہوں گی، مگر میں آپ
کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، بات کو سمجھیں۔“ وہ نرمی
سے بولا تھا۔

”میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“
اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔

”جب تک آپ میرے نکاح میں ہو، فکر
کرنا میرا فرض ہے۔“ اس کی بات پر انیتا بیک کا
چہرہ کھل اٹھا تھا، زین ندیم کمرے سے باہر نکل گیا
اور وہ اس کے لفظ ”جب تک“ میں کھو کر رہ گئی۔

☆☆☆

فردا بہت بوجھل دل کے ساتھ ہاسپٹل میں
داخل ہوئی تھی، میڈیسیاں چڑھ کر اوپر آئی،
آپریشن ٹیمز کا دروازہ کھلا تھا، وہ دھڑکتے دل کے
ساتھ آگے بڑھی، غصہ غلی اور موسیٰ علی کے پیرشس
تیزی سے اٹھے تھے، اندر سے ڈاکٹر نکلا، اس کے
چہرے پر مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔

سجدے کی حالت میں چلی گئی تھی، وہ اللہ کی منتیں کر رہی تھی، وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی، کیونکہ صرف وہی دے سکتا ہے، وہ سجدہ بھی اللہ کو کر رہی تھی، کیونکہ سجدہ بھی صرف اسی کو کیا جاسکتا ہے، ہاں وہ دربار میں موجود تھی، پاک بزرگ کے سامنے، پاک جگہ پر اور پاک جگہ پر مانگی دعائیں بھی تو جلد قبول ہوتی ہیں۔

☆☆☆

تیمور عباس کا چھوٹا سا گھر بہت خوبصورت تھا، وہ چاروں اطراف سے سبزے سے گھرا ہوا تھا، علیحدہ لوگ روم کی گلاس وال کے پاس جیمز پر بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی، تیمور عباس وہاں آیا تھا اور اس نے اس کے سامنے کافی کا بھاپ اڑاتا گگ رکھا تھا۔

”جھیک یو“ علیحدہ ہولے سے بولی۔

”مشرقی مرد بہت بے وقار اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔“ تیمور عباس اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنا کافی کا گگ اپنے سامنے رکھ لیا، اس کی بات پر علیحدہ نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا اور کافی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگی۔

”میری مدر امریکن تھیں اور قادر اعظمین، وہ یہاں روزگار کی تلاش میں آئے تھے اور پھر میری ماں سے شادی کر لی، اسے خوب لوٹا، گرین کارڈ ہولڈر ہو گیا اور ایک دن اسے اور مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا، میری ماں ایک سال بہت رونی اس دھوکے پر خوب تلملائی، میں تب دو سال کا تھا، پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی زندگی بنانے کا فیصلہ کیا، کلیم، پارٹیز، ہوائے فرینڈز، اسی طرح میں دس سال کا ہو گیا اور اب میری ماں گھر سے راتوں کو غائب رہنے لگی تھی اور ایک دن وہ مجھے گرینڈ ما کے پاس چھوڑ کر اپنے ہوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی، گرینڈ ماں نے مجھے ہاسل میں

”آئے ایم سوری“ وہ فقط اتنی ہی بول پایا تھا، سامنے کھڑے تینوں نفوس ساکت ہو گئے تھے اور خود فرو کا دل بھی۔

”نہیں۔“ اس کے لب پھڑپھڑائے اس کا وجود پتھر کا ہو گیا تھا، اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر وہ مل بھی نہ سکی۔

”وہ یا تو اسے آزماتا ہے جس کی محبت پر

اسے بہت یقین ہوتا ہے، یا پھر اسے آزماتا ہے۔“ جس کا یقین اس کی محبت پر ڈاٹو ڈول ہو رہا ہوتا ہے۔“ اس کے آس پاس ایک آواز ابھری تھی۔

”اللہ بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا بیٹا۔“ وہ تیزی سے مڑی تھی اور برق رفتاری سے سیزمیاں اترنے لگی تھی۔

کافی تیز ہوا چل رہی تھی، وہ بھاگنے لگی تھی، اس کا رخ دربار کی جانب تھا۔

”خدا سے ڈرنا چاہیے اس کے پیارے بندوں کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے۔“ وہ اور زور سے بھاگنے لگی تھی، اس کے پاؤں میں سے جوتا اتر گیا تھا، سانس دھونکی کی مانند چل رہا تھا، وہ دربار کے باہر پہنچ گئی تھی۔

”اللہ!..... میں مانتی ہوں تیرے..... اس بندے..... کو..... تیرا..... پیارا..... مجھے..... ایک بار..... معاف کر..... دے..... موسیٰ مجھے واپس کر..... دے..... اپنے پیارے..... بندے..... کے واسطے..... تجھے اس..... بندے..... کی..... محبت..... اور..... عبادت کا..... واسطہ..... مجھ سے..... موسیٰ علی..... کو دور..... نہ کرنا۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی، آتے جاتے لوگ اسے تاسف سے دیکھ رہے تھے، وہ بہت ہی پریشان حال دکھائی دے رہی تھی، ہوا تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور اس کے آنسو بھی۔

روتے روتے وہ نیچے گر پڑی تھی، اب وہ

کا ترجمہ لکھ کر تیمور کو تھمایا، اس نے بے دلی سے کاغذ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔
وہ اسے ایئر پورٹ چھوڑنے گیا تھا، پتا نہیں کیوں علیہ کو وہ اداس لگا تھا۔

”آپ نے میری بہت میلپ کی ہے اور مہمان نوازی اس کے لئے آپ کا بہت شکریہ، اللہ بھی بھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا، جو آپ نے کھو دیا وہ واپس نہیں آئے گا مگر آگے وہ آپ کو بہت کچھ دے گا۔“ وہ اسے ہاتھ ہلاتی آگے بڑھ گئی، تیمور عباس اداسی سے وہیں کھڑا رہا اور پھر جہاز کے رن وے پر دوڑنے سے فلاحی کرنے تک وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا، زندگی میں پہلی بار اسے کسی انیت اور اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔

اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا تھا، آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اس نے نشوونما کے لئے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، تو وہ کاغذ اس کے ہاتھ میں آگیا۔

”There is no God“
but Allah, and prophet
Muhammad peace be
upon him is the messenger
of Allah“ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک
تواتر سے بہنے لگے تھے، وہ پڑھنے لگا اور نظریں
اوپر اٹھا کر دور جاتے جہاز کو دیکھنے لگا، وہ بار بار
کلمے کا ترجمہ پڑھتا تھا، اس کے دل نے عجیب سی
خوشی محسوس کی تھی، ساری اداسی یکلخت غائب ہو
گئی تھی۔

”Now, i am muslim.“
آنسو پونچھتا ہوا پارکنگ میں اپنی گاڑی کی جانب
بڑھا، اس کے لب مسلسل بل رہے تھے۔

☆☆☆

زین ندیم کا سامان گل خان نے گاڑی میں

داخل کروادیا اور یوں میری زندگی تہا گزری، وہ
دونوں بہت خوش ہوں گے اپنی زندگیوں میں، مگر
میں ان سے شدید نفرت کرتا ہوں۔“ علیہ کو اس
کی باتیں سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔

”آپ کے فادر مسلم تھے؟“ یہ سب کچھ
بتاتے ہوئے تیمور عباس کے چہرے پر شدید
اذیت تھی، مگر اب جیسے وہ پرسکون ہو گیا تھا، وہ
کافی پینے لگا تھا۔

”ہاں وہ مسلم تھا اور میری ماں کرچین۔“
اس نے کپ میز پر رکھتے ہوئے علیہ کی جانب
دیکھا۔

”اور آپ؟“ علیہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے
اس سے پوچھا۔

”میں کچھ بھی نہیں۔“ اس کی بات پر علیہ
پہلے حیران ہوئی اور پھر ہنسنے لگی۔

”کچھ تو ہونا چاہیے آپ کو۔“ وہ بولی تو
تیمور عباس چونکا۔

”مسلم یا کرچین۔“ وہ آنکھیں پھاڑے
اسے دیکھتا رہا۔

”میں آپ کو کلمہ پڑھا دوں؟“ علیہ نے
اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ تیمور عباس نے سرفی میں ہلایا۔
”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ وہ کافی کے
خالی گلاس اٹھا کر چلا گیا، علیہ کا پاؤں ٹھیک ہو گیا
تھا، رات گیارہ بجے کی فلاحیت سے وہ گھر جا رہی
تھی، اپنے گھر، اپنے وطن پاکستان۔

”تم مجھ سے ناراض ہو؟“ تیمور عباس اس
کے پاس آیا، وہ پیننگ کر رہی تھی۔

”مذہب کے معاملے میں زبردستی نہیں
چلتی، جب آپ کا دل مانے آپ کلمہ پڑھ لیجئے
گا، اللہ آپ کے تمام دکھ اور تکالیف دور کر دے
گا۔“ علیہ نے ایک صفحہ پر کلمہ اور انگلش میں اس

سب کر رہی ہو؟“ ان کا جی چاہ رہا تھا انتیابیک کا خون پی جائیں۔

”میں نواز کو پسند کرتی ہوں، میں نے پہلے روز ہی آپ کے بیٹے کو بتا دیا تھا اور اسے کہا تھا مجھے ڈائیورس دے دے، یہ ہی مجھے زبردستی.....“

”چنانچہ“ زوردار تھپڑ کی آواز پر زین ندیم نے زمین میں گڑی نظریں اور براٹھائیں۔

”بے شرم، بے حیا لڑکی۔“ وہ زور سے دھاڑیں۔

”تم میرے بیٹے کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو، تم اسے ڈیز رو ہی نہیں کرتی، دفعہ ہو جاؤ یہاں سے، زین!“ وہ مڑ کر اس کے پاس آئیں۔

”طلاق دوا اس بد کردار لڑکی کو۔“ انہوں نے بیٹے کا شانہ ہلایا۔

”مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ، مجھے طلاق دو، ابھی اور اسی وقت۔“ وہ بے خوفی سے زین ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

وہ سمجھی تھی زین کو سہ چلا گیا ہے، اس نے نواز کو پہلے ہی بتا دیا تھا، ادھر زین ندیم گھر سے نکلا، ادھر نواز اس کے پاس تھا، مگر وہ بے حد خوش تھی کہ اس کا کام خود ہی ہو گیا تھا۔

”بہت بچھتاؤ گی۔“ زین ندیم اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں چھانکتے ہوئے بولا، اس کے چہرے پر شدید اذیت تھی۔

”جس ذلت سے تم نے مجھے دو چار کیا، میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔“ اس نے انتیابیک کو آزاد کر دیا تھا، وہ چلی گئی تھی، زین ندیم ماما کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح رویا تھا، اس کے آنسوؤں نے شمینہ بیگم کو دھلا دیا تھا، وہ تو زندگی میں کبھی نہ رویا تھا۔

”اس نے میرے ماتھے پر رسوائی کا ایسا داغ لگایا ہے جو کبھی نہ دھلے گا ماں۔“

رکھ دیا تھا، وہ کچھ دیر کے لئے آفس گیا، کچھ ضروری کام نمٹا کر وہ ایئر پورٹ گیا تھا ماما کو لینے۔

”کمزور ہو گئے ہو۔“ وہ بولیں تو زین ندیم ہنس دیا۔

”کہاں ماما، بالکل ٹھیک ہوں۔“ زین نے ماما کو بلوایا تھا، انتیابیک کے لئے تیار نہ تھی اور وہ اسے اکیلے نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔

”انتیابیک تمہارا خیال تو رکھتی ہے نا؟“ گاڑی وسیع و عریض گھر میں داخل ہوئی تو ماما اس سے استفسار کرنے لگیں۔

”میں کوئی بچہ توڑی ہوں ماما۔“ وہ ٹالتے ہوئے بولا، اس نے انتیابیک کو ماما کی آمد سے متعلق نہیں بتایا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ منع کر دیتی۔

دونوں ماں بیٹا اکٹھے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے، زین ندیم بہت خوش اور فریٹ تھا، مگر سامنے جو منظر تھا اس نے اس کی مسکراہٹ چھین لی تھی، اس کی آنکھوں میں پہلے بے یقینی اور پھر غصہ ابھرا تھا، جبکہ شمینہ بھی شاکد تھیں۔

انتیابیک سامنے صوفے پر نواز کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی، اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی، وہ اور نواز باتوں میں مگن تھے، جب انتیابیک کی نظر سامنے انھی اور اس کا سانس سینے میں اٹک گیا۔

”آپ.....؟“ وہ تیر کی سی تیزی سے انھی تھی، نواز بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”یہ..... یہ..... سب کیا ہے زین!“ ماما نے مڑ کر زین کے جھگے ہوئے سر کو دیکھا۔

”کون ہے یہ لڑکا؟“ زین کو خاموش پا کر وہ آگے بڑھیں اور ان دونوں کے قریب گئیں۔

”میرے بیٹے میں کس چیز کی کمی تھی جو تم یہ

”بس میرے بچے۔“ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے کہ اس کی پیشانی چومی۔
 ”وہ بد نصیب ہے جو میرے بیٹے کو ٹھکرایا، بچھڑائے گی۔“ وہ اسے بہلا رہی تھیں، ان کے دل سے انتہا بیک کے لئے بہت بددعاں نکلی تھیں۔

☆☆☆

فروا وہاں سے واس ہاسپل نہیں گئی تھی، بلکہ گھر آگئی تھی، اس نے اپنا موبائل فون آف کر دیا تھا، لینڈ لائن سیٹ کا کنکشن کاٹ دیا تھا، وہ خوفزدہ سی صوفے پر پاؤں کیے بیٹھی تھی، اسے وہاں بیٹھے کئی گھنٹے گزر گئے تھے، جب لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا، بابا اور نویلہ کو آتے دیکھ کر اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔

”نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں..... ہو سکتا..... بابا..... کچھ مت..... بولنا۔“ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی، غضبناک اور نویلہ تیزی سے اس کے قریب آئے تھے۔

”فروا موسیٰ کو ہوش آگیا ہے بیٹا۔“ غضبناک نے اس کے کانوں سے ہاتھ ہٹائے۔
 ”نہیں۔“ وہ سر کوئی میں ہلانے لگی۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے خود سنا تھا۔“ اور اس سے آگے وہ بول ہی نہ سکی۔

”ہم بھی حیران ہیں اور ڈاکٹر ز بھی، ڈاکٹر ز نے میڈیکل میسج کو dead قرار دے دیا تھا، مگر کچھ دیر کے بعد اس کا جسم حرکت کرنے لگا۔“

غضبناک نے اسے بتا رہے تھے اور وہ بے یقین سا چہرہ لئے بھی انہیں اور بھی نویلہ کو دیکھتی تھی، اگلے ہی روز وہ اسی دربار پر گئی تھی اور اس نے وہاں بہت سا کھانا تقسیم کیا تھا، صرف اور صرف اللہ کے نام پر اللہ کی مخلوق میں۔

☆☆☆

علیہ کی طلاق کی خبر نے صوفیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، انہیں عدیل سے ایسی امید تو نہ تھی، وہ فوراً بھائی کے پاس دوڑی گئی تھیں، مگر انہوں نے عدیل کی اس حرکت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بہن سے معافی مانگنا چاہی۔

”میں آپ لوگوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی، میرے بھائی اور بہن کی اولادیں اس قابل ہی نہ تھیں کہ میں ان سے رشتہ جوڑتی۔“ وہ انہیں سخت ست سنا کر وہاں سے آگئی تھیں، غضبناک علی یہ خبر سن کر چپ ہو گئے تھے۔

”فروا کے لئے تو بہت درد اٹھ رہا تھا، آپ کے دل میں، کیا میری بیٹیوں کی کوئی فکر نہیں آپ کو؟“ غضبناک علی انہیں ایک نظر دیکھ کر وہاں سے اٹھے اور علیہ کے روم میں آ گئے۔

”بابا!“ وہ سامنے بیڈ پر بیٹھی تھی، دوڑ کر ان کے گلے لگی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”بس میرا بچہ۔“ غضبناک علی کی آنکھ سے آنسو نکل کر علیہ کے بالوں میں گم ہو گئے، وہ ان کے سینے سے لگی سسک رہی تھی اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکتے تھے، وہ جانتے تھے ان کی کل افزاء کے ساتھ زیادتیاں اور ان کی بیوی کے گناہوں کی سزا انہیں بیٹیوں کو ملنے والے دکھوں کی صورت میں مل رہی تھی، مگر وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ بے بس تھے، انہیں معلوم تھا کہ دنیا مکافات عمل ہے۔

”بس میزا بیٹا تو بہت بہادر ہے۔“ وہ اسے ساتھ لگائے بیڈ تک لائے، اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئے۔

”کسی دھوکے باز اور بے وفا کے لئے آنسو نہیں بہاتے، آج آخری مرتبہ رولو، دوبارہ نہیں رونے دوں گا۔“ علیہ نے ان کی گود میں سر رکھ لیا، غضبناک علی کا ہاتھ اس کے سر پر ٹھہر گیا تھا۔

(جاری ہے)

امام ايمان قاضی



اندر آئی تھیں، رخِ سخن اسی کی طرف کر کے سختی سے کہا تھا۔

”مجھے پتہ تھا کہ تم کام سے بچ کر یہاں ہی چھپی بیٹھی ہو گی، اٹھو میری دوست آئی ہیں، جائے بنا دو، اماں جی کو شاید آکر دبا دیتی ہے۔“ عائشہ کچھ کہے بغیر اٹھ گئی تھی، اماں جی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھیں، پتہ تھا کہ عائشہ اب شاہدہ بیگم کے ہتھے چڑھ چکی ہے تو رات گئے ہی فارغ ہو گی اور شاید بھی کسی ان کے پاؤں دبانے نہیں آنے والی تھی، ایسا تو کئی مرتبہ ہو چکا تھا اس گھر میں کہ عائشہ کو اس گھر میں رکھنے کی سخت مخالفت کرنے والی شاہدہ بیگم ہی اس سے سب سے زیادہ استفادہ حاصل کرتی تھیں۔

وہ ایسے ہی اسے اماں جی کے پاس سے اٹھا کر لے جاتیں چاہے وہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ کر رہی ہوتی، اپنے کسی نہ کسی کام سے بلا کر وہ

”اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کریں ان پر خاص اپنے میں سے چار مردوں کی گواہی لو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھر میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت اٹھالے یا اللہ ان کی کچھ راہ نکالے اور تم میں سے جو مرد اور عورت ایسا کام کریں ان کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نیک ہو جائیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“ (سورہ انشاء القرآن)

اس کی آواز کی رقت تھی یا ان مقدس اور الہامی الفاظ کا اثر کو وہ خود بھی زار و قطار دی تھیں، تھوڑی ہی دیر میں عائشہ نے قرآن پاک بند کر اپنی مخصوص جگہ پر رکھا اور ان کے پاس آن بیٹھی، اماں جی خود بھی بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں سولیت چکی تھیں، عائشہ نے ابھی ان کے پاؤں دبانے شروع ہی کیے تھے کہ شاہدہ بیگم دروازہ کھول کر

مکمل ناول



بہی کہتی کہ یہ کام شانہ جوان کے دوسرے نمبر والی بیٹی بھی، آکر مکمل کر لے گی، یہ اور بات تھی کہ شانہ بھی بھی وہ کام مکمل کرنے نہ آئی تھی، ہمیشہ عائشہ کو ہی آکر مکمل کرنا پڑتا تھا، اس کے علاوہ شاہدہ بیگم اور ان کی اولاد کو اس کا بردہ کرنا سخت نا پسند تھا، اس پر بھی اسے سخت سننے کو ملتی تھیں خصوصاً جب وہ گھر کے اور باہر کے مردوں کے سامنے نقاب لگا کر جاتی تھی۔

”دیے یہ اماں جی کی نوکرانی اس ڈراے سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں کہ ہمارے گھر کے مرد کوئی ایسے ویسے ہیں یا بچے لٹکے ہیں جو اس حور پری کو دیکھ کر چیخنے کھڑے ہو جائیں گے۔“ گھر کی بڑی بیابھی بیٹی رائے پہلے پہلے تو تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی تھی جب چائے لے کر آئی تو اس کے چہرے پر نقاب تھا جو یقیناً اس کے خاوند کی موجودگی کے باعث تھا جس کو جان کر اس نے اچھا خاصا پنگامہ کھڑا کیا تھا، وہ تو اس کا نقاب اتروانے پر مصر تھی کہ اس بات کی وجہ سے اس کے شوہر نامدار نے ٹھک ٹھاک برا منایا تھا وہ تو شکر ہوا اماں جی اس کی مدد کو آن پہنچی تھیں، تب جا کر انہوں نے اس کی جان بخشی کرانی تھی ورنہ رائے اس کا نقاب اتارنے کے در پے تھے، رائے نے تو اسی دن سے اس سے میر ہی باندا لیا تھا۔

☆☆☆

سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے، کبھی بچپن میں اس نے سنا تھا مگر اس کو برتا بہت ہی خوفناک تھا اس کے لئے، وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس نے ایک دو دفعہ بچپن میں کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا، اتنی ہی ظالم، اتنی ہی خوفناک مگر صرف سیکندہ کے لئے، سوتیلی ماں حمیز میں ایک عدد نشی بھائی بھی ساتھ لائی تھی اور اس کی ذات کا مثبت پہلو صرف

خوبصورت ہونا تھا، اس کے باپ نے صرف اس کی خوب صورتی کو دیکھا تھا پھر اس عورت نے عمر بھر اسی ایک خوبی کی بنا پر شوہر کے دل اور گھر پر راج کیا تھا اور اسے یہ بات میسر بھلا دی تھی کہ اس گھر میں اس کی ایک بیٹی بھی تھی جو اس کی پہلی بیوی سے تھی اور اس کی سگی اولاد تھی، سات سال میں اس خون آشام بلانے پانچ بچے پیدا کیے اور پالنے کے لئے سیکندہ کے حوالے کر دیئے، پہلے دن جب اس نے اس کا بستہ اٹھا کر پھینکا اور اپنا بچہ اس کی گود میں دیا، اس نے مدد طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھا تھا کہ ہو سکتا ہے اس کے منہ پر سوتیلی ماں کے پڑنے والے پھٹروں نے کوئی اثر ڈالا ہو اور وہ اس عورت کو روک سکے، زبان تو خیر وہ پکڑ نہیں سکتا تھا مگر ہاتھ تو روک سکتا تھا مگر بے فکری سے سڑک سڑک کر چائے پینے اس مرد نے ایک ہمدردی بھری نگاہ بھی اس پر ڈالنا گوارا نہیں کی تھی۔

”جن لڑکیوں کی مائیں مر جاتی ہیں شاید ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے ہیں۔“ تو سالہ سیکندہ کے ناچختہ ذہن کی یہ پہلی پختہ سوچ تھی، اس دن اس نے اپنے اندر ایک گہرا سمندر بتا لیا تھا جس میں اپنا ایک ایک آنسو ڈال کر اسے مزید گہرا کرتی گئی تھی۔

☆☆☆

”کیا عیش ہیں بھی روز تیرے، جو بھی گا یک آتا ہے، تجھ پہ ہی فدا ہو جاتا ہے، کیا جادو کرتی ہے، کچھ ہمیں بھی بتا دے، ہم بھی وہ منتر سیکھ لیں۔“ آنکھیں مٹکاتے ہی نے اس سے کہا تو ایک پھٹکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”تم مجھ سے کئی گنا زیادہ خوب صورت ہو رہی، مگر ایک واحد چیز جو تم میں جدا ہے وہ اس جگہ

ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا میری چندا کو، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اسے ایسے کسلندی سے بیٹھا دیکھ کر وہ تشویش سے بولیں، ساتھ ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپک کیا۔

”دیکھو میری بچی، ہم میں سے کوئی بھی اس راستے پر اپنی مرضی سے نہیں آیا، کسی کو غربت مجبور کیا تو کسی کے رشتے اس کے لئے امتحان بن کر کھڑے ہو گئے، اس چیز کو جتنی جلدی قبول کر لوں گی اتنا ہی تمہارے حق میں اچھا ہوگا، مجھے دیکھو۔“ انہوں نے آہ بھر کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کوئی کہہ سکتا ہے کہ میری نانی، پھر میری ماں قرآن کا درس دیتی تھیں، بچوں کو بچوں کو بتاتی تھیں کہ قرآن کیا ہے؟ اس کے مطابق زندگی گزارنے کا کیسا اجر ہے اور اس سے روگردانی کرنے والے کا کیسا انجام اور کیسی سزا؟“ ان کی آواز بھرا گئی، روز کے بھی آنسو گالوں پر پھسل آئے۔

”مگر ہوا کیا، خاوند کی ناگہانی موت نے ان تمام رشتہ داروں کو خونخوار بھیڑیوں میں بدل دیا جو کچھ میرے لئے سائبان کی صورت تھے مگر سر پہ اصل سائبان کے بٹنے ہی عزت کے درپے ہو گئے، ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو ایک بیوہ کو تحفظ دیتا، یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتا، ان سب کو اس خوب صورت چہرے اور جسم کی چاہ تھی، اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے..... کچھ بھی..... مگر ایک جائز کام اور شرعی حکم کے لئے ان کے آگے کسی قدغن تھیں، کسی کو بیوی بچوں کا خوف تھا تو کسی کو معاشرے کا ڈر، ماں نے مرثی کی طرح پروں میں چھپا کر رکھا تھا عمر بھر، نہ کوئی ہنر تھا نہ تعلیم، خوب صورتی جو بعد میں

اور پیشے سے میری نفرت اور تمہاری محبت ہے، میری نفرت میرے گریز کو بڑھا دیتی ہے، وہ گریز شاید دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، تم میں دولت کی چاہ ہے، اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی دھن ہے جو ہمیں اس نگر کے قریب سے قریب لا رہی ہے اور میرے حالات اور مجبوریاں بھی مجھے مائل نہیں کر پا رہے اس طرف، میں تو اپنے گھر میں بھی ڈار سے پچھڑی کونج جیسی تھی، اس نگر میں بھی راستہ کھوئے ہوئے جگنو کی طرح ہوں، جس کی اپنی روشنی بھی اب مستعار لے لی گئی ہے، شاید وہ کھویا گیا راستہ ہی ڈھونڈ لیتا۔“

”اب میں سمجھی، تمہارا یہ خوب صورت انداز، نہ سمجھ آنے والی باتیں ہی لوگوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی ہیں اپنی طرف، سب سے بڑھ کر یہ قاتل آنکھیں جو اپنے اندر نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں سموئے ہوئے ہیں یہی جب اٹھتی ہیں تو مقابل کو کراڈالتی ہیں۔“

”آئی سے تمہاری سفارش کروائی ہے، کہ کچھ دن بچی کے گھر بھیج دیں تاکہ ہماری بھی روزی رولی کا سامان بنے جو تمہاری آمد سے ٹھپ ہوا ہے تو دوبارہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“

”کون میں..... میں گھر جاؤں گی؟“ بیسلی سیاہ آنکھیں اٹھا کر اس نے زہنی سے پوچھا تھا۔

”ہاں ناں تم اور کون؟ آخر کو اس ہفتے سب سے زیادہ پرائٹ لا کر دیا ہے آنٹی کو، بہت خوش ہیں وہ تم سے، شام کو ہم سب کو فم دکھانے اور کھانا کھلانے لے کر جا رہی ہیں اور تیاری باندھ کر رکھو، کل ہی تم اپنے گھر جا رہی ہو وہ بھی پورے ہفتے کے لئے، اب موڈ ٹھیک کرو، میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ بہنی اس کا گال تپتپہا کر باہر نکل گئی، اس کے پیچھے ہی آنٹی کمرے میں داخل

کیا تھیں اور کس گھر سے تھی ورنہ جی نہیں پاؤ گی،
بچی کے ضمیر کی مار بڑی سخت ہوتی ہے، اسے ہر کوئی
برداشت نہیں کر سکتا۔
”جاؤ شاہاباش کچھ دن گھر گزار آؤ، دل بہل
جائے گا تمہارا۔“

تین سال گزرنے کے بعد بھی وہ اس
روٹین کی عادی نہ ہو پائی تھی، بلکہ اسے تو آج
تک یقین ہی نہیں آ سکا تھا کہ سوتیلی ماں جتنی بھی
ظالم ہو، کیا کوئی سوتیلی ماں ایسا بھی کر سکتی ہے، ابا
کو چار سال پہلے ہی بی بی کے موذی مرض نے جکڑ
لیا اس کے علاوہ تین جوانی کی دلہیز پر کھڑی اس
کی بہنیں اور دو بھائی ابا کے گھر بیٹھ جانے پر
فاقوں مرنے لگے جب اماں کے نشی بھائی کو یہ
زر خیز آئیڈیا آیا تھا جس کو اس نے بہن کے کان
میں کیا انڈیلا کہ وہ فوراً ہی اس کو شہر بھوانے پر
راضی ہو گئی تھی، عمر بھر مار مار کر اس کے ہاتھ اور
جسم پر زخم ڈال دینے والی اماں نے بے حد ٹیٹھے
لجھے میں اسے اس کے باپ کی بیماری اور گھر کی
حالت بتا کر کہا تھا کہ اس کا ماموں اس کے لئے
شہر میں نوکری کا بندوبست کر کے آیا ہے، اسے
وہیں رہنا ہوگا۔

مہینے کے آخر میں وہ گھر تین دن کے لئے
آئے گی اور اگر باپ کو مرنے سے بچانا چاہتی
ہے تو جو بھی کام مالکان کروا میں اسے ہر صورت
کرتا ہوگا، سترہ سالہ وہ لڑکی ہر مشکل اور سخت کام
کا تصور لے کر ماموں کے ساتھ شہر آئی تھی جس
نے آٹنی سے پہلے ہی بات کی ہوئی تھی، اگلے دو
دن بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا اس نے
کبھی آخری حد پر بھی جا کر کبھی نہیں سوچا تھا،
بظاہر وہ ایک پارلر تھا، انہیں باقاعدہ پارلر کا کام
سکھایا بھی جاتا تھا، ہاں پارلر میں کسٹمرز کو ڈیل
کرنے کے لئے اور لڑکیاں تھیں، گھر میں اس

میرے لئے ایک انمول تحفہ بنی، ایک وقت میں
وہاں تھی میرے لئے، یتیم بچے کا ساتھ وہ بھی
فیلکسیا جیسی موذی بیماری کا شکار، جس کو ہر دو
ماہ بعد خون کی ضرورت ہوتی تھی جو ہزاروں
روپوں میں ملتا تھا اور تو اور بچے کو ہسپتال لے
جانے کے لئے میرے پاس پیسے بھی نہیں ہوتے
تھے، اللہ بھی کسی دشمن کو جیمی اولاد کی آزمائش نہ
دکھائے، میں اپنے بچے کو مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی،
پھر میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور مشکل
فیصلہ کیا جس نے مجھے اندر سے مار دیا تھا، میں
نے اپنے ضمیر کو مار کر ایک بیوی پارلر کی بنیاد رکھی
جس کی آڑ میں، میں نے اپنے جیسے کچھ خواتین کو
شامل کیا اور وہی لوگ جنہوں نے کبھی دنیا تو کبھی
اولاد اور کبھی بیوی کے ڈر سے ایک بیوہ اور یتیم
بچے کو دھتکار دیا تھا، اس وقت وہ سارے ڈر،
خوف بھول کر میرے پاس آئے اور پھر آتے ہی
رہے، میرا بچہ بہت عرصہ نہ جی سکا تھا مگر اس کے
بعد میرے لئے اس جگہ اور کام سے الگ ہونا نا
ممکن ہو گیا تھا، میں کوئی پیشہ ور فاحشہ نہیں ہوں
میری بچی، یقین کرو جس روز ہمیں کوئی مخلص
ساکھی مل گیا جو تمہیں قبول کر لے گا، تمہارے ماں
باپ مانیں یا نہ مانیں، میں تمہیں اس کے ساتھ
رخصت کر دوں گی، لیکن یہ بات تم بھی جانتی ہو
اور میں بھی کہ ہمارے معاشرے کے یہ عزت
کے نام نہاد ٹھیکیدار اپنے نفس کی تسکین کے لئے تو
ہم جیسی عورتوں کے پاس آنا اور سراہنا پسند کرتے
ہیں مگر ان کو گھر کی عزت بنانے کی جرأت کوئی
ظرف والا مرد ہی کرتا ہے جو لاکھوں میں ایک
ہوتا ہے، میں تو عمر کا بڑا حصہ گزار چکی، وہ مرد
میرے حصے میں تو نہیں آیا، تمہارے لئے دعا
کروں گی کہ ایسا جی دار تمہیں ضرور مل جائے،
تب تک ایسے ہی چلنے دو اور بھول جاؤ کہ تم پہلے

عائشہ نے پہلے آرام سے اور پھر کچھ لمحے انتظار کے بعد زور سے دستک دی تھی۔

”کہاناں میں نے کھانا نہیں کھانا، سو رہا ہوں ڈسٹرب مت.....“ دروازہ کھول کر وہ دھاڑا تھا مگر سامنے اماں جی کی ملازمہ خاص کو دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی، عائشہ الگ اس کی دھاڑ سے سہم کر تھوڑی دور جا کھڑی ہوئی۔

”وہ..... وہ اماں جی بلارہی ہیں آپ کو۔“ تھوک نکل کر اس نے کہا اور فوراً ہی وہاں سے چل دی، مبادا وہ ناراض بندہ اسے اور سخت ست سا ڈالے، کمرے میں آ کر اس نے اپنی سانس درست کی اور اماں جی کی مالش کرنے لگی، بتا دیا تھا اماں جی کو کہ کوئی ملازم نہیں تھا وہ خود ہی ان کا پیغام دے آئی تھی۔

”ایک بات پوچھوں اماں جی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں ہاں عائشہ! میں نے تمہیں بتی کہا ہی نہیں مانا بھی ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟“ وہ بے حد محبت سے بولی تھیں۔

”یہ آپ کے پوتے ایسے کیوں ہیں، اتنے تلخ اتنے ناراض، میں نے کبھی بھی ان کو کسی سے ٹھیک طرح سے بولتے نہیں دیکھا اور تو اور آپ سے بھی، جبکہ آپ بتاتی ہیں کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور دنیا میں شاید وہ واحد انسان آپ ہیں جن کی بات مانتے ہیں وہ۔“

چھ ماہ کے اس عرصہ میں وہ اپنے خول میں سمٹی رہی تھی، کبھی بھی کسی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ اس کی عادت ہی نہیں تھی وہ لینے والی، پھر اتنا عرصہ ان سب کے ساتھ رہتے سب کے بارے میں ہی جان ہی گئی تھی، سوائے اس اکٹھ بندے کے جس کی بے رخی پر بات کرتے ہوئے اس نے دو تین بار شائستہ اور شاہدہ

کے علاوہ پانچ لڑکیاں اور تھیں، ایک باقاعدہ استادان کو لب و لہجہ کی اور ادب و آداب کی تعلیم دینے کے لئے مقرر تھا، تین اسی کی طرح اپنے ہی رشتوں کی ڈی ہوئی تھیں، بنی کا تعلق بھی ایک غریب گھر سے تھا، وہ صرف جلد از جلد پیسہ کما کر اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی تھی، نادان کو سمجھ نہیں تھی کہ عزت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوتی، گزرے ان تین ساڑھے تین سالوں میں اس کے باپ کی حالت تو روز بروز بگڑی ہی تھی ہاں گھر کے حالات کافی بہتر ہوئے تھے، اماں نے دو بہنوں کی بھی شادی کر دی تھی۔

☆☆☆

”عائشہ! آج نیچے شور شرابا کم ہے، خیریت تو ہے ناں؟“ وہ ان کے کپڑے بدلوا کر فارغ ہوئی تو انہوں نے تشویش ظاہر کی۔

”جی اماں جی! رائنہ کی سالگرہ ہے تو سب وہاں گئے ہیں۔“ وہ اب ان کی ٹانگ اور بازو پر مالش کرنے والی دوا لے کر ان کے پاس آن بیٹھی تھی۔

”تم ایسا کرو، نیچے جا کر کسی ملازم سے کہو غبی اگر گھر پر ہے تو اسے میرے پاس بھیجے۔“

”جی اماں جی!“ وہ تیل ان کے پاس رکھ کر سیرھیاں اتر کر نیچے آ گئی، خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا، کوئی ملازم بھی موجود نہیں تھا، کچھ سوچ کر اس نے نقاب درست کیا اور لمبا کوریڈور عبور کر کے اس آخری کمرے کی طرف آن رکی جہاں دنیا جہاں سے ناراض بندے کا کمرہ تھا، اس سے تو خیر اس کا کبھی براہ راست ٹاکرہ ہوا نہیں تھا مگر وہ دیکھتی تھی کہ ہر ایک سے بات کرنے کا اس کا ایک ہی انداز تھا، ویسے تو وہ گھر پر کم ہی ملتا تھا ہاں اس کے اکٹھ اور ناراض رویے پر شاہدہ بیگم اور شائستہ اکثر کڑھتی نظر آتی تھیں،

غنی کو حاصل کرنے کے لئے یہ بہروپ اپنائے ہوئے تھی، میری اجازت سے ہی اس نے اس سے شادی کر لی، ڈیڑھ سال ہی رہ سکی تھی یہ شادی کہ وہ عورت مخلص نہ تھی اس کے ساتھ، غنی کی خواہش تھی کہ وہ گھر بستی سنبھالے مگر اسے گھر سے باہر رہنے کی عادت تھی، مردوں سے سراہنے کی چاہ تھی، یہاں بھی اس نے اس کی مان لی اور نوکری کی اجازت دے دی، شادی کے بعد بھی کچھ بدعادات پر چمکا رہا تا اس کے بس میں نہیں تھا جن میں مردوں سے آزادانہ میل جول اور شراب نوشی تھی۔“ جہاں اماں جی کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش در آئی تھی وہاں عائشہ نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”قدرت کی طرف سے آزمائش تھی یا شائے اور شاہدہ کی بددعائیں کہ ان کی زندگی میں مسائل اور جھگڑے بے حد بڑھ گئے تھے جب اس عورت نے غنی کو بتائے بغیر اپنے اندر سانس لینے والی اس کی اولاد کو ختم کر دیا وہیں اس کے صبر کی حد بھی ختم ہو گئی تھی یوں وہ سفر جس کے آغاز پر کچھ لوگوں نے بددعاؤں کے نذرانے بھیجے تھے، طلاق پر جا کر ختم ہوا۔“

”ادہ اسی لئے وہ اتنے ناراض ناراض نظر آتے ہیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اس کی یہ آزمائش یہاں ہی ختم نہیں ہوتی بیچے، نہ جانے اس میں کیا بہتری تھی میرے مالک کی، وہ بے حد ٹوٹ گیا تھا اس واقعے کے بعد اس نے اپنا سارا کام وہاں سے سمیٹا اور یہاں آ گیا، ازدواجی زندگی میں مکمل ناکامی کا غم تو تھا مگر یہاں اس نے اپنا جو کاروبار شروع کیا اس میں اسے بہت کامیابی نصیب ہوئی، رائے اور شاہدہ کی خواہش پر میں نے اب غنی سے شائے سے شادی کرنے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا

تیم کو سنا تھا اور ایک دو بار ان ماں جی بھی پریشان نظر آئی تھیں جب وہ دو تین دن گزرنے کے بعد بھی ان سے ملنے نہیں آتا تھا۔

”کیا بتاؤں عائشہ! نہ جانے کیا لکھا ہے میرے بیچ کی قسمت میں؟ پہلے ماں باپ ملے گئے تو چچا چچی کے رحم و کرم پر ان پڑا میرا بچہ، مگر ہمت نہیں ہاری اس نے، اپنے مل بوتے پر تعلیم حاصل کی اور بھاگ دوڑ کر کے دوستی چلا گیا، وہی چچا، چچی جو منہ نہیں لگاتے تھے اب دولت دیکھ کر رتھ گئے جو میرا بچہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے کما رہا تھا، مگر وہ شروع سے ہی الگ طبیعت کا ہے، ظاہری چکا چوند کی بجائے اصل کو دیکھتا ہے، عورت کے نام پر اس نے پہلے ماں اور پھر میرے ساتھ زیادہ وقت گزارا، اسے با پردہ اور حیاء والی عورت پسند تھی جب کہ شاہدہ کو اس کے لیے باندھنا چاہتی تھی جس کی آزاد خیالی اور خود سری کے مظاہرے تم خود کچھ چکی ہو۔“ وہ گہری سانس لے کر اس کی زندگی کی کتاب کے کچھ اوراق اس کے سامنے کھول کھول کر رکھ رہی تھیں، عائشہ جس کی اپنی زندگی ایک عجیب گورکھ دھندہ تھی، پہلی بار اپنی ذات سے ہٹ کر کسی میں دلچسپی لے رہی تھی۔

”بیٹے اور بھوکا مجھ پر دباؤ بڑھا کہ میں اسے شائے سے شادی پر راضی کروں، مگر میں اس کی پسند جانتے ہوئے کیسے اس پر ایک ایسی لڑکی مسلط کر سکتی تھی جو بالکل اپنی ماں کا برتو تھی جس نے ہمیشہ اپنی خود نمائی اور خود ستائشی کو ہی مد نظر رکھا تھا اولاد کی تربیت بھلا کر، شاہدہ میرا گریز بھانپ گئی اور خاوند کو بھی بھڑکا کر میرے لئے اس کے دل میں کدورت ڈال دی، پھر دوستی میں ہی اسے ایک لڑکی پسند آ گئی تھی، جس کی حیاء اور کردار نے اسے بے حد متاثر کیا تھا جبکہ وہ صرف

کو بلوا کر صاف صاف بات کی، وہ الٹا ہم پر بکڑ گئے اور بات بکڑتے بکڑتے ایک بار پھر گھر بکڑنے تک جا پہنچی تھی۔“ اماں جی کے آنسو قطار بہہ رہے تھے اور عائشہ اس انوکھے انسان کی انوکھی داستان پر دم بخود بیٹھی تھی۔

☆☆☆

اس کے بزنس پارٹنر کی کال آ گئی، کوئی کاروباری مسئلہ درپیش تھا جو اسے سمجھانے میں کم و بیش پندرہ سے بیس فٹ لگ ہی گئے تھے، اس سے فارغ ہو کر وہ اماں جی کے کمرے کی طرف آیا تھا، زندگی نے اسے ایسے ایسے لوگ اور ان کے ڈھنگ دکھائے تھے کہ وہ ساری دنیا سے ہی بدظن ہو گیا تھا، اماں جی کی محبت پر اسے کوئی شک نہیں تھا پھر بھی جب قنوطیت کا دورہ پڑتا ہے ان سے ملے بھی کئی دن گزر جاتے تھے۔

اب بھی اپنی اس کوتاہی پر خود کو کوستا وہ ان کے کمرے کی طرف آ گیا، دستک دے کر اس ان کچھ دیر انتظار کیا اور پھر کمرے میں داخل ہو گیا، اس کے اندازے کے مطابق نقاب پوش حسینہ وہاں سے روف چکر ہونے کو تھی، وہ تو ویسے ہی دودو عورتوں کا ڈسا ہوا تھا سودنیا جہاں سے ہی اعتبار ختم ہو چکا تھا سو ایک ناگوار نظر اس پر ڈالتا وہ اماں جی کی طرف بوجھا جو بستر پر نیم دراز تھیں، جیسے ہی اسے یقین ہوا کہ وہ لڑکی جا چلی ہوگی۔

”بڑی ہمت ہے آپ میں اماں جی، ایک کے بعد دوسرے دھوکے کے لئے فوراً ہی تیار ہو جاتی ہیں، دھیان رکھا کریں میں سے پہلے کہ یہ میڈم بھی کوئی گل کھلا کے نیا چکر دے جائیں۔“ دروازے سے نکلے نکلے اس نے پورے دھیان سے یہ الفاظ سنے تھے، حیرت انگیز طور پر اسے دکھ نہیں پہنچا تھا، شاید وہ اسے ان خیالات میں حق بجانب سمجھ رہی تھی، اس کی حیات کے ان تاریک

تھا، میرے مسلسل کہنے پر اس نے یہ ذمہ داری پھر میرے اوپر ڈال دی، میں نے بھی شہر کا کونا کونا چھان مارا ایسی لڑکی ڈھونڈنے میں جو باپردہ اور حیاء دار ہو بلکہ خاندانی بھی ہو اور گھر کو گھیرنا کر رکھ سکے، پھر ایک بچی مجھے پسند آئی تھی، صرف غریب تھے وہ لوگ اور میں سمجھتی تھی کہ غریب ہونا کوئی عیب نہیں ہے، مجھے اس وقت وہ قول بھول گیا تھا کہ پناہ مانگو ایسی غربت سے جو تمہیں کفر کے قریب لے جائے، ہمارے ایمان کی جانچ تو اس پاک ذات کے ہاں ہو گئی مگر وہ لڑکی بھی دولت و فیکہ کرا اپنی اوقات میں نہ رہی اور حیثیت دکھائی دی اس نے۔“

”کیا وہ بھی ویسی نکلی۔“ عائشہ بہت دکھ سے بولی، وہ ملال اب افسوس میں بدلنے لگا جو اسے اس کی ڈانٹ کھا کر ہوا تھا۔

”ہر انسان کی ذات میں خامیاں ہوتی ہیں بچے، تم میں کوئی بھی عیوب سے پاک نہیں ہے، مگر اس کی ایک بری عادت نے اس کا گھر توڑ دیا، اسے برباد کر دیا تھا، پہلے پہل اس نے غنی کے پیسے اٹھانا شروع کیے، وہ نظر انداز کر گیا، پھر زیورات کی نوبت آ گئی، جو ہماری طرف کے زیورات تھے اس کی بہن کی شادی پر میں نے دلہن کو پہننے دیکھا، استفسار پر اس نے ڈھٹائی سے اعتراف کر لیا کہ ہاں اسی کی چیز ہے وہ چاہے جس مصرف کے لئے بھی استعمال کرے۔“

”بات اب کمرے سے نکل کر گھر تک آن پہنچی تھی، کچن کے سامان سے لے کر سینئرل پیس اس نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا، ایسے حیا اور ایسے پردے کو ہم کیا کرتے جس کے ساتھ چوری جیسا بد فعل بھی جڑا ہوا تھا، شائندہ اور شاہدہ جی باتیں بنانے کا موقع مل گیا تھا، وہ طرز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں، میں نے اس کے ماں باپ

جی بس اسے کچھ دیکھ کر رہ گئیں۔

”بس کر دے فنی، چھوڑ دے ضد بیٹا، جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ہر عورت ایسی نہیں ہوتی، عورت کے روئے میں صرف وہ دو کم بخت تو نہیں تھیں..... مجھے دیکھ..... اپنی ماں کو ہی دیکھ لے، رشتوں میں..... جان کو واپال ہوتے ہیں نرے، آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں اماں جی؟ نیچے شفٹ ہو جائیں، لوگوں کے درمیان رہیں گی تو طبیعت بھی پہلی رہے گی۔“ اس نے ان کا دھیان ایک بار پھر خود سے ہٹایا تھا۔

”ارے نہیں بچے! نیچے کے شور شرابے سے گھبرا کر تو اوپر آئی ہوں ورنہ یہ تمہاری چاچی کی روز کی پارٹیاں، شائندہ کی آئے ورز کی دوستوں کی آمد اور ہلا گھا، گھبراہٹ ہوئی تھی مجھے ایسے ماحول سے، کبھی بکھار لان کو ٹھٹھنے کو دل کرتا ہے تو عائشہ لے جاتی ہے مجھے نیچے اور اسی کی دیکھ بھال ہی تو ہے جس سے اب ٹانگ کی حرکت میں بہت بہتری آئی ہے میری۔“ وہ ایک بار پھر عائشہ کی تعریف میں رطب اللسان تھی، غنی جی بھر کر بد مزہ ہوا مگر وہ دن اس نے اماں جی کے ساتھ ہی گزارا تھا۔

☆☆☆

”اماں.....! مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔“ اماں اپنی بیابھی بیٹیوں اور دامادوں کی آؤ بھگت میں بری طرح مصروف تھی جبکہ وہ ان سے آج ضروری یہ بات کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ آج شام ہی اس کی شہر واپسی طے تھی، ماموں نے صبح ہی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ شام کو تیار رہے، وہ لوگ شہر جا رہے ہیں کہ آج اس کو گھر آئے ساتواں روز ہو چلا تھا اور یہ زندگی میں پہلی بار تھا ورنہ تو اماں اسے تین دن سے زیادہ گھر میں نہ

پہلوؤں سے آگاہی کے بعد جو اسے عورت ذات سے ملے تھے۔

”ارے نہیں بیٹا! عائشہ ایسی نہیں ہے، بہت اچھی اور نیک بچی ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ اس کے سہارے اٹھتے ہوئے بولیں، اب وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھیں۔

”اپنی دوسری بہو کے بارے میں بھی آپ کے یہی بلکہ اس سے بھی نادر خیالات تھے اماں جی، دنیا کو اپنی نیت کے آئینے میں دیکھنا چھوڑ دیں، لازمی نہیں اگلا ویسا ہی جیسا ہم سمجھ رہے ہیں، ہم سے بہتر اس بات کو کوئی نہیں جانتا پھر بھی مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اتنا بڑا فیصلہ لے لیا اس لڑکی کے حوالے سے اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ جو اپنی شخصیت کو کردار کو سب کے سامنے بنا کر پیش کر رہا ہے وہی سب سے بڑا ڈھونگی ہے، یہ محترمہ بھی شہاب اپنے کسی ناپاک مقصد کے لئے لگاتی ہوں گی مجھے یقین ہے، مذہب کی صرف آڑ لی گئی ہے۔“ وہ تھمرے کہہ رہا تھا۔

”اچھا تم چھوڑو ان باتوں کو، ویسے بھی اگر ایسا ہوا بھی تو کیا رکھا ہے مجھ بوڑھی عورت کے پاس جو وہ چرائے گی۔“

”آپ کے پاس کچھ پہلے بھی نہیں تھا اماں جی! اور صائمہ نے کتنا ہاتھ صاف کر لیا، مجھ پر تو چلو جن بھتی تھی، مگر کی چیزوں تک کو بھی نہیں بخشا تھا، اب بھی خبردار ہو کر ہر طرف جائزہ لے لیا کریں اگر اس کو رکھنے کی ضد کر رہی لی ہے تو.....“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے ایک بہت ضروری بات کے لئے بلایا ہے تمہیں۔“ انہوں نے بات بدلی۔

”شادی کے سوا ہر موضوع پر بات کر سکتا ہوں، ہر حکم بجالاؤں گا۔“ انداز دو ٹوک تھا، اماں

تک کوئی بات پہنچے، پھر اس کا ہراس چہرہ اور آنکھوں کے آنسو دیکھ کر کچھ دھیمی پڑ گئی۔

”دیکھ سیکند بات میری غور سے، میں جانتی ہوں تو کتنی محنت کرتی ہے، کتنی قربانیاں دے رہی ہے وہاں، بس کچھ سال اور میری بچی، کچھ سال اور، کاکا کی شادی ہو جائے، شانی اور مانی بھی کچھ کمانے کے قابل ہو جائیں گے تب تک، تیرے اے کی حالت بھی بہتر ہو جائے گی پھر میں اپنی بیٹی کو بھی کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اپنے گھر کی کر دوں گی شاباش آ، کھانا نکالتی ہوں تیرے لئے، گرم گرم کھا کے روانہ ہو میرا بچہ، جلدی نکلے گے تو ٹیم کے ٹیم پہنچ جاؤ گے۔“ وہ چا پلوسی سے کہتی اس کا بازو پکڑ کر لائیں اور بچن میں رکھی پڑھی پر نہ صرف بٹھا دیا بلکہ چھوٹا سا پلاسٹک کا ٹکڑا زمین پر رکھ کر اس کے اوپر کھانے کی ٹرے بھی دھردی، جبکہ وہ سامنے رکھے سالن کو کھورتی ان سالوں کا حساب لگانے میں تھی کہ جو اس کو مزید اس دوزخ میں گزار کر اپنے گھر والوں کے پیٹ کے اندھن کا مہیا کرنے میں گزارے تھے، کاکا کی شادی بھی سال بھر میں متوقع تھی کہ اس کی ماں نے اس کی پہلی دو بہنوں کو بھی بمشکل پندرہواں لگنے پر بیاہ دیا تھا، مگر شانی اور مانی ان سب بہنوں سے اونچے ہو گئے تھے مگر ماں کے لاڈ پیار نے ان کو اتنا بگاڑا تھا وہ خود کو ابھی تک بچے ہی گردانتے تھے، تیسرا سال تھا وہ دونوں آنکھیں کلاس میں ہی لٹکے ہوئے تھے، پچھلے دنوں ابانے ایک بار دبے لفظوں میں ماں سے کہا کہ انہوں نے پڑھ کے تو دنیا نہیں ہے، ماموں سے کہہ کر انہیں کام پر بٹھایا جائے، تاکہ آگے چل کر گھر کی ذمہ داری سنبھال سکیں اور ان میں ابھی سے ذمہ داری کا احساس ہو گا تو ہی تو ہی گھر چلا جائیں گے، یہ بات سن کر ماں تو تھکے سے اکھڑ گئی

کتنے دیتی تھیں مگر اس بار وہ تنخواہ زیادہ لائی تھی اور بتایا تھی کہ آٹنی نے پورے آٹھ دن کی چٹھی دی ہے تب وہ چپ کر گئی تھیں ورنہ وہ لاکھ کتنی وہ جانی کہ ایک دو دن اور رکنے دیں وہ ان سنی کے لئے اس کا بیک پیک کر کے اس ماموں کے ہمراہ شہر بھجوا کر دم کیٹیں، ابھی بھی اماں اس کی بہنوں اور بہنوئیوں کو کھانا دے کر چائے بنانے میں مصروف تھیں جب وہ ان کے پاس آئی تھی موقع غنیمت جان کر۔

”ہاں ہاں سیکند بول کیا کہنا ہے بول میں سن رہی ہوں، مجھے پتا ہے تو نے اپنی کیکلی کے لئے شجیری کا کہنا ہے وہ تیرے کہے بغیر میں نے بنا کر رکھ دی ہے تیرے سامان میں، تیرے لئے کڑھائی والا سوٹ سیا تھا کاکا نے وہ بھی گل سی دیا میں نے۔“

”میں اب واپس نہیں جانا چاہتی اماں، کبھی نہیں، میں ہمیشہ اپنے گھر رہنا چاہتی ہوں۔“ بے قراری سے کہے گئے اس جملے نے اماں پر ایسا اثر چھوڑا کہ ان کے ہاتھ سے چائے کی چٹھلی نیچے گر پڑی۔

”کیا..... کیا کہا تو نے..... گھر پہ بیٹھ جائے گی تو سارے ٹبر کو تیری ماں آ کر قبر سے پالے گی کم بخت، پتا بھی ہے کہ بیمار باپ کی بیماری پر کیسے منٹوں میں ہزاروں روپے اٹھ جاتے ہیں، ایسی بیماری میں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض صرف دانیوں سے نہیں ٹھیک ہوتا، اچھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اسے، دودھ کی اوپر ہر موٹی پھل کی، پتہ بھی ہے یہ سب چیزیں کس بھاء ملتی ہیں، تو گھر بیٹھ گی تو میرا کلیجہ ہی بچے گا اس کو دینے کے لئے۔“ خواخوڑ تیار لئے وہ اس کے بازو کو جھٹکے یہ جھٹکا دیتے ہوئے دانت پیس کر بول رہی تھیں مبادا اندر بیٹھے دامادوں کے کانوں

تھیں، انہوں نے ابا کے وہ ملتے لئے کہ الامان الحفیظ، اس کے بعد کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی اس حوالے سے بات کرنے کی، الٹا مانی اور شانی اماں کی شہ ملتے ہی مزید آوارگی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

☆☆☆

قرآن پاک کی تلاوت میں جو سکون تھا وہ دنیا کی کسی بھی سرگرمی میں نہیں تھا، وہ بہت کم پڑھی لکھی تھی مگر اردو پڑھ اور لکھ سکتی تھی، جب وہ یہاں آئی تھی تب اماں جی بیماری کے باعث زیادہ بیٹھ نہیں سکتی تھیں، ایک بازو اور ایک ٹانگ کو حرکت دینا محال تھا کہ چھ ماہ پہلے ہونے والے فاج کے حملے نے ان جیسی فعال خاتون کو بالکل بستر کا کر دیا تھا، اسے اماں جی کے ہاں آئے تیسرا روز تھا جب انہوں نے اسے قرآن پاک اپنے کمرے کی مخصوص جگہ سے لا کر اس کی تلاوت کرنے کو کہا تھا، پہلے پہل اس نے قرآن پاک کو ترجمہ کے ساتھ ایک معمول کے مطابق پڑھا تھا مگر جیسے ہی اس نے اماں جی کو آنسوؤں کے ساتھ روتے دیکھا، اس کے اپنے دل کی حالت بھی بدل گئی تھی، تلاوت کے اختتام تک وہ بھی ویسے ہی روتی تھی عمر کے اکیسویں سال قرآن پاک کے چند الفاظ ترجمے کے ساتھ پڑھ کر اسے پتہ چلا تھا کہ وہ محض ایک پڑھنے کی کتاب نہیں تھی، ایک پیغام تھا، ایک ہدایت تھی اور رہنمائی، اسے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ دنیا میں کچھ الفاظ بھی ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اندر جادوئی اثر رکھتے ہیں، جو لمحوں میں دل کو پکھلا دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں، اگلے دن وہ اسی ٹائم پر خود قرآن پاک لے کر آئی تھی اور تلاوت کی تھی، اس بار اس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ رقت آمیز ہوئی تھی۔

”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں بخشے گا تو اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔“ ان آیات کے ترجمہ کے ساتھ ہی اس کی گزری زندگی کے سارے سو دویاں کیا یاد آئے کہ جسم کا رواں روان خوف سے لرز اٹھا تھا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی، اس نے اماں جی کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا مگر وہ ایک جہاندیدہ خاتون تھیں اس کے اندر کی اچھی روح کو پہچان گئی تھیں، بار بار اسے کہتیں کہ ندامت کا ایک آنسو ہزار گناہوں پر بھاری ہوتا ہے اور وہ مالک تو اتنا کریم ہے کہ اسے توبہ کرنے والا بندہ بے حد پیارا ہے، وہ خود کہتا ہے کہ اگر تمہارے گناہوں کی اونچائی آسمان کے برابر کیوں نہ ہو، ان کی تعداد زمین کے ذروں سے کیوں نہ بڑھ جائے، ایک بچے دل کی توبہ سے وہ سب معاف ہو جائیں گے۔

ان کی باتیں سن کر اسے سکون ملا، اس نے نماز یہاں آ کر پڑھنا شروع کی، ہر نماز میں ندامت کے آنسوؤں سے اپنے اپنے گناہ اور اپنے اندر باہر کی غلاظت و حلقی قحسوں ہوتی تھی، ہاں اس کے بعد اسے وہی پچھتاؤں کے ناگ ڈسنے لگتے، احساس جرم اور شدید ہوتا جب قرآن کی تلاوت میں برے اعمال والے لوگوں کا ذکر آتا، وہ نقاب جو اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی آڑ کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا، اب وہ شرعی طور پر لینے لگی تھی جب اس نے ایک پاکباز عورت پر پردے کی ذمہ داری عائد ہے کے بارے میں پڑھا تھا۔

”میں اپنی مرضی سے گناہ پر مائل نہیں ہوئی میرے مالک، میرے عیب ڈھک لینا اور مجھے توبہ کا موقع دیا ہے تو اس پر استقامت دینا۔“ وہ

رودرود دعائیں مانگتی۔

میں ہرگز نہیں مان سکتا ان بہانوں کو جو تم نے ان کے سامنے بنائے ہیں، اس لئے مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو، اور تمہارا مقصد کیا ہے یہاں آنے کا؟“ وہ آہستہ آہستہ قدم جھاتا ہوا اس کے بالکل قریب آیا، عائنہ کا دل گویا اس کی سماعتوں میں دھڑکنے لگا۔

”ہم..... میں نے سچ بتایا ہے، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، اماں ابا گزر گئے۔“ ایسا کہتے ہوئے دل خون کے آنسو رو دیا تھا۔

”ایک ماموں تھا وہ بھی ایک بوڑھے نشئی سے میری شادی کر رہا تھا جب میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی، میں وہ زندگی جو اس خبیث انسان کے ساتھ گزرتی سے پہلے مر جانا چاہتی تھی، میں خود ہی اس گاڑی کے نیچے آئی تھی جس میں اماں جی تھیں، وہ مجھے ہسپتال.....“

”بس بس بی بی یہ ساری ڈرامے بازی میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔“ اس نے اس کی بات کاٹی۔

”تمہیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں وہ حل کر دوں گا کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا، لیکن مجھے دھوکے سے سخت نفرت ہے، اگر تم نے کوئی چوری یا فراڈ کرنے کی کوشش کی تو یقین رکھو کہ میں تمہیں پانال سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔“ عائنہ تو اتنے سخت انداز پر حواس باختہ ہو گئی تھی۔

”نہیں نہیں سر! میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، نہ ہی کوئی مالی مسئلہ ہے اماں جی مجھے میری تنخواہ وقت پر دے دیتی ہیں اور میں نے جو بھی کہا ہے وہی سچ ہے، میں ابھی آپ کو یقین نہیں دلا ہوں گی کیوں کہ آپ بدگمانی سے سوچ رہے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ آپ پر میری بات ثابت ہو جائے گی کہ میں بالکل بھی ایسی نہیں ہوں جیسی آپ سمجھتے ہیں۔“ آہستہ سے کہہ

”وہ تو رب ہے جو ہمارے عیب ڈھکے ہوئے ہیں ورنہ ہمارے اعمال ہمارے چہروں پر لکھے نظر آنے لگیں تو ہم تو ایک دوسرے پر تھوکتا بھی گوارا نہ کریں، ایک دوسرے کو دھانا تک پسند نہ کریں، وہ بہت کریم ہے، بہت رحیم ہے۔“ اماں جی بات پر وہ جھجھکری لے کر رہ گئی تھی، اگر جوان کو میرے بد اعمال کی سیاسی کے بارے میں پتہ چل جائے۔

”نہیں نہیں، اے عجیب ڈھکنے والے، تجھے پتہ ہے میری نیت کا، مجھ پر اپنا کرم کرنا، مجھ سے یہ ٹھکانا مت چھیننا، مجھے اب صرف عزت کی چاہ ہے بس۔“

☆☆☆

باہر لان میں عقبی طری چھپ کر بیٹھی اس لڑکی کی اس کی طرف پشت تھی، اس نے تنفر سے اسے دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر اسی طرف چلا آیا، ٹھنکھار کر اسے متوجہ کیا، عائنہ چونکی، آنسو صاف کر کے اس نے دوپٹے سے نقاب بنایا، ماتھے کو بھی پوری طرح ڈھک کر اس کی طرف مڑی تھی، ایسے کہ اس کی نظریں جھکی ہونے کے باعث صرف عنی کے پاؤں اس کی نظروں کے حصار میں تھے۔

”میں بہت دنوں سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا، مگر تم اماں جی کے پاس ہوتی ہو تو موقع نہیں ملتا، دیکھو اماں جی بہت معصوم خاتون ہیں، دنیا جہاں کے درد ان کے دل میں سایا ہوا ہے، ان کی تمام عمر اس گھر کی چار دیواری کے اندر گزری ہے، وہ ہر کسی کو اپنے جیسا سمجھتی ہیں اس لئے جو جیسا کہتا ہے یا جو دکھتا ہے، اس کو اسی بنیاد پر مان لیتی ہیں مگر میں ان ڈھکوسلوں کا ڈسا ہوا ہوں، یہ ڈرامے بہت دیکھ رکھے ہیں میں نے،

کردہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

غنی کو اس کی بات کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں تھا، وہ صرف اماں جی کی وجہ سے اس لڑکی کو گھر میں برداشت کرنے کے لئے مجبور تھا۔

شانہ نے دور سے ان دونوں کو کافی دیر سے پاس کھڑے دیکھا تھا، دل چاہا جا کر اس غنی کا گلا دبا دے جو اس کے مسلسل آگے پیچھے پھرنے کے باوجود اسے لفٹ نہیں کراتا تھا اور اب پندرہ منٹ تو ہو ہی گئے تھے اماں جی کی ملازمہ کے پاس کھڑے باتیں بگھارتے ہوئے جو اسے زہر لگتی تھی اسے ڈھکوسلوں سمیت سخت غصے میں وہ غنی کی طرف آئی تھی۔

”اس بار یہ پردے کی بو بو پسند آگئی ہے کیا۔“ اس کے بالکل سامنے آ کر اس نے کہا، اس کا انداز غنی کو سخت ناپسند آیا تھا تو بات اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ تھی، رہی سہی کسر اس کا پہناوا پوری کر رہا تھا، جینز کے ساتھ سیلوئس شرٹ میں بلبوس شانہ کو اس پل اس کا دل کیا جادو کے زور سے کہیں غائب کر دے۔

”اگر ایسا ہے بھی تو میرا نہیں خیال کہ تمہیں تکلیف ہونی چاہیے، آخر آل ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے۔“ شانہ کے سر پر لگی ٹکڑوں پہ جا بھجی تھی۔

”مائی فٹ! مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے اس دو ٹکے کی لڑکی میں، نہ ہی شانہ احمد کی یہ حیثیت ہے کہ وہ ایک نورانی سے جلیس ہو، اور تم..... تم اس بار بھی منہ کی کھاؤ گے غنی، کیونکہ جس قسم کی لڑکی تم چاہتے ہو وہ اس روئے زمین پر ملنا ناممکن ہے، یہاں لوگ چہرے اور کردار کے حوالے سے کئی کئی بھروپ لئے پھر رہے ہوتے ہیں؛ میں نے بھی غور نہیں کیا لیکن ایک بات پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ جیسی دھکی ہوں،

اندر سے بھی ایسی ہی ہوں، ان بھروپوں کی طرح نہیں جن کو جب تم اپنی زندگی میں لائے تو وہ تمہاری پسند کے روپ میں تھیں، مطلب پورا کر کے ان کے چہرے اور کردار کی قطع کھل گئی، نہ ہی اس نوکرانی جیسی جس نے نہ جانے کس مقصد کے تحت ایسا بھروپ اپنا رکھا ہے، مگر یاد رکھنا، یہ بھی اس گھر کو ایسی ہی چوٹ پہنچائے گی جو پہلے والی چوٹوں سے زیادہ شدید ہوگی، ابھی نہ بھرنے والی، یہ میری بددعا ہے اور پیشین گوئی بھی۔“ چبا چبا کر کہتی وہ اس کو مزید کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی، غنی اس کی فضول باتوں پر سر جھٹکتا ہوا وہاں سے چل دیا تھا۔

☆☆☆

”چچ..... چچ..... بہت افسوس ہوا تمہارے گھر والوں کی بے حسی دیکھ کر۔“ گھر سے وہ روتی ہوئی آئی تھی، آنٹی کے پوچھنے پر وہ پھٹ پڑی تھی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا، یہ دنیا بہت بری ہے، بہت ظالم ہے، تمہاری تو چلو سوتیلی ماں ہے، میرے پاس تو لوگ اپنی سگی بچپوں کو لے کر آتے ہیں، جن میں سے کچھ تو واقعی پیٹ کے دوزخ اور معاشی مسائل کے برزخ سے گزر کر آئے ہوتے ہیں، مگر کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن کے باپ اور جوان بھائی کما سکتے ہیں، مگر ان کو عادت ہی نہیں ہوتی کمانے کی، ابھی بیٹا کو ہی دیکھ لو، سگا بھائی ہر ماہ آ کر مجھ سے مخصوص رقم لے جاتا ہے، کبھی وہ بیچاری ضد بھی کرے گھر جانے کی تو اس کی بھابھی نہیں چاہتی کہ وہ گھر آئے، اس نگر میں تو ہر ذی روح سے ایک سے ایک لڑوہ خیز داستان جڑی ہے، تم بھی ان سب کو بھول کر خود کے لئے جیو، کچھ نہ کچھ اپنے لئے پس انداز کرتی جاؤ اگر زندگی کی راہ میں کوئی سچا ہم سفر مل

صرف حکم کریں۔“ ان کے بندھے ہاتھ کھولتا وہ بے قراری سے بولا تھا۔

”شادی کر لو غنی، تمہیں خوش دیکھ کر میں دوبارہ جی اٹھوں گی، مجھے یقین ہے تمہاری سونی زندگی مجھے نہ صرف مرنے دے رہی ہے نہ جینے، یہ ہسپتال، دوائیاں اور انجکشنز کچھ اثر نہیں کرے گا مجھ پر، اگر تم خوش ہو تو۔“ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔

اس نے ان کے کمزور اور جھریوں والے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگا کر انہیں ہاتھوں میں لے لیا، کچھ لمحے ان کو دیکھتا رہا پھر پھیکا سا مسکرا کر بولا۔

”آپ جیتیں، میں ہارا، زندگی اس بار آپ کو مرہ بتا کر مجھے ایک بار آزمانا چاہ رہی ہے تو ایسا ہی کہی۔“

”جیتا رہ میرا بچہ، میرا دل کہتا ہے کہ اس بار زندگی کے پاس چھین دینے کے لئے ہزاروں خوشیاں ہیں..... اور شائد۔“

”نہیں اماں جی، اس لڑکی نے میری خواہشات جو کہ میری شریک سفر کے حوالے سے ہیں کو اپنی ضد سمجھ لیا ہے، جب وہ گھر کا ایک بڑا ایک مرد ہونے کا لحاظ نہیں رکھتی اور ہمیشہ وہی کرتی ہے جو میرے کہنے کے الٹ ہوتا ہے تو شادی کے بعد بھی اپنی روش جاری رکھے گی، میں آپ کو اختیار دیتا ہوں کہ شائد کے علاوہ آپ جو اور ٹھیک لڑکی بھی میرے لئے منتخب کریں گی، میں اسے قبول کروں گا، ایک بار پھر خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ کے دیکھتے ہیں اس بار دیکھیں کاسہ زندگی میں میرے لئے عورت کا کون سا رنگ پوشیدہ ہے۔“

”انشاء اللہ تعالیٰ میرا رب مجھے مایوس نہیں کرے گا۔“ اماں جی نے بہت دوق سے کہا تھا۔

گیا تو یقین کرو میں تمہیں رخصت کرنے میں تمہاری ماں کی طرح لیت و لعل سے کام نہیں لوں گی، مگر یہ دنیا پند و نصائح کا بوجھ ایک دوسرے کے سر پر باندھنے کی تو بہت شوقین ہوتی ہے، عمل کرنے والا خال ہی ہوتا ہے یہاں، انشواب منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا آرام کرو، شام کو کچھ خاص مہمان آنے ہیں، تو فریش ملو تم ان سے۔“ اسے پچکارتے ہوئے وہ اٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

اسے اس گھر میں آئے آٹھ ماہ ہو چلے تھے، اب تو غنی سمیت شاہدہ بیگم کو بھی اس کے بارے میں اپنے اندازے غلط ثابت ہوتے لگ رہے تھے کہ اس نے واقعی جی جان سے اماں جی کی خدمت کی تھی، اور اب ان کا بازو اور ٹانگ پہلے سے بہت بہتر حالت میں تھے انہی دنوں اماں جی کا بلڈ پریشر ایک بار پھر اس حد تک بڑھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہیں ہسپتال داخل کیا گیا تھا، غنی کے بعد عائشہ کی حالت ان کی وجہ سے غیر تھی، خدا نخواستہ یہ سہارا بھی چھن گیا تو وہ کہاں جائے گی، یہ سوچ اس کو جائے نماز سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی، وہ ہسپتال بھی مستقل غنی کے ساتھ ہی تھی، اس کے ہزار منع کرنے کے باوجود شاہدہ بیگم، شائدہ اور رائنہ اپنے شوہر کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے آکر واپس چلی گئی تھیں، تیسرے دن جا کر اماں جی کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور ڈاکٹر نے ان کو خطرے سے باہر کی خوش خبری سناتے ہوئے بہت زیادہ خوش رکھنے کو کہا تھا، مگر آتے ہی انہوں نے پہلی فرصت میں غنی کو بلایا تھا اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ دیئے تھے، وہ تو ششدر ہی رہ گیا تھا انہیں ایسا کرتے دیکھ کر۔

”اللہ کا واسطہ ہے اماں جی، مجھے گناہ گار نہ کریں، یہ آپ کا منصب نہیں ہے، خدا را مجھے

☆☆☆

اس کی اپنی خواہش کا اظہار کرنا تھا کہ اس کی ماں نے کافی کوبھی بیاتنے میں دیر نہ کی تھی، حالانکہ وہ ابھی پندرہویں میں ہی لگی تھی، سیکنہ کو کچھ اور امید ہو چلی تھی کہ اب بہنیں ساری بیاہی گئی تھیں اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس بار جا کر ضرور اماں سے بات کرے گی کہ شانی اور مانی کو کوئی ہنر سکھائیں، شام کو کسی کام پر بٹھائیں، اسے تو اماں کے ٹکھٹو بھائی کا بھی فارغ رہنا سخت ناپسند تھا، جب اماں اس گھر میں شادی کر کے آئی تھی تو وہ اچھا خاصا ہنر جانتا تھا، درزی تھا، کپڑے سی لیتا تھا، مگر اب جب سے سیکنہ کو شہر لانے لے جانے لگا تھا اس نے درزی والا کام چھوڑ دیا تھا، بس گاؤں کی گلیوں میں سگریٹ کے سونے لگاتا نظر آتا، یا بستر توڑتا رہتا، بہن کی بیٹی کماد ہو چلی تھی تو جہاں باقی گھر کے خرچے پورے ہو رہے تھے وہاں اس کی بہن ہر مہینے آنٹی سے جو رقم منگواتی تھی اس میں سے چند ہزار اسے بھی پکڑا دیا کرتی تھی، یوں اس کو پیٹھ کر کھانے کی جوت لگی تھی تو وہ مزہ سارا سارا مشین پر بیٹھنے میں کہاں ملتا تھا، وہ ہی بہن کو سیکنہ کو دبانے کے مختلف طریقے بتاتا رہتا، مزید اس نے تاکید کی تھی کہ سیکنہ کو جلدی جلدی گھر آنے کی لت نہ ہی پڑے تو زیادہ بہتر ہے، گھر کی ہڑک میں روز روز آنے گی تو کام کیا خاک ہوگا، اسی کے کہنے پر اب سیکنہ کا ہر ماہ تین دن کے لئے آتا وقف ہوا اور وہ تین تین ماہ کے وقفے سے آنے لگی تھی اب، کافی کی شادی پر بھی ابا کے اصرار پر اسے دو ماہ بعد بلوایا گیا تھا، کچھ لوگوں کا ذریعہ بھی تھا جن کو انہوں نے بتا رکھا تھا کہ شہر میں بڑے بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے جہاں بڑے بڑے لوگ میک اپ کروانے آتے تھے، ٹی وی اور فلم والے، ویسے بھی آنٹی نے تین چار

ماہ کی ٹریننگ دے کر ان سب کو پارلر کے کام میں ایکسپرٹ کیا ہوا تھا، اماں تو دونوں ہاتھ کھی میں سر کڑھائی میں کے مصداق جب وہ گاؤں آئی تو پورے گاؤں میں کھلوا بھجیتیں کافی کے ہاتھ کہ سیکنہ آئی ہوئی ہے اگر کسی نے میک اپ فیشن یا آئی بروز کا کام کرنا ہے کچھ ڈراموں فلموں کی ایکسپریس کے قصبے سننے تو کچھ واقعی میں بھی فیشن تو کبھی میک اپ کروانے چلی آتیں، پیسے اماں خود وصول کرتی اور کہیں دوستی، رشتہ داری والی جگہ پر ادھار بھی چلتا تھا، شہر کی نسبت سیکنہ یہاں بہت بہتر اور سکون محسوس کرتی، باوجود تھک کر چور ہو جانے کے باوجود بھی ایک احساس ہوتا کہ وہ محنت کر کے کمات رہی ہے، شہر میں تو ہمہ وقت ایک عجیب سا احساس اسے گھیرے میں لئے رکھتا، گناہ کا احساس، حرام کمائی کا احساس، غلاظت میں دھسنے نفس سے کراہیت کا احساس۔

☆☆☆

کافی شادی پر بھی وہ یہاں گاؤں میں عام دنوں سے زیادہ مصروف تھی کیونکہ آج کافی کا اثین تھا، فنکشن سے سب رات گئے ہی فارغ ہوئے تھے، کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد اس کا کچن میں چائے پینے کا ارادہ ہوا، گاؤں میں تو اسے بھی عادت نہیں تھی مگر شہر جا کر وہ بھی چائے کی عادی ہو چکی تھی، چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر وہ اپنے اور کافی کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب اماں کے کمرے سے سب بہنوں کی ہنسی مذاق کی آوازیں سن کر اس کا جی چاہا کہ ایک عرصہ بعد وہ بھی اس محفل میں اپنے گریبی رشتوں کے ساتھ وقت بتا کر کچھ پل چرا کر زاوراہ بنا لے، سو اسی طرف آگئی، اماں کے علاوہ دونوں بیانی بہنیں کافی کے علاوہ ماموں کی آواز بھی آ رہی تھی جبکہ ابا اور شانی، مانی

نئی نئی فرمائشیں ہیں تمہاری گرمیوں سردیوں کے تمہارے اور تمہاری اولادوں کے کپڑے، روز روز کی دعوئیں اسی کے پیسے سے پورا کر رہی ہوں سب، درخت نہیں اگا رکھے میں نے پیسوں کے، یہاں آکر پارلر کھول بھی لے تب بھی اس کی کمائی تھیانے کو وہ تمہاری چنڈال ساس بیٹھی ہے ناں، مجھے تھوڑا اٹھا کے دے دے گی، پیار باپ کی بیماری پر ہزاروں لگ رہے ہیں ہر ماہ، اس کا خود کو بیچ کر علاج کراؤ گی کیا، زبان بند کر کے چلنے دو سب جیسے چل رہا ہے، ایک تمہاری باجی کنواری رہ جائے گی تو قیامت نہیں آجائے گی، ہزاروں لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں کسی نہ کسی وجہ سے۔“

اب کسی کی سمجھ میں اماں کا نقطہ نظر آیا تھا یا نہیں بہر حال اس کے بعد اس کی کسی بہن نے اس کے حق میں بولنے کی جرأت نہیں کی تھی، ہاتھ میں چائے کب کی شغنی ہو چکی تھی بالکل اس کے نصیب کی طرح، ہارے ہوئے انداز میں قدم اٹھاتی وہ اپنے اور کا کی کے مشترکہ کمرے کی طرف چل دی تھی۔

اسے بھی پتہ تھا کہ اس کے گھر کے مسائل کیا تھے، اسے بھی پتہ تھا کہ اسے بھائی ابھی چھوٹے تھے اور اگلے کئی سال تک اس کی ماں کی نظروں میں انہیں چھوٹا ہی رہنا تھا، کیا تھا جو ماں بھی بہن کی طرح اس کے حق میں ایک جملہ ہی بول دیتی، مگر وہ ماں کہاں تھی اس کی، ماں ہوتی تو اس کو دنیا کی بھیڑ میں موجود بھیڑیوں کی بھوک کا نشانہ بننے کو بھیج دیتی؟ نہیں سمجھی نہیں، ایک ماں تو اپنی بیچوں کو مرنے کی طرح پروں میں چھپا کر رکھتی ہے، اس پر کسی غیر کی میلی نگاہ بھی برداشت نہیں کرتی اور جو ایسا نہیں کرتی وہ نہ تو عورت ہوتی ہے نہ ماں اور نہ انسان، اس کا دین ایمان اور

سوچکے تھے، وہ ابھی ابا کو دیکھنے گئی تھی تو وہ تینوں اسے نحو خواب ملے تھے۔

”سنو اماں! میری ساس نے میرے دیور کے لئے باجی کا رشتہ دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ ہاں ہی ہونی چاہیے جواب میں، میں تو کہتی ہوں اماں اچھا رشتہ ہے، اچھا کھاتا کھاتا ہے، سعودی عرب میں ہوتا ہے میرا دیور، باجی ستائیس سال کی ہو گئی ہے، ہمارے یہاں تو اتنی عمر تک کسی کو بھی نہیں بٹھایا جاتا۔“ یہ اس سے چھوٹی بہن بھی جسے اس نے گودوں کھلایا تھا اور پندرہ سال کی اماں نے اسے اپنے گھر کا کر دیا تھا، آج گود میں تین سال کا بچہ لئے معتبری اماں کو مشورہ دے رہی تھی۔

”چپ..... چپ خبردار جو آئندہ کسی نے ایسی کوئی بات چھیڑی تو بڑی آئی باجی کی ہمدرد۔“ وہ جو خوش ہو کر اکیلے کا منہ چومنے چلی تھی اماں کی ڈانٹ پر باہر ہی کھڑی رہ گئی۔

”کیوں اماں اس میں کیا حرج ہے، باجی شہر بھی تو پارلر کا کام کرتی ہے یہاں بھی اپنا پارلر کھول لے گی اور گھر بھی بس جائے گا اس کا۔“ ابھی بھی وہ مکاری اور عیاری کی اس طرح پر اپنا رشتہ نہیں لے کے گئی تھی جہاں پر اس کی ماں کھڑی تھی، اب کے اماں نے اٹھ کر باقاعدہ اسے دد ہنتر لگائے تھے۔

”بھونکے ہی جانا بس، وہ پہلے ہی اتا دی ہو رہی ہے سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھنے کے لئے اب اس کو سن گن مل گئی تو اور چوڑی ہو کر بیٹھ جائے گی، کم بجھو آئے روز کوئی نہ کوئی باجی صلیب کا ہمدرد بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس کی شادی ہو گی تو جس شہاٹ سے اپنے میاؤں کے ساتھ عیش کر رہی ہوں ناں، جیسے ہی اس گھر پر برا وقت آیا، انہوں نے بھی ٹھیک کا دکھا دینا ہے تم لوگوں کو، یہ جو

پر دھبہ لوگوں نے اس کے اندر بھر دی تھی، اسے ان سے سب سے بے تحاشا گھن آئی، وہ تن کے اچلے من کے میلے لوگ صرف پیسے کو اہمیت دینے والے لوگ تھے، اپنے کمرے میں جا کر چادر پہن کر زندگی میں پہلی بار ماموں کا سہارا لئے بغیر باہر نکل آئی تھی کاکی کی رخصتی کے ہنگامے میں کسی کا دھیان اس کی طرف نہ جا سکا تھا۔

☆☆☆

”اماں جی!“ اس کے منہ سے کچھ دیر الفاظ ہی نہ نکل سکے۔

”اللہ نہ جلدی کرتا ہے، نہ دیر کرتا ہے، یقین رکھو کہ وہ جو اور جب کرتا ہے بالکل صحیح کرتا ہے اور صحیح وقت پر کرتا ہے۔“ اماں جی کا کہا ہوا ایک جملہ اس کی سماعتوں میں ایک بار پھر گونجا تو وہ بے ساختہ ان کے گلے لگ کر رو دی تھی۔

”مجھے اس گھر میں جگہ مل گئی اماں جی! وہ ہی بہت ہے، مجھ پر اتنا بڑا احسان مت کریں جسے میں اتارنے کے قابل نہ رہوں اور اس کے بوجھ تلے دب جاؤں، میں اس قابل نہیں ہوں اماں جی!“ روتے ہوئے وہ بے بط سے جملے بول رہی تھی، اماں جی نے پیار سے اسے خود سے الگ کیا۔

”ہم کس قابل ہیں یہ تو اس پاک ذات کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا بچی! تمہارا ماضی جو بھی تھا، مگر میں نے تم میں ٹھپی ایک نیک روح دیکھی ہے، اللہ میرے اس گمان کو میرے بچے اور تمہارے حق میں بہتر کرے، اس نے بے اختیار مجھے سونا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ مالک جب کسی کے لئے خوشیوں کے دروازے کھولنا چاہتا ہے تو پھر دسلے بھی خود بخود بناتا چلا جاتا ہے، وہ مجھے تم دونوں کا گھر بسانے کا وسیلہ بنانا چاہ رہا ہے تو میں کون ہوتی ہوں کسی کے اچھے نصیب کی راہ میں

رشتے سب پیسہ ہوتا ہے۔ اگلے روز کاکی کی رخصتی سے قبل اس نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور اپا سے ملنے ان کے کمرے میں چلی آئی تھی، ان کی حالت پہلے سے بھی خراب تھی، اس کا دل دکھ سے بھر گیا، زندگی کو آزار بنا کر جو کشت وہ اٹھا چکی تھی اور اٹھا رہی تھی، اس نے اس کے باپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا تھا۔

”اچھا بابا! جا رہی ہوں شہر واپس..... میرے لئے دعا کیا کرو۔“ اس کی آنکھیں جھلملائی تھیں وہیں ابانے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اس کے سہارے سے اٹھ بیٹھا۔

”جامیرا بچی! اللہ کی اماں میں..... ہو سکے تو واپس مت آنا سیکھنا!“

”یہ لوگ تیرے ساتھ مخلص نہیں ہیں، مجھے نیند میں پا کر جو باتیں وہ دونوں کر رہے تھے اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے، کاکی کی شادی کر کے وہ خبیث عورت تمہیں اپنے بے غیرت بھائی سے بیاہنا چاہتی ہے وہ بھی گھر کی عزت بنانے کو نہیں بلکہ سونے کی چڑیا کسی اور کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، وہیں اپنی باجی سے کہنا کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر تمہاری شادی کر دے گی، دنیا میں ایسے برے لوگ ہیں تو اچھے بھی ہوں گے میری بچی! وہ دونوں بہت زور آور ہیں، نہ تمہاری سنیں گے نہ میری، جاؤ جاؤ سیکھیں، تمہیں اللہ کی اماں میں دیا، یہاں رہو گی تو یہ لوگ تمہیں بچ کر کھا جائیں گے۔“ مسلسل بات کرتے کرتے ان کو کھاسی کا ایک شدید دورہ پڑ چکا تھا، مگر وہ اپنی حالت کی طرف توجہ دینے کی بجائے اسے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

سیکھنے کا دل چاہا وہ اتنی زور سے چیخے کہ اندر کی ساری ٹھنن باہر نکال دے جو رشتوں کے نام

یہ سن کر اتنی خراب ہوئی کہ کل سے بستر میں پڑی ہے۔“ شاہدہ بیگم تقریباً بیس دن کے بعد اوپر آئی تھیں اور خوب چیخ چلا رہی تھیں، وہ تو شکر ہوا غمی وہیں آ نکلا تھا اور شاہدہ بیگم کے کچھ الفاظ اس کے کان میں بھی پڑے تھے۔

”اماں جی کو کچھ مت کہیں چاچی!“ وہ تیزی سے اندر آیا تھا۔

”اپنی جس بیٹی کے منہ سر لینے کا ذکر کر رہی ہیں آپ، بیچ پر پٹک منار رہی تھیں محترمہ اپنی دوستوں کے ساتھ۔“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا، مگر وہ بھی شاہدہ بیگم تھیں، کہاں شرمندہ ہونا سیکھا تھا، ترنت بولی تھیں۔

”ہاں تو میں نے ہی بھیجا تھا اسے کہ باہر کہیں گھوم بھر آئے، یہ نہ ہو طبیعت خراب کر لے اور میری بیٹی تو نظر آگئی تھیں، تم بھی تو گئے ہوئے تھے، جبکہ خود ان باتوں کو فضول گردانتے ہو۔“

”میں اپنے کسی بھی کام کے لئے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوں، بیٹی کا گھر بسانے کی خواہش تو ہر ماں کرتی ہے مگر اسے گھر ہستی بھی سکھاتی ہے، آپ نے تو خیر ایسی زحمت کبھی کی نہیں، ورنہ مجھے شائد سے کچھ پر خاش نہیں، اس کے غلط طور طریقوں سے ہے بس۔“

”ٹھیک ہے یہاں، تم نے جو اچھے چال چلن کی لڑکی منتخب کی ہے، اس کے طور طریقے بھی جلد دیکھ لیں گے۔“ بات کو مختصر کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں کہ غمی کی اکثر باتیں انہیں خائف کر دیا کرتی تھیں۔

”آپ کیوں سنتی رہتی ہیں ان کی فضول باتیں، خدا کی قسم خون کھول گیا میرا بیچ پر وہ سب کچھ دیکھ کر، محترم کے ساتھ صرف لڑکیاں ہی نہیں لڑکے بھی شامل تھے، ایک دفعہ تو دل کیا جا کر ہاتھ پکڑ کر لے آؤں اور اس کی ماں کے آگے

رکاوٹ بننے والی، اسے بس دھوکے اور فریب سے نفرت ہے، حالات نے اسے ایسے سخت دل بنا دیا ہے اور زبان کا کڑوا ورنہ وہ تو بہت اچھا انسان ہے، بہت سچا اور کھرا، جیسا خود ہے تو ارد گرد کے لوگوں کو بھی ویسا دیکھنا پسند کرتا ہے، بس آج تک کوئی اس کی توقعات پر پورا اتر رہی نہیں، مجھے لگتا ہے تم سے اس کا گھر اور خوشیاں مکمل ہونے والی ہیں اور اس سے تمہاری، یہ کچھ رقم رکھو..... ڈرائیور کے ساتھ جا کر کچھ ضروری خریداری کر آنا باقی کا سب کچھ میں خود دیکھ لوں گی، جمعہ کی شام کو ایک سادہ سی تقریب میں نکاح کی مبارک تقریب رکھ لیں گے۔“ بی بی جان نے دراز سے اچھی خاصی رقم نکال کر اس کی منٹھی میں دبائی تھی، جبکہ اسے ابھی تک اپنی خوش بختی کا یقین نہ آیا تھا۔

☆☆☆

”میں ہمیشہ کہتی رہی مگر آپ نے میری بات نہیں مانی اور آج ثابت کر دیا آپ نے کہ میں غیر خاندان سے تھی تو آپ کے لئے عمر بھی غیر بھی رہی، مجھتیں ہمیشہ لٹائیں تو اپنی اس سگی پر، جائیداد میں ویسے ہی غمی کو بیٹا ہونے کا فائدہ ملا، طرف داری آپ نے ہمیشہ غمی کی کی، میری بچیوں نے بھی میرے جیسا نصیب پایا اور کبھی آپ کی محبت کی حق دار نہ ہوئیں، ایک بار، دوسری بار اور اب تیسری بار میری بچی کو ٹھکرا کر آپ نہ جانے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں، کیا میری بچی اس لڑکی سے بھی گئی گزری ہے جس کے نہ خاندان کا پتہ ہے، نہ کردار کا، بس جیسا اس نے کہا سب نے مان لیا، میں تو ایسی لڑکی جس کا نہ کوئی آگاہ نہ چچا نہ پچھا کو نوکرانی کے طور پر بڑی مشکل سے برداشت کر رہی تھی اور آپ نے اسے بہو بنانے کا بھی سوچ لیا، شائد کی حالت تو

آئی ایک گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا تھا، اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اسے زوردار ٹھوکر لگائی، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے سڑک کے وسط میں جا گرئی تھی، سر پر چوٹ آنے کے باعث وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دھڑکتے دل کے ساتھ دل میں ڈھیروں خدشات لئے وہ اس کی منتظر تھی۔

”دیکھو عائشہ، مجھے تمہارے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہے، میں حال میں جینے والا شخص ہوں، زندگی کے اور شریک سفر کے حوالے سے میری ترجیحات بہت سادہ اور مختصر ہیں، جن کے بارے میں اماں جی تمہیں بتا چکی ہیں، میں اپنی زندگی میں ایک بار پردہ اور باکردار عورت چاہتا ہوں جو میری آنے والے نسل کو اچھی پرورش اور تربیت دے کر اچھا انسان اور اچھا مسلمان بنائے، بس ایک اتنی سی خواہش کو لوگوں نے میری کمزوری بنا دیا ہے، مجھے انسان سمجھنا چھوڑ خلائی مخلوق سمجھتے ہیں، تمہیں اس گھر میں عزت، مقام اور پورے حقوق ملیں گے جو اب میں میری صرف اتنی فرمائش ہوگی کہ تم ایک مشرقی عورت کی طرح زندگی گزارتے ہوئے میری عزت کی حفاظت کرو گی۔“ اکھڑا اور بد مزاج غنی کی بجائے وہ ایک ایسا مرد تھا جو عورت کے حوالے سے کئی خدشات کا شکار تھا، آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اس نے دو خوب صورت جزاؤں لیکن اس کی دونوں کلائیوں کی زینت بنا دیئے۔

اس کی باتیں، اس کے خدشات سننے ہوئے عائشہ کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرا تھا، وہ اماں جی کو غنی کو اپنا ماضی بتا کر پھر غنی زندگی کی ابتدا کرنا چاہتی تھی مگر بارہا اس کے ذکر کرنے پر دونوں نے ہی یہ کہہ کر اسے ٹوک دیا تھا کہ انہیں

لاکھڑا کروں مگر انہوں نے کون سی میری بات کا یقین کرنا تھا یا میری بات مانتی تھی۔“ وادی کو ساری بات بتا کر وہ بکڑ کر بولا تھا، ماں جی نے بشکل اس کا دھیان دوسری طرف بتایا تھا۔

☆☆☆

شام رات میں بدلنے کو تھی جب اس نے شہر میں قدم رکھا تھا، وہ ہر گز بھی پریشان نہ ہوئی تھی کبھی کبھی ماموں اس کے ساتھ ہوتے تھے مگر آج اسے ہر شخص خود پر نظریں گاڑے محسوس ہو رہا تھا، پرس کو مضبوطی سے سینے سے لگائے وہ بس سے اتری تو ہل بھر میں رکشوں کا ڈھیر اس کے گرد جمع ہو گیا کہ ہر ایک اس سواری کو منزل تک پہنچانے کی تگ و دو میں تھا، مگر وہ ان سب سے کئی کتر اکرا کر سائیکو پیدل چلنے لگی۔

کیا کرے..... کہاں جائے..... آنٹی کے پاس جانے کا مطلب تھا ایک بار پھر اس برزخ میں لوٹ جانا جہاں سے آگے بڑھنا اس کے لئے موت کے مترادف تھا اور پیچھے کا سفر اسے واپس انہی رشتوں کے پاس جا کھڑا کرتا جہاں اس کے قریبی رشتے بھوئے گدھوں کی مانند اس کو نوچنے کو تیار بیٹھے تھے۔

تعلیم کے نام پر صرف ساتھ آٹھ جماعتوں تک کا سفر تھا اور ہنر، ہاں ہنر تو تھا، کسی کو شک نہ ہو اس لئے انہیں شروع کے چھ ماہ مارلر کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی اور اب بھی آنٹی کے گھر کے نیچے والے پورشن میں ایک اچھا پارلر تھا جس کا سارا کام ایک اسٹنٹ دیکھتی تھی، چھ سے آٹھ ورکر وہاں موجود تھیں اور اپنی اور دوسری لٹی لڑکیاں جو شوقیہ پیسہ کمانے آئی تھیں، اور کے گھر والے مطمئن تھے آنٹی سے مل کر ان کے پارلر کو دیکھ کر۔

اپنے ہی خیالوں میں چلتی وہ نہ جانے کب مین روڈ پر آ گئی تھی اور جیسے ہی مشرقی طرف سے

اس سے کوئی غرض نہیں ہاں حال میں مستقبل میں اسے ان کے انتخاب اور اپنے اس امتحان میں پورا اترتا ہوگا۔

☆☆☆

ڈرائیور اسے وہیں چھوڑ کر جانے پر ہند تھا کیونکہ بقول اس کے اس کی غلطی نہیں تھی اور ایسی صورتحال میں پولیس سے پہلے مددگار کو ہی دھر لیتی ہے، ہاں اس میں اتنی ہمدردی ضرور تھی کہ وہ ریسکیو کا ہیلپ نمبر ملانے لگا مگر گاڑی میں موجود اماں جی نے اسے روک دیا تھا کہ غلطی جس کی بھی ہو، ان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ وہ کسی ذی روح کو ایسے کمپرسی کی حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ جائیں، طوہا کر ہاڈرائیور کو ان کی مافی پڑی تھی، اماں جی اس وقت ڈاکٹر سے چیک اپ کرا کر گھر واپس لوٹ رہی تھیں، ہسپتال اماں جی بھی ساتھ ہو گئی تھیں، سر پر معمولی چوٹ تھی اور وہ خوف کے باعث بے ہوش ہوئی تھی، گھنٹے بعد ہی اسے ہوش آ گیا تھا، اماں جی کے بہت شفقت سے پوچھنے پر اس کے ذہن میں اس وقت جو کہانی آئی تھی وہ اس نے سنا دی تھی، مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی حیثیت اور مقام ظاہر کیے بغیر وہ مہربان عورت اس پر اتنا احسان کرے کہ اسے کسی ہوشل یا دارالامان تک پہنچا دے۔

اس وقت تو رات ہو چکی تھی، وہ خاتون اسے اپنے گھر لے آئی تھیں، اگلے دن جب بے حد جھجکتے ہوئے اس نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پارلر کا کام بہت اچھا جانتی ہے، وہ اگر اسے کسی بھی پارلر میں نوکری دلاو دیں ساتھ ہی کسی ہاسٹل اس کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی، اس کے لجاجت سے کہنے پر وہ خاتون پہلے تو کچھ دیر کچھ سوچتی رہی تھیں، پھر انہوں نے منظر اکر کہا تھا کہ کیا وہ ان کے گھر، ان

کے پاس رہنا پسند کرے گی کیونکہ محض چار دن پہلے ہی ان کی کیئر ٹیکر کو غنی نے اس کی حد درجہ لاپرواہی پر نکال باہر کیا تھا، جب سے اماں جی کا فوج ہوا تھا، ڈاکٹر کے مطابق اس کا علاج موجود تھا مگر بہت طویل اور صبر آزما، ان کے متاثرہ حصوں کی دن میں کئی بار تھراپی اور ورزش کروانی ہوتی تھی، جس کے لئے غنی جب سے اب تک تین کیئر ٹیکر بدل چکا تھا کہ کوئی بھی اس حوالے سے نہ تو اسے مطمئن کر پارہی تھی نہ ہی اماں جی کو، حال ہی میں جیسے فارغ کیا گیا تھا، وہ تو ایک چھوٹا بچہ بھی لے کر آتی تھی، اماں جی سے زیادہ وہ اپنے بچے کی ناز برداری ہو گئی رہتی اس پر بھی اماں جی خاموش تھیں کہ خداترس خاتون تھیں، مگر جس دن وہ اماں جی کی ایکسرسائز کر رہی تھی، بچے کے پکارنے پر اماں جی کو فوراً چھوڑ کر اس کی طرف سے ایسے بھاگی کہ اماں جی سنبھل نہ سکی تھیں اور گر گئی تھیں، ان کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی، غنی کے علم میں جیسے ہی صورتحال آئی تھی اس نے اسے فارغ کرنے میں دیر نہیں کی تھی اور اس روز وہ پارٹی سے ملنے کے لئے شہر سے باہر تھا، جبکہ اماں جی کی تھراپی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کے ڈیٹ بھی اسی دن تھی، اس نے ڈرائیور کو کال کر کے اماں جی کو دھیان سے ہسپتال لے جانے کو کہا تھا، ڈاکٹر رضوی سے ٹائم وہ پہلے ہی لے چکا تھا جب واپسی پر ان کی گاڑی سے وہ آن ٹکرائی تھی، نتیجتاً صبح جب وہ واپس آیا تو اماں جی اپنی کیئر ٹیکر خود ڈھونڈ چکی تھیں اور اپنے اس کارنامے پر خاصی مسرور تھیں، وہ مطمئن نہیں ہوا تھا، مگر ان کو خوش دیکھ کر چپ ضرور ہو گیا تھا، ہاں اس کیئر ٹیکر کے کچھ مشکوک رویوں نے اسے ضرور چونکا یا تھا، اس کا پردہ کرنا غنی کے لئے سخت اچھبے کا باعث تھا، وہ اسے کوئی ڈھکوسلہ ہی سمجھتا رہا تھا

بھاری ذمہ داری ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں، آپ فکر مت کریں، میں نے تو زندگی اور رشتے کے اتنے تلخ اور بکڑے ہوئے رویے دیکھے ہیں کہ اس کے مقابلے میں تو بیگم صاحبہ اور شائندہ بی بی کا وہ رویہ بالکل معمولی سا ہے۔“

”بیگم صاحبہ اور شائندہ بی بی نہیں، اب تمہاری حیثیت اور مقام بدل چکا ہے، کیا کہہ کر بلانا ہے، اس کا فیصلہ تم کرو گی، اچھا اب بیگم صاحبہ اپنے ہاتھوں کا بنانا شیت بھی کروا دیجئے، عرصہ ہو گیا گھر کا ناشتہ کیے ہوئے۔“ خوشگوار لہجے میں کہہ گئے جبکہ پردہ سر پر ہاتھ مار کر رکھی تھی۔

”ابھی بیاتی ہوں۔“

”اماں جی کے پاس ہوں میں، وہیں لے آؤاں کا اور میرا ناشتہ باقی لوگ تو دس بجے جا کر اٹھیں گے اور ہاں تم آرام سے گھر میں ہر جگہ آ جا سکتی ہو، میں نے مرد ملازمین کو اندر والے پورشن میں آنے سے منع کر دیا ہے، رضیہ ہو گی اندر بس۔“ اسے باہر جاتے سے نصاب لگاتا دیکھ کر وہ بولا تھا۔

”شکریہ۔“ کہہ کر عائشہ کچن کی سمت آ گئی تھی، پوری آسودگی اور ملکیت کا ایک خوب صورت احساس تھا جس نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، غنی سے متعلق تمام خدشات بھاب بن کر اڑ گئے تھے، اپنے ظاہری لب و لہجے کے برعکس وہ ایک سادہ اور انتہائی نرم دل انسان تھا۔

اٹھتے بیٹھے وہ اپنے پاک پروردگار کا شکر ادا کرتے نہیں چھوڑتی تھی، گناہوں بھری زندگی سے ایک صاف اور مکمل زندگی کی طرف کا سفر اس کے لئے قدرت کی طرف سے ایک انعام تھا جس کے لئے وہ ایک طرف سے بے حد عاجزی کے

اس کے علاوہ باقی گھر والے بھی۔

شادی سے اگلے روز بھی اس کی آنکھ معمول کے مطابق ہی کھلی تھی، نماز پڑھ کر جیسے ہی وہ واپس آیا، حیرت کے شدید جھٹکے سے دو چار ہوا تھا کہ جائے نماز پر وہ سجدے کی حالت میں تھی اور اس کا جسم لرزے دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی تھی، غنی نے جان بوجھ کر آواز پیدا کی، اس نے اٹھ کر آنسو سے تر چہرہ صاف کیا اور جائے نماز لپیٹ کر اپنی مخصوص جگہ پر رکھی۔

”یہاں آؤ۔“ غنی نے نرمی سے اسے اپنے پاس بلایا، ہمیشہ نقاب میں دیکھا تھا اسے اور بدگمانی کی عینک سے دیکھا تھا، شادی کے بعد وہ اس کو دیکھنے کا پورا حق رکھتا تھا پھر نظر بھی وہ اس کے پسندیدہ اطوار میں آ رہی تھی تو بے ساختہ جذبات اندر سے ابھرتے محسوس ہوئے تھے۔

”دیکھو عائشہ! ایک حیا دار عورت دنیا میں کسی مرد کے لئے انعام ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں میرے خواب کی یہ تعبیر اتنی طویل ہو کہ کبھی ختم نہ ہو۔“ اس کے گلن سے چھینر چھاڑ کر تا وہ ایک جذب کی سی کیفیت میں تھا، رشتوں اور محبت کو تری اس لڑکی نے اس کیفیت کو پورے دل سے محسوس کیا تھا، اتنا اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

”میں آپ کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”چاچی اور شائندہ کا رویہ ہو سکتا ہے کچھ مناسب نہ رہے کہ انہیں وقت لگے گا اس صورتحال کو دل سے قبول کرنے میں، تھوڑی برداشت سے کام لینا ہو گا تمہیں، وہ زیر کفالت ہیں، تایا کی وفات کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری ذمہ داری ہیں، وہ مانیں یا نہ مانیں، جب تک شائندہ کی شادی نہیں ہو جاتی، مجھ پر بہت

لئے مانا پسند کرتی تھی، رضیہ اگرچہ اس کی مدد کر دیا کرتی تھی، شائد تو تیار ہو کر کہیں باہر نکل گئی تھی، شائد بیگم اپنے کمرے میں تھیں، وہ ایک اور چکر اماں جی کے کمرے میں بھی لگا آئی تھی مبادا وہ جاگ نہ گئی ہوں اور ان کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، مگر وہ پرسکون نیند میں تھیں، غنی اور عائشہ کے علاوہ اس گھر میں اماں جی اپنے اس فیصلے پر بے حد مسرور نظر آتی تھیں، ہر ملاقات پر غنی کو جتنا تئیں کہ دیکھو ہر بار قدرت انسان سے رشتوں کی صورت امتحان نہیں لیا کرتی، بسا اوقات اس میں اس کے لئے انعام بھی چھپا ہوتا ہے اور وہ عائشہ کو غنی اور اس گھر کے لئے انعام گردانتی تھیں، وہ ان کی زبانی عائشہ کی تعریفیں سن کر مسکرا دیا کرتا تھا۔

کھانا تیار کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی تھی، تلہر کی نماز میں ابھی وقت تھا تو اس کا خیال تھا کہ تھوڑا سا آرام کر لیا جائے تب تک غنی بھی آ جاتا غنی کی اچانک کال اس کے لئے غیر متوقع تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں..... آپ کا انتظار۔“ اس کی محبت بھری رفاقت نے اس کو اعتماد دیا تھا۔

”تو آپ کا انتظار ختم کیے دیجئے ہیں، پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس، جلدی سے تیار د جاؤ، میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔“

”تمہاری شاپنگ بھی کر لیں گے اور کھانا بھی کہیں باہر کھائیں گے آج، ہاں اماں جی کے کھانے اور دووا کی ہدایات رضیہ کو دے دو۔“ وہ غلت میں بولا تھا۔

”نہیں..... وہ میرے پاس ابھی سب کچھ ہے بڑا ضرورت کا، ابھی شادی پر تو اماں جی نے اتنا سارا کچھ دلایا ہے، کہ اگلے کئی سال بھی گزر

ساتھ شکر ادا کرتی تو دوسری طرف اپنے ان گناہوں کی رودر معافی مانگتی بھلے جو اس نے بے حد مجبوری کی حالت میں کیے تھے مگر کیے تو دانستہ تھے ناں، اس وقت اسے ایک غلط کام کا احساس ہوتا تو تھا اور وہ اس سے کنارہ کشی بھی چاہتی تھی مگر ماں جی کو جب سے اس نے ترجمہ کے ساتھ تلاوت سنانا شروع کی تھی اس میں ایک پاکباز عورت پر اللہ کے انعامات کی حد سے اسے خون کے آنسو لانے پر مجبور کر دیتی تو بدکار لوگوں کے لئے جہنم کا خوف اس کے روئیں روئیں کولرزا دیتا تھا، وہ اور خشوع سے معافی کی طلب گار ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

شائد بیگم اور شائد نے اس سے بات چیت بالکل بند کر رکھی تھی اور جب بھی بولتیں، تلفن پھاڑے بولتیں، اس کے خاندان، کردار اور پردے پر ایسی ایسی باتیں سناتیں کہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک اس کے برداشت کی حد ختم ہو چکی ہوتی مگر اس کو جو کچھ ایک بن مانگی دعا کی مانند مل چکا تھا اس کے صدقے وہ یہ تو کیا کچھ بھی برداشت کر سکتی تھی۔

اماں جی بہت سویرے کی جاگی ہوئی تھیں، ان کو وضو اور نماز میں مدد کے بعد ان تینوں نے مل کر ناشتہ کیا تھا اور غنی کے جانے کے بعد انہوں نے حسب معمول اس سے تلاوت قرآن پاک سنی تھی، ان کی ورزش کرانے کے بعد وہ نیچے آگئی تھی۔

شائد بیگم اور شائد بھی اپنا ناشتہ ملازمین سے نہیں اسی سے بنوا کر کھانا پسند کرتی تھیں، اس میں ان کے احساس برتری کو تسکین ملتی تھی شاید، غنی کے بہت منع کرنے کے باوجود بھی وہ دوپہر اور رات کا کھانا خود اپنے ہاتھوں سے اس کے

سکتے ہیں، کھانا بھی باہر نہیں کیونکہ کھانا میں آپ کی پسند کا اپنے ہاتھوں بنا چکی ہوں، آپ گھر آ کر میرے اور اماں جی کے ساتھ کھائیں گے تو مجھے اور ان کو خوشی ہوگی، وہ بزرگ ہیں اور بیمار بھی تو ایسے انسانوں کو اپنوں کا وقت اور توجہ کی عام انسانوں سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، جس وقت آپ ان کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ان کے لئے بہترین وقت ہوتا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

”اور تم..... تم کیسا محسوس کرتی ہو میری موجودگی میں؟“

”میری زندگی کا حاصل ہوتا ہے وہ وقت۔“ اس کے فوراً کہنے پر وہ سرشار ہو گیا۔

”میں خود بھی بغیر ضرورت کے باہر نہ پڑنے کو مناسب نہیں جانتا، میرے لئے بھی وہ وقت بہترین ہوتا ہے جب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

”مگر انسان تجربات کی بھٹی میں پک کر کندن بنتا ہے، میری پہلی بیوی مجھے ایک دقیانوسی مرد کہتی تھی کیونکہ مجھے اس کا باہر آزادانہ گھومنا پسند تھا، کچھ ایسی ہی خواہشات صائمہ کی بھی تھیں کہ اسے ہونٹنگ کا بہت شوق تھا مگر شوق جب جنون بنتا ہے تو گھر برباد ہو جاتے ہیں، روز کی اس فرمائش پر میں اسے ڈانٹ بھی دیتا تھا، اب میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے تمہاری ایسی کوئی خواہش ہو تو تم بھی مجھ سے بیان کر دیا کرو، تمہاری ہر جائز خواہش پوری کر کے مجھے خوشی ہو گی۔“ وہ اپنی زندگی کے پچھ اور پوشیدہ گوشے اس کے سامنے بے نقاب کر رہا تھا۔

”بہر حال مجھے تمہارے خیالات جان کر بے حد خوشی ہو رہی ہے، کھانا لگاؤ، میں بس بیچنے

والا ہوں، اماں جی کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔“ اس نے بے حد خوش گوار لہجے میں بات کا جواب دے کر کال ڈسکونٹ کر دی تھی، عائشہ نے ایک خوب صورت سوٹ پہن کر ہلکا پھلکا میک اپ کیا اور اماں جی کے پاس آ گئی، وہ جاگ بچی تھی، عائشہ نے جب تک ان کا منہ ہاتھ دھلایا، غنی بھی آچکا تھا، تینوں نے مل کر بہت خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا، چائے پی لینے کے بعد اماں جی کو دووا کی غنی نے خود کھلائی تھی، اس کے بعد اماں جی نے خود ان کو کہا تھا کہ وہ اب نماز پڑھیں گی، وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے جائیں اور ان کے پاس رضیہ کو بھیج دیا جائے، انہوں نے وارڈ روب میں سے کچھ فالتو کپڑے نکال لئے ہیں، اگرچہ عائشہ نے کہا کہ اسے بتائیں وہ کر دیتی ہے مگر اماں جی نے اسے ٹوک کر کہا تھا کہ اب صرف وہ ہی اس کی ذمہ داری نہیں ہیں اب اس میں غنی بھی شامل ہو چکا ہے اور ایک اچھی عورت کا فرض ہے کہ جب اس کامیال گھر پر ہو تو اس کی پوری توجہ کا مرکز وہی ہونا چاہیے۔“ وہ تالعداری سے سر ہلاتی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف آ گئی تھی۔

☆☆☆

”تم ہوتے کون ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے، میری زندگی ہے تو مجھے بھی میری پسند کا سہمی منتخب کرنے کا حق ہے، جس طرح تمہیں۔“ غصے میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر وہ زور سے بولی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ غنی چونکہ شائستہ کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا تو اس کا خیال تھا کہ اس کی شادی کر دینی چاہیے، یہی سوچ کر وہ اپنے سرکل کے دو تین اچھے پروپوز کے کر شاہدہ بیگم کے پاس آیا تھا کہ اگر وہ شفق ہوں تو وہ ان کو گھر پر بلوا سکے،

شاہدہ بیگم ابھی کچھ کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ وہ تیری
تیری سے آئی تھی اس کے پاس۔
”بالکل حق ہے، پر پرو پولز اگر پسند نہیں ہے
تو اپنی پسند بتاؤ شائے، جہاں کہو گی، میں وہیں
تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ محل سے
بولا تھا۔

”کیوں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم نے مجھے
بتایا تھا جب ایری غیری عورتوں سے پیار چاہا تم
نے، ایک نہیں تین تین بار۔“ ایک لمحے میں غنی کا
چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اسے سمجھا دیجئے گا چچی جان کہ یہ مانے یا
نہ مانے اس گھر کا سربراہ میں ہوں اور اس گھر
میں رہنے والے لوگ میری ذمہ داری ہیں، مگر
میں اپنے کسی عمل کے لئے کسی کا جواب دہ نہیں
ہوں، اس کی پسند پوچھ کر بتا دیجئے گا، میں وقت
پر اپنے تمام فرائض ادا کرنے کا عادی ہوں اور
بیٹی اور بہن کی ذمہ داری تو بہت اہم ذمہ داری
ہے اس کے سبکدوش ہونے پر تو بہت زور دیا گیا
ہے، میں دو ماہ کے اندر اندر اس کو رخصت کرنے
کا خواہاں ہوں، یہ چیک کیش کرا کے خریداری
شروع کر دیجئے۔“ شاہدہ بیگم کے سامنے چیک
رکھ کر وہ بربادری سے چلتا وہاں سے ہٹ گیا
تھا۔

”میں تمہارے دباؤ میں آ جاؤں گی، اس
خوش فہمی میں مت رہنا، میں ہمیشہ اپنی مرضی
کرنے کی عادی ہوں اور ایسے ہی کروں گی،
شادی بھی کروں گی مگر تمہارے کہنے پر ہرگز
نہیں۔“ وہ اس کے پیچھے چیخ چیخ کر بول رہی تھی،
پھر اس نے روئے سخن اپنی ماں کی طرف کر لیا۔
”آپ کس خوشی میں چپ کر کے سنتی
رہیں، سمجھتا گیا ہے وہ اپنے آپ کو، ہونہ شادی
کرائے گا میری۔“ اہل گھل کر وہ اپنا غصہ کم

کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے شائے، پھر بھی مہربانی
ہے اس کی کہ اس طرح سوچ رہا ہے، اس کی ذمہ
داری نہیں ہیں ہم، پھر بھی ایسا سوچتا ہے اور ہمارا
خروج برداشت کرتا ہے، رائے کے میاں کو کاروبار
کرا کے دیا اس کو بیابانی بیٹی کا مان دیتے ہوئے ہر
موقع پر یاد رکھتا ہے، وہ ایسا نہ کرے تو ہم مجبور
نہیں کر سکتے اس کو، اس وقت تم ہی کچھ ڈھیلی پڑ
جائیں اور اس کی خواہشات کے مطابق ڈھل
جائیں تو آج اس انجان لڑکی کی جگہ تم اس گھر پر
عیش کر رہی ہو تیں۔“

”کیا کہہ رہی ہیں می، وہ ہم پر کوئی احسان
نہیں کر رہا، آج ہم پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو کل
میرے پاپا نے بھی اس کو سہارا دے کر بہت بڑا
احسان کیا تھا جس کا بدلہ وہ مر کر بھی نہیں اتار سکتا،
اس وقت پاپا اسے سہارا نہ دیتے تو آج درد رکی
ٹھو کریں کھا رہا ہوتا اور اس کی پسند..... مائی فٹ
اس کی پسند۔“ وہ پاؤں بچ کر بولی۔

”وہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والا ایک
ٹپیکل مرد ہے جو باہر جو عیاشیاں کرتا پھرے،
عورت کو گھر میں قید کر کے رکھنا پسند کرتا ہے، اوپر
سے پردے کی پابندی الگ، پتہ چاہے یا نہ
چاہے میں صرف اس کو پسند کرتی تھی، اس کے
ان سوکا لڑ نظریات کی تو سخت مخالف ہوں میں،
اور مجھے شکرانے کا بدلہ بھی میں لے کر رہوں گی
اس سے، یہ بات آپ یاد رکھیے گا۔“ دانت پیستے
ہوئے اس نے ماں کو نگہا اور باہر نکل گئی تھی، شاہدہ
بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں، جیسی تربیت انہوں نے
اپنی بیٹیوں کی، کی تھی وہ ویسے ہی برتاؤ کا مظاہرہ
کر کے گئی تھی۔

☆☆☆

”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرت سے اپنے

ان میں ماں کے بعد آپ سب سے زیادہ قیمتی ہیں، خدا کی قسم، مجھے آپ کسی انعام کی طرح نوازے گئے ہیں، ساری عمر بھی اسے مالک کے آگے سجدے میں پڑی رہوں، پھر بھی کم ہے، میرے لئے عزت، چادر، محبت گھر اور ساری کائنات آپ ہیں، آپ مجھے جھونپڑی میں بھی رکھیں گے میں وہاں بھی خوش رہوں گی۔“

”ایک عزت دار چار دیواری کی خواہش تھی مجھے، وہ پوری ہو گئی، کبھی سب کچھ مل گیا، بس اللہ پاک آپ کی سلامت رکھے۔“ وہ پورے خلوص اور دل سے اپنے جذبات بیان کر رہی تھی، اب بالکل چپ ہو کر سننے کی باری غنی کی تھی، ایک بار پھر وہ دل ہی دل میں اپنے اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ جس نے دوبارہ اسے رشتوں کی آزمائش میں سے گزارا تھا تو تیسری مرتبہ انعام سے بھی تو نوازا تھا۔

☆☆☆

”عائشہ! یہاں بیٹھو بیٹا، مجھے ایک بات کرنی تھی تم سے۔“ وہ ان کی ورزش کرانے کے بعد واپس جا رہی تھی جب کچھ سوچ کر اماں جی نے اسے روک لیا تھا، عائشہ آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہمارے ہاں پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے، آج شاہدہ رانہ کو اس سلسلے میں لینے کے لئے مقرر ہے، تم اس گھر کے حالات اور ان ماں بیٹیوں کو خود سے بخش سے واقف ہو، جبکہ ایک دفعہ پہلے بھی رانہ اپنے شوہر سے تمہارے پردے کی وجہ سے اچھا خاصا تماشا بنا چکی ہے، اب رانہ یہاں ہوگی تو احقر بھی لامحالہ یہیں پائے جائے گا، تمہیں تفصیل اس لئے بتا رہی ہوں کہ تم خود اپنے پردے کے حوالے سے محتاط رہنا اور کوشش کرنا کہ بچہ کم ہی جاوے، کچن رضیہ خود دیکھ لیا کرے گی،

ہاتھ میں پکڑے اس خاکی لفافے کو دیکھا جو اس کو ابھی ابھی غنی نے پکڑا یا تھا۔

”تمہارے لئے گھر خریدا ہے، اس کے کاغذات ہیں یہ، عورت کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، ایک گھر کا خواب ہمیشہ اس کے دل میں ہوتا ہے، یہ بھی تمہارا گھر ہے، لیکن یہ میرے ابا اور بچانے مل کر بنایا تھا، شائیدہ کی شادی کے بعد میں یہ گھر چاچی کو دے کر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، رانہ کا میاں گھر لینا افورڈ نہیں کر سکتا، اچھا ہے وہ لوگ بھی ادھر ہی شفٹ ہو جائیں تو چچی کا اکیلے نہ رہ سکنے والا معاملہ بھی حل ہو جائے گا، اماں جی کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ہاں یہ گھر میں نے تمہارے نام سے خریدا ہے۔“

اپنی عادت کے برخلاف وہ اب ہر بات اسے تفصیل سے بتایا کرتا تھا، یا شاید زندگی ہمیں کچھ ایسے لوگ دان کرتی ہے جن سے اپنی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ شیر کرنے کو دل کرتا ہے، اپنی اچھی عادات اور طور طریقوں کے سبب اس نے اتنی جلدی غنی کے دل میں جگہ بنائی تھی کہ وہ خود حیران رہ گیا تھا اور وہ پریشان ہو گیا اسے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے۔

”کیا ہوا عائشہ! روکیوں رہی ہو، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جو تمہیں اچھی نہیں لگی۔“ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے وہ بے قراری سے بول رہا تھا، عائشہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا گیلیا چہرہ صاف کیا۔

”میرا کوئی غل مجھے یاد نہیں کہ جواتا اچھا ہو جس پر اللہ مجھے اتنا نواز رہا ہے، بس اس کا کرم ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ روئی روئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”زندگی میں اللہ نے جو نعمتیں مجھے دی ہیں

تھا کہ کیا ایک داماد میں اس کے سسرال میں اتنی عزت ہے کہ اس گھر کی ملازمہ بھی اس سے پردہ کرے، نئی نئی شادی تھی، رائے پوری طرح میاں کے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوبی ہوئی تھی، باقاعدہ اس کا نقاب اتارنے پر تل گئی، اسے پہلے خیال نہیں آیا تھا اب میاں کے احساس دلانے پر اسے اس سے زیادہ بے عزتی محسوس ہو رہی تھی، وہ تو اس دن اماں جی کو ان کی فرمائش پر نیچے لے آئی تھی کہ داماد پہلی بار گھر آیا تھا تو وہ موجود تھیں اور رائے کو ڈانٹ کر عائشہ سے دور ہٹایا تھا اور عائشہ کی طرف داری کرتے ہوئے بہو اور پوتیوں کی بھی بار بار ضحک کر دیا تھا۔

رائے نے اس واقعے سے ایک دو بار پہلے سرسری سا تذکرہ کیا تھا کہ وہ لڑکی اتنی حسین ہے کہ واقعی پردہ اس کے جن کی ڈھال ہے، ایک سطحی مرد کے دماغ میں لاشعور میں چھپی یہ بات اس کا نقاب دیکھ کر سامنے آئی کو دل پہلو میں بیٹھ حسین بیوی کو چھوڑ کر اس نقاب پوش حسینہ کو دیکھنے کو چل اٹھا اور اس نے یہ ڈرامہ کمری ایٹ کیا مگر اس کا فائدہ کچھ نہ نکلا اور اس کے دل میں ایک گرہ ضرور چھوڑ گیا، جب بھی اس پر نظر پڑتی تھی اسے دیکھنے کی کک بڑھ سی جاتی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد غنی بھی اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو گیا تھا، اس دن اماں جی کو قرآن پاک پڑھ کر سنانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو طبیعت کچھ بوجھل سی تھی، وہ کچھ دیر سنانے کو لیٹ گئی تو نیند نے آن لیا تھا، گھنٹہ بھر ہی نیند آئی ہوگی اسے، ظہر کی نماز کے لئے جاتے ہوئے اسے ایک زوردار چکر آیا تھا اور دل بھی عجیب عجیب سا ہو رہا تھا، دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے وقت اپنی خراب حالت کا اندازہ ہوتے ہی وہ

پہلے کی بات اور تھی، اب تم اس گھر کی بہو ہو اور وہ نینوں نہیں گھر کے داماد کے سامنے کچھ کہیں، یہ نہ مجھ سے برداشت ہو گا نہ غنی سے کچھ میں پتھر پھینکنے سے اپنا دامن واعدار ہوتا ہے اس لئے دامن کو اجلا رکھنے کے لئے وہاں سے احتیاط سے بچ کر گزرتا چاہیے، امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے اماں، جیسے آپ کی مرضی۔“
”جیستی رہو میری بچی۔“ انہوں نے بے ساختہ اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆

واقعی رائے کے آتے ہی اس کے خلاف محاذ نئے سرے سے تیار ہو چکا تھا، بچن کی سہولت اوپر نہیں تھی تو غنی کے ناشتے کے لئے اسے لامحالہ نیچے جانا پڑتا تھا، مصیبت یہ تھی کہ رائے کے خاوند کو بچی کا کام پر جانا ہوتا تھا تو وہ دونوں میاں بیوی بھی میج اٹھے ہوتے تھے، اگرچہ ان کا ناشتہ تو رضیہ ہی بناتی مگر اسے نقاب میں دیکھ کر رائے اپنے خاوند کی تذلیل گردانی اور زبان کی دھارتو اس کی شائستہ سے بھی زیادہ تیز تھی، منہ کان لپیٹے وہ ناشتے کی ٹرے لے کر اوپر آ جاتی اور یہ اب روز کا معمول بن چکا تھا، ہاں بانی وقت وہ اماں جی کی ہدایت کے پیش نظر بہت کم نیچے آتی تھی۔

☆☆☆

اور یہ تو انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ جو چیز پوشیدہ رکھی جائے اس کے بارے میں تجسس بھی زیادہ ہوتا ہے، ایسا ہی ایک فرد احمر بھی تھا، جس کے لئے وہ لڑکی ایک چیلنج اس وقت بنی تھی جب ملازمہ ہو کر اس نے اس کی چائے بنا دینے کی فرمائش تو پوری کی تھی مگر نقاب میں آ کر اسے اچھے خاصے غصے میں مبتلا کر دیا تھا، اس نے بلاوجہ بات کو بڑھا چڑھا کر چائے پینے سے انکار کر دیا

جزئیات کے ساتھ یاد آچکے تھے کیونکہ اس سے ہونے والی وہ خوب صورت ملاقات نہ تو معمولی تھی، نہ ہی پرانی، معنی خیزی سے مسکراتا وہ بیوی کے پاس چل دیا تھا۔

☆☆☆

آج کا دن اس کے لئے بے حد مصروفیت لئے ہوئے تھا کہ فیکٹری کے سامان کی لوڈنگ کے لئے اسے خود ہی جانا پڑتا تھا، مغرب کے بعد جا کر وہ فارغ ہوا تھا، جیب سے سیل نکال کر آن کیا تھا، اسے بے حد حیرت ہوئی جب اس نے سیل پر شانہ اور شاہدہ چچی کے نمبر سے بے شمار مسڈ کالز اور میسجز موجود تھے جبکہ اسے بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے کبھی ان لوگوں کو یا ان لوگوں نے کبھی اس کو کال یا میسج کیا ہو کیونکہ ٹیکسٹ کارڈ یہی اتنا محتاط اور لے دے والا ہوتا تھا کہ کبھی ایسی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی سو اس وقت اس کا پریشان ہونا فطری عمل تھا، اس کا دھیان فوراً ماں جی کی طرف گیا تھا کہ ان کی طبیعت نے گڑبڑ نہ کی ہو، سو پہلی کال عائدہ کو ملائی تھی، اس کا نمبر آف ملے پر وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شانہ کو کال ملا چکا تھا۔

”ہاں خیریت ہی خیریت ہے ڈیر اور تمہارے لئے تمہاری زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تیار ہے میرے پاس، آخر اللہ سب کا ہے، اس نے تمہاری سنی تو میری کیوں نہ سنتا، جلدی گھر آؤ، پھر بات ہوگی۔“ ماں جی خیریت معلوم تو ہو گئی تھی مگر اس کے بعد جو کچھ شانہ نے کہا تھا وہ اس کو سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تھا مگر اس کی باتوں نے اس کے اندر عجیب سی بے چینی ضرور بھردی تھی، وہ تیزی سے گاڑی بھاگتا ہوا گھر آیا تھا، گھر آنے پر خلاف توقع نیچے گھر کے کبھی افراد ہی وہاں جمع تھے بشمول احمر کے، ماں جی ایک

پورے خشوع سے سجدے میں گر گئی تھی، نماز کے بعد اماں جی سے ذکر کرنے آئی تو وہ اسے سوئی ملی تھیں۔

بے حد مسرور انداز میں وہ نیچے کچن تک آئی تھی کہ ایک دم ہی چائے پینے کو دل کیا تھا، اگر واقعی ایسا ہے تو وہ کتنا خوش ہوگا؟ نیچے اسے بے حد پسند تھے یہ تو وہ اسے بتا ہی چکا تھا۔

”کیا اسے فون کر کے بتانا چاہیے کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“ دل ہی دل میں کئی باتیں اس حوالے سے سوچتے کچھ دیر پہلے کی نسل بندی اور بو جھل پن کو بھول چکی تھی۔

اچانک ہی دبے پاؤں وہ اندر داخل ہوا تھا، عائدہ نے خبر سنی کہ وہ آج گھر پر ہی تھا، وہ اس وقت عموماً کام پر ہوتا تھا اور غنی نے مرد ملازمین کو بہت پہلے اندر والے پورشن میں آنے سے منع کر دیا تھا، عائدہ اپنی عادت کے مطابق دوپٹہ سر پر تولیے ہوئے تھے مگر نقاب کا تر دو نہیں کیا تھا، سو جیسے ہی اس نے اپنے بے حد قریب کھٹکا تھا، لاشعوری طور پر وہ پیچھے کو مڑی تھی اور احمر بھائی کو دیکھ کر اس نے سرعت سے دوپٹے کا نقاب بنا کر دوبارہ رخ موڑ گئی۔

”آپ تشریف فرمائیں میں تو رضیہ سمجھ کے آیا تھا کہ چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔“ دل ہی دل میں انھیں محسوس کرتے ہوئے وہ بے حد خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا کہ چلو کسی بہانے ہی سہی اس کا دیدار تو کر ہی لیا تھا مگر وہ چہرہ اسے کیوں ششاسا محسوس ہوا تھا، عائدہ کچھ بھی جواب دینے بغیر اپنا چائے کا کپ اٹھا کر وہاں سے چلی گئی تھی، دوپٹے سے نیچے لمبے بالوں کی چٹیا کو بغور دیکھتے احمر کے دماغ میں جیسے ایک جھماکا ہوا اور وہ اس کے بعد حرکت کرنے کے قابل نہ رہا تھا، وہ چہرہ اور لڑکی اسے پوری

کرتے۔“ ایک ٹرین گویا ایک زوردار آواز کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر کر اس کے وجود کے پرچے اڑا گئی تھی۔

”کیا اس بند کرو شائے، میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا، تمہارے چچا زاد ہونے کا بھی نہیں۔“ وہ حلق کے بل دھاڑا تھا، عائشہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رو رہی تھی، قیامت آج ہی تو برپا ہوئی تھی، حشر آج ہی پنا ہوا تھا اس کے لئے اور ہر فرد کے ہاتھوں میں اس کے اعمال کے لئے سنگ تھے، نشتر تھے وہ کس کس کے ہاتھ پکڑتی، کس کس کی زبان کو روکتی۔

رائیہ اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ اٹھ کر غنی تک آئی اور نفرت سے عائشہ کی طرف اشارہ کر کے بتانے لگی کہ احمر کے کچھ شوقین مزاج دوست کچھ اس قسم کے شوق رکھتے ہیں زبانی طور پر بھی بھٹلے ایسے کاموں کو کوئی کیوں برا بھلا نہ کہتا ہو، مگر کچھ لوگ ایسے شوق فخر سے اپناتے ہیں، وہ سب شریف لوگ ہیں مگر محفل کے لئے بھی بھار کچھ لڑکیوں کو وقت گزارنے کے لئے ایسی رنگین محفلیں سجاتے رہتے ہیں جہاں وہ تھرکتے وجود سے نوٹ نچھاور کرتے ہیں اور اپنے شوق کی پیاس بجھاتے ہیں جن میں عائشہ بھی شامل تھی اور شادی سے پہلے احمر بھی ان لوگوں میں شامل تھا اور عائشہ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، وہ لوگ اس کے گروپ میں مستقل کسٹمرز تھے گویا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں عائشہ، تم بتاؤ کیوں کہہ رہی ہیں یہ ایسے، مجھے بتاؤ اگر یہ جھوٹ ہے تو خدا کی قسم میں ایسی بات بولنے والوں کی زبانیں کھینچ لوں گا۔“ شائے کو بولتے چھوڑ کر اس نے روٹی ہوئی عائشہ کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور غضبناک سے بولا تھا۔

”میں..... میں آپ کو سچ بتاؤں گی غنی،

سائڈ پر زور درنگت لئے غلط حال سی بیٹھی تھیں، ان سب پر نظر دوڑاتے اس کی نگاہ ان سب کے کٹھنوں میں بالکل درمیان میں کھڑی ہوئی عائشہ پر پڑی، وہ حسب معمول نقاب میں تھی، اسے دیکھ کر وہ تیر کی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی، اس کی آنکھیں سرخ اور سوچی ہوئی تھیں۔

”ان سب کی بات سننے سے پہلے آپ میری بات سنیں گے، میں آپ کو سب سچ بتاؤں گی، میں تو آپ کو پہلے بھی بتانا چاہتی تھی مگر آپ.....“ آنسوؤں کی آمیزش کے ساتھ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

”بس بی بی بس اب نہیں ہم ان ڈھکوسلوں میں آنے کے، بہت برداشت کر لیا تمہیں، اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور دفغان ہو جاؤ اس غلیظ جگہ جہاں سے تعلق ہے تمہارا۔“

”کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟“ شاید چچی کی غیر مناسب بات پر وہ دھاڑا تھا، عائشہ تو اس کے بازو کو مضبوطی سے تھامے بس پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی، اپنی پاکیزہ اور سوکا لڈ باپردہ بیگم سے شادی سے پہلے کم از کم اتنا ہی پوچھ لیا ہوتا کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہے اور کام کیا کرتی تھی، شائے اب اس کے سامنے آکر طرے سے پوچھ رہی تھی، غنی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”تمہیں پتہ ہے کہ میں فضول گوئی سخت نا پسند کرتا ہوں۔“

”جی بالکل پتہ ہے مگر مسٹر غنی لوگ ایسے تو نہیں کہتے کہ رشتے کرنے سے پہلے اگلے کا حسب نسب تو ضرور ہی دیکھ لینا چاہیے، آپ کی پہلی بیوی بے وفا تھی، دوسری چور اور تیسری نے تو ان دونوں کا بھی ریکارڈ توڑ دیا، امراء کی محفلیوں میں ادا نہیں دیکھائی رہیں ہیں محترمہ مجرا کرتے

تاپاک وجود لے کر یہاں سے چلی جاؤ، ورنہ میں ملازم کو بلا لوں گی تمہیں دھکے دے کر نکالے گا۔“
ہاری بازی جیتنے کا وقت آیا تھا تو شاہدہ بیگم کیوں پیچھے رہیں۔

”شاہدہ! رضیہ کو بلاؤ، مجھے اوپر چھوڑ آئے، میں تھک گئی ہوں بیٹھے بیٹھے، مجھے اوپر چھوڑ کر آئے۔“

ایک اور فیصلہ جوان کے ہاتھوں طے ہوا تھا نے ایک بار پھر ان کی کمر کو اور ان کے پوتے کے دل اور گھر کو توڑ ڈالا تھا، اس وقت وہ صرف اپنے اللہ کا آسرا چاہتی تھیں، اسی سے دکھ درد بانٹنا چاہتی تھیں، انہیں اس روتی بھلتی لڑکی پر ذرا بھی ترس نہیں آیا تھا جس نے ان کے گھر کو اتنی بڑی زک پہنچائی تھی، رضیہ آئی تھی اور انہیں سہارا دے کر آہستہ آہستہ اوپر لے جانے لگی تھی۔

”سلیم!“ شاہدہ بیگم نے زور سے ملازم کو آواز لگائی تھی۔

”مجھے یہ عورت اب اس گھر میں تو کیا اس کے آس پاس بھی کہیں نظر آئی تو تم اپنی نوکری کی خیر متا لینا، یہ غنی کا بھی آرڈر ہے، تم اس سے تصدیق کر سکتے ہو۔“ فرعونیت کی حد پر کھڑی اس عورت نے تکبر سے کہا تھا اور دونوں بیٹیوں اور داماد کے ہمراہ وہاں سے چلی گئی تھیں، ملازم جس نے شاہدہ بیگم کا پہلا حکم سنا تو کچھ تذبذب کا شکار ہوا تھا مگر غنی کا آرڈر سننے ہی الٹ ہو گیا، مالک لوگ تھے ان کی مرضی جس کو چاہے سر پر بٹھاتے، جس کو ٹھوکر مار کر نکال باہر کرتے، اسے اپنی نوکری بچاتی تھی۔

”اٹھو بی بی آپ نے سنا نہیں کہ صاحب لوگوں نے کیا حکم دیا ہے؟ ابھی بھی۔“ اس نے نیچے ساکت بیٹھی بی بی کو کہا جس کے لئے کچھ دن پہلے تک صاحب کی طرف سے ان کا اندر تک آنا

آپ اپنے کمرے میں چلیں یہ سچ ہے مگر وہ میرا ماضی..... ابھی اس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ غنی کے ایک زوردار چھپرنے اسے صوفے پر گرنے پر مجبور کر دیا تھا، شائستہ کے دل میں برسوں سے لگی آگ پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تھے، وہ تو ابھی اسے غنی کی نظروں سے گرانے کے لئے کوئی حکمت عملی ہی طے نہیں کر پائی تھی کہ قدرت نے اتنا بڑا راز آشکار کر کے اس کی راہ خود ہی ہموار کر دی تھی۔

☆☆☆

اگر کوئی برائی چھوڑ کر اچھائی کے راستے پر چلنا پسند کر رہا ہے تو ایسے شخص کی عیب پوشی تو اجر ہے، مگر لوگ گھر جوڑنے کی تدابیر نہیں اپنانے، گھر توڑنے کے لئے عیب تلاش کرتے ہیں، شیطان کا کام کتنا آسان کر دیا ہے ہم جیسے نفس کے غلاموں نے، اسے تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، بس ایک سوچ کا محرک ہی تو دینا پڑتا ہے، باقی کام پوری جان لڑا کر ہم خود ہی کر لیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ اس مردود کے آلہ کار بن کر ہم اس کو خوش اور اپنے حقیقی مالک کو ناراض کر رہے ہوتے ہیں۔

اس نے کچھ بھی کہے بغیر صرف اسے اپنی زندگی اور گھر سے چلے جانے کو کہا تھا اور کسی کو دیکھے اور سنے بغیر خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔

”اماں جی، اماں جی آپ تو میری ماں جیسی ہیں، مجھے جانتی ہیں اچھی طرح سے جانتی ہیں، صرف ایک بار میری بات سن لیں اس کے بعد جو بھی سزا دیں گی مجھے قبول ہوگی۔“ وہ ایک طرف تھکی تھکی اور خاموش بیٹھی اماں جی کے قدموں میں بیٹھ کر گڑ گڑاتی تھی۔

”بس کر دو تم اپنی یہ ڈرامے بازیاں اور اپنا

ممنوع تھا، آج اسی کو بازو سے پکڑ کر نکال دینے کو کہا گیا تھا۔

”واہ میرے مالک، یہ بڑے لوگ اور ان کے فیصلے۔“ دل ہی دل میں تاسف کا شکار ہوتا وہ اب اس عورت کو ہارے ہوئے انداز میں زمین سے اٹھتے دیکھ رہا تھا اور چند لمحوں بعد اسے گیٹ سے باہر کر کے اس نے گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا تھا۔

☆☆☆

”اللہ اصلیت دکھا دیتا ہے ہر رشتے کی، ہر تعلق کی، ہر محبت کی، ہر انسان کی، سب دکھا کے آدمی سے پوچھتا ہے اب بتا، تیرا میرے سوا اور کوئی ہے۔“

”اللہ!“

شام ڈھلتے اس نے آسمان کی جانب نگاہ کی اور پورے دل سے اپنے تخلیق کرنے والے کو پکارا تھا جو اپنی مخلوق کو کسی بھی حال میں تنہا نہیں چھوڑتا۔

جب دنیا میں کوئی سہارا نہ بچے تو انسان آخری درسی کا کھٹکھٹاتا ہے، نادان ہے ناں نہیں جانتا کہ اس خالق کائنات کو کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی ذات و صفات میں مکمل ہے، جو بھی رکاوٹیں اور مشکلات انسان کی زندگی میں آتی ہیں ان کے پیچھے چھپی حکمتوں کو انسان کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا وہ انسان کا راستہ نہیں روکتیں، نہ ہی اسے مزید مشکل بناتی ہیں بلکہ بہت دفعہ یہ اس سے بھی زیادہ بہتر راستے کی طرف گامزن کرنے آتی ہے۔

☆☆☆

”تم..... اس وقت..... کہاں چلی گئی تھیں تم، تمہارے اس پاگل ماموں نے تو ہماری ناک میں دم کر دیا کہ ضرورت تمہارے پاس چھپی ہوئی ہو

وہ تو پولیس کو بھی بلانے تک کی دھمکی دے کر گیا، وہ تو آگنی کو بھی تم جانتی ہو کہ ایسے لوگوں سے پنپنا ان کو اچھی طرح آتا ہے، ہم تو خود جبران تھے کہ تم کہاں چلی گئی ہو۔“ اسے دیکھ کر وہ اسے اندر بھی بلانا بھول گئی تھی اور تاہم توڑ سوالات شروع کر دیتے تھے، چند لمحوں بعد اسے خود احساس ہوا کہ اس نے اسے اندر نہیں بلایا اور عائنہ نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا، بس وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ارے میں بھی کتنی پاگل ہوں، باہر ہی ٹھہرا رکھا ہے تمہیں، آؤ اندر آؤ۔“ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر اسے اندر راستہ دیتی ہوئی بولی تھی، مردہ قدموں سے چلتی وہ اندر آئی تھی۔

☆☆☆

دودن بعد وہ کمرے سے نکلا تو وہی پرانا غنی تھا، اکھڑ، بد مزاج اور غصیللا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر، بالکل سامنے اماں جی کا کمرہ دیکھ کر وہ بے ساختہ اسی طرف آ گیا، دودن میں اگر اس کا دل اور گھبراہٹ گیا تھا تو اماں جی پوری ہی ٹوٹ گئی تھیں، وہ اتنی کمزور حال اور بیمار لگ رہی تھیں کہ کچھ دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول گیا اور بے قراری سے ان کے پاس آیا اور سہارا دے کر انہیں بکیوں سے ٹک لگا بیٹھا لیا۔

”اپنے غم میں میں کیسے بھول گیا کہ آپ بیمار ہیں اور ہر لمحہ آپ کو کسی نہ کسی کی ضرورت پڑتی ہے اور دودن سے نہ جانے آپ کو دوا دی گئی یا نہیں، آپ کی ایک وقت کی فزیو تھراپی میں ہونے کا مطلب آپ کی صحت کا کتنا نقصان ہے، اودہ میرے خدا، یہ کیا ہو گیا مجھ سے۔“ وہ دراز کھول کر ان کی دوائیں باہر رکھنے لگا اور دروازہ کھول کر دو تین بازو زور سے رضیہ کے نام کی صدا لگاتی تھی، واپس مڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا، آلسو

بھری آنکھوں کے ساتھ وہ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے تھیں، غنی رتپ کران کے پاس آیا تھا۔
”خدا جانتا ہے غنی، میں صرف تمہیں خوش اور ہنستا بسادہ دیکھنا چاہتی تھی۔“

”میں جانتا ہوں اماں جی، اس میں آپ کا یا کسی کا کوئی قصور نہیں، میری قسمت کا لکھا مجھے ملنا ہی تھا آپ کے یا میرے چاہنے نا چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

”رضیہ آپ آئندہ کے لئے صرف اماں جی کی خدمت کے لئے مختص رہیں گی، جب تک میں آپ کو نہ کہوں، تو میں ان کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی برداشت کروں گا نہ ان کی خدمت میں۔“ رضیہ کو داخل ہوتا دیکھ کر وہ سختی سے بولا تھا۔

☆☆☆

”تم آنٹی کو یا پارلر میں میرے متعلق کچھ مت بتانا، اور پلیز میرے لئے کوئی کام ڈھونڈ دو، میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

کبھی ہنسی بھی ان کے گروپ کا حصہ تھی اور پارلر میں ہی کام کرتی تھی مگر جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی دھن اسے اس طرف لے آئی تھی، ایک بار وہ ان سب کو اپنے گھر بھی لے کر گئی تھی جہاں وہ اپنی طلاق یافتہ بہن کے ساتھ رہتی تھی جسے محض جہیز نہ لانے پر طلاق نامہ دے کر واپس گھر بھیج دیا گیا تھا، بھی ہنسی نے جانا تھا کہ پیسہ انسان کے سارے عیب ڈھک لیتا ہے، لوگ صرف پیسہ اور اس کے کمالات دیکھتے ہیں، یہ ماننے میں ان کو کوئی دھچکی نہیں ہوتی کہ وہ پیسہ گن ذرائع سے کمایا گیا ہے، اب ہنسی نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کی ایک اور جگہ شادی کر چکی تھی ہنسی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اپنے مستقل کسٹمرز میں سے

کسی سے اس کے لئے جاب کی بات کرے گی، تب تک وہ اس کے گھر رہ سکتی تھی جہاں پہلے ہی اس نے اپنا گھر ایک بیوہ ماں بیٹی کو کرایہ پر دے کر ایک کمرہ اپنے لئے مختص رکھا تھا، خود تو وہ گھر پر کم ہی ہوتی تھی ارد گرد سب کو پتہ تھا کہ وہ شہر کے اچھی ساکھ والے پارلر میں کام کرتی تھی۔

☆☆☆

میں سیکنڈ ہینٹ اعلیٰ بخش نے صرف پانچ سال رشتوں اور گھر کے سکھ کو محسوس کیا تھا، پھر سوتیلی ماں کے آتے ہی کائنات کے وہ سارے رنگ جو ماں کے مرنے کے بعد زرد پڑ گئے تھے، سیاہ روپ اختیار کر گئے، ماں بچے پیدا کر کے مجھے پالنے کو دیتی تھی اور سوتیلی ماں کے ابا کی وفات کے بعد اس کے بھائی کا ہمارے یہاں آنا تھا کہ میری زندگی اور قسمت پر بھی سیاہ رنگ پھیر دیا گیا، اماں کا وہ بھائی شہر میں درزی تھا اور آنٹی اور پارلر کی لڑکیوں کے کپڑے سیا کرتا تھا، آہستہ آہستہ اسے بھی پتہ چل گیا تھا کہ آنٹی پارلر کی آڑ میں کیا کام کرتی ہے، گھر میں بہن کو بہنوئی کی بگڑتی صحت جوان ہوتی بچیوں کے مسائل اور لڑکوں کی پرورش اور تعلیم کے لئے وسائل کی کمی کے لئے پریشان دیکھا تو اسی نے یہ انوکھا خیال اماں کے ذہن میں کیا ڈالا کہ وہ بھی فوراً تیار ہو گئی، تیرہ سال کی معصوم سیکنڈ جو ابا کو خون قھوکتے دیکھ کر گھٹ گھٹ کر روتی تھی، مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی، کو اماں نے ایسے مجبور کیا کہ وہ بھی شہر جا کر کمانے کو تیار ہو گئی، کاش کہ سیکنڈ اسی وقت خود کو کسی گاڑی کے نیچے روند دیتی تو باقی کی عمر اس کا جسم اور روح روندے جانے سے بچ جاتے، ابتدا کے تین سے چار ماہ واقعی پارلر کی ٹریننگ کے تھے کہ آنٹی اپنے اصولوں کی پکی عورت تھی ہر کام پکا کرتی تھی اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ڈالس کی بھی

پاکیزہ رفاقت سے بچہ چلا کہ گناہ پر گناہ کرنا جرم ہے مگر گناہوں پر شر مند ہونا اور معافی مانگنا ہی انسان ہونے کی دلیل ہے، قرآن کی تلاوت سے اللہ کے رحم ہونے سے واقفیت ملی تو باقی کی زندگی اپنے گناہوں کی معافی اور اس کے احکامات کے مطابق گزارنے کی ٹھان لی، شاید اس دور سے معافی ملی جاتی، پھلے آپ جو سمجھتے، دینا جو سمجھتی۔

پھر اچانک اماں جی نے آپ سے میرا نکاح کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے لگا میرے اللہ نے مجھ پر کرم کر دیا، مجھے معافی مل گئی تو ہی نواز دیا ہے، میں نے اماں جی کو آپ کو بہت کوشش کی اپنا ماضی بتانے کی، مگر آپ دونوں ہی تیار نہ تھے کچھ سننے کے لئے۔

اللہ رحیم ہے، کریم ہے، رحمان ہے وہ اس انسان کے گناہوں کی سیاهی کو اپنے رحم سے کرم سے اور رحمت سے صاف کر دیتا ہے جو دل سے معافی کی طلبگار ہو، اسے معافی مانگنے والا پسند ہے، اسے معاف کرنا پسند ہے، مگر انسان، انسان نہیں رحم کرتا دوسرے انسان پر، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس انسان کا آج کتنا شفاف ہے، وہ اس کے کل کے گناہوں کی سیاهی کو ہاتھ میں لے کر پھرتا ہے، موقع ملنے پر دوبارہ اس کے چہرے پر ملنے کے لئے، اس کے دامن کو داغ دار کرنے کے لئے، یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ اس سیاهی سے وہ اپنے ہاتھ میں سیاہ کر رہا ہے، اس کا دامن بھی صاف نہیں رہ گیا ہوتا، ایسا ہی اس گھر کے لوگوں نے میرے ساتھ کیا، مگر مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے، اللہ سے میرا محبت کا رشتہ ہونہ ہو معافی کا عمر بھر رہے گا، ایک وہی تو ہے جو مارتا نہیں، طعنے نہیں دیتا، بدلہ نہیں لیتا، دھکارتا نہیں، آپ سے بھی معافی کی طلب گار ہوں، جب بھی دل کی

ریکٹس کروائی جاتی کہ کام کے دوران ہلکا چمکا ٹھکر کرنا کسٹمر کو خوش کرنا ہے اس لئے تو عرصہ سے یہ بیچ کاروبار کامیابی سے چلا رہی تھی، چار ماہ بعد ایک دلہن تیار کرنے کے یہاں مجھے جس گھر میں بھیجا گیا وہیں مجھے کی رنگین محفل بھی سجائی گئی، مگر واپس آکر آنتی کے سامنے واویلا کیا تو اس نے بیٹھ کر آرام سے اسے سمجھایا کہ اس کے گھر والوں کو سب پتا ہے اور انہوں نے اسے اسی کام کے لئے بھیجا ہے۔

روپوں سے بھری تھیلی لے کر جس بل میں نے اماں کو صاف انکار کیا کہ میں واپس شہر نہیں جاؤں گی، اس نے پہلے تو چار چوٹ کی وہ مار لگائی کہ وہ اذیت میں عمر بھر بھی بھول نہیں پاؤں گی، اگلے دن میرے زخموں پر ٹکڑ کر کے اس نے ایک بار پھر ابا کی بیماری اور گھر کی بگڑتی معاشی حالت کی ایسی تصویر کشی کی کہ مجھے واپس شہر آنا پڑا تھا، پانچ سال برزخ میں گزرے وہ سال جن میں اماں بینیاں بیاہتی گئی، ابا مزید بیمار ہوتا گیا اور میری روح بار بار زخمی ہوتی رہی، ہر بار واپسی پر اماں سے میرا وہ سب چھوڑ دینے کا اصرار بڑھتا گیا کہ ضمیر نے گناہوں کا مزید بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا، جس روز میں نے اسے رشتوں کی کرہیہ شکل دیکھی، وہاں سے بھاگ نکلی، وہ سب اپنی غرض کے لئے عمر بھر مجھے اسی دوزخ میں جلتے رہنے دینا چاہتے تھے اماں جی کی گاڑی سے ٹکرا کر گری تو آگے کی کہانی آپ کے سامنے ہی ہے۔

آپ شروع سے ہی مشکوک رہے مگر میں بتاتی تو سب کو کیا بتانی، میری زیست کے ابتدائی بچوں کو چھوڑ کر باقی سب پر قسمت نے وہ سیاهی گرا کر انہیں سیاہ کر دیا تھا جو دنیا کے کسی ریوور سے نہیں مٹ سکتی تھی، اماں جی کی پر خلوص اور

عدالت لگانیں سزا سنانے سے پہلے میری رودا سن لیجئے گا، میں بدکردار نہیں ہوں، خائن اور چور بھی نہیں صرف گناہ گار ہوں وہ بھی اپنے اللہ کی، صرف ایک درخواست ہے مجھ سے اپنا نام الگ مت کیجئے گا، میں اپنے اندر پلنے والی آپ کی نشانی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں آپ کی زندگی میں آنے کے بعد آپ کی وفا دار رہی اور عمر بھر رہوں گی کہ پیسہ اور دولت لٹانے والے بہت سے مرد میری زندگی میں آئے تھے مگر عزت دینے والا صرف ایک آیا تھا، اللہ تعالیٰ سے آپ کی خوشیوں اور سلامتی کی دعا ہے، اماں جی کا اور اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

بد نصیب
سکینہ

خط پورا پڑھ لینے کے بعد اس نے ایک گلاس پانی پیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا، اسے کمرے میں بے حد مطمئن محسوس ہو رہی تھی، کھڑکی کے سلائیڈز ہٹا کر اس نے تازہ ہوا کو اندر آنے دیا تھا، یہ خط اسے آج کی ڈاک میں ملا تھا موٹا امپورٹنٹ ڈاک میں سب سے اوپر موجود اس لفافے کو پہلے اس نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر کھول کر جیسے جیسے پڑھتا گیا، سینے میں سانس لینا مشکل محسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

وہ بھی اس تحریر کو پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں، ان کے بالکل سامنے غنی سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”پھر اب کیا سوچا تم نے؟ اگرچہ یہ سب پڑھ کر میرا دل کٹ رہا ہے مگر اس بار تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گی، یہ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہو گا۔“ آہ بھر کر انہوں نے کہا تھا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی جی کہ قسمت نے مجھے کس دور اسے پر لاکھڑا کیا ہے، دنیا کا کوئی بھی مرد ایسا ظرف نہیں رکھتا کہ اس کی بیوی کسی کو سوچے بھی اور یہاں بات بہت آگے کی ہے، میں چاہنے کے باوجود اپنے دل میں اتنی وسعت پیدا نہیں کر پا رہا ہوں، جیسے وہ اس کا ماضی کیوں نہیں تھا، بھلا وہ مظلوم کیوں نہیں ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے، اسے زندگی اور گھر میں لے آنے کی تمنا نہیں میرے اندر اور اگر میں بچے لے بھی آیا تو یہ احساس بھی جان لیوا ہو گا میرے لئے کہ میں نے ایک ماں کے بچے پر ہاتھ ڈال کر اس کی آہ مول لی۔“ بالوں میں ہاتھ بھنسا کر وہ بے بسی سے بولا تھا۔

”باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے بچے کے اس میں صرف ایک زبان کو ہی تکلیف دینی پڑتی ہے، اگر جو عمل کرنا پڑ جائے تو اپنی ہی زبان سے پھر جانے والے لوگ ہیں ہم، لیکن اللہ کے برگزیدہ اور منتخب لوگ وہ تھے جنہوں نے اپنے عمل سے پہلے ثابت کیا اور پھر بات منہ سے نکال کر اس پر حقیقت کی مہر لگائی، میرے پیارے علی کا قول ہے کہ ”اگر لوگوں کو عزت دینا اور صاف کرنا تمہاری کمزوری ہے تو تم دنیا کے سب سے طاقت ور انسان ہو“ اور مجھے بہت خوشی ہو گی کہ اپنے غصے انا اور عناد کو پس پشت ڈال کر اپنے اندر وسعت لاؤ، اپنی سوچ میں دل میں اور عمل میں، یقین کرو یہ کرنا بہت مشکل ہے، مگر اس میں کون بھی ہے اور اجڑ بھی۔“

”اماں جی، میں بھی عام انسان ہوں، آپ مجھ سے فرشتوں جیسی توقعات مت رکھیں، وہ سب ذہن میں آتے ہی میرا خون کھول اٹھتا ہے نہیں ہو گا مجھ سے۔“ بے بسی سے کہہ کر وہاں

سے اٹھ گیا تھا، اماں جی گہری سانس لے کر دوبارہ صبح کی طرف متوجہ ہو گئیں، عاتکہ کو جاتے وقت بار بار ان کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتا یاد آ رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ تو اچھا ہو گیا یار۔“

ہنی پورے ہفتے کے بعد گھر لوٹی تھی اور اس کے لئے کسی دوسرے پار میں کام بھی ڈھونڈ کے لائی تھی مگر جیسے ہی پتہ چلا کہ اس نے اس سکول میں جاب کر لی ہے جہاں اس کے کرائے دار کی بیٹی جاب کرتی تھی، وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔

”سنو روزی، ایک بات کہوں برا نہ مانو تو۔“

”نہیں بولو، میں سن رہی ہوں۔“

”مجھے لگتا ہے تمہیں ایک بار پھر اس کے پاس جانا چاہیے، اس وقت وہ غصے میں تھا، ہو سکتا ہے اب تمہاری بات سن لے، جتنا تم نے مجھے بتایا، اچھا آدمی لگا مجھے وہ، دوسرے لوگوں سے ہٹ کر، اگر پھر بھی وہ تمہیں نہیں قبول کرنا تو اس کے اس بوجھ سے خود کو آزاد کرالو، ابھی تو یہ سب ہمارے ہاتھ میں ہے، اکیلی کماؤ، کھاؤ پیو اور نہ کرو، کوئی مل گیا تو شادی بھی کر لینا نہیں تو الکی زمین بہت بڑی ہے، مگر ایک بار یہ بچہ دنیا میں آیا تو تمہاری پیروں کی زنجیر بن رہے گا عمر بھر کے سروائیو کرو کہ اس ظالم نظام میں ایک بچے کے لئے۔“

انہیں نہیں، ہنی وہ مجھے اپنائے یا دھکالے، میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی، ابھی تو ایک گناہ کی معافی نہیں ملی مجھے، میں ایک اور گناہ کر کے اپنے اللہ کو ناراض نہیں کر سکتی، ابھی تو اس کو منانے لگی ہوں، مجھ پر اس کی نعمتیں تو بے پناہ ہیں کہ وہ مجھ سے راضی نہیں

ہے تو خفا بھی نہیں ہے، اس نے مجھے گناہ کے راستے سے پلٹایا، ایک گھر اور شوہر کا سکھ دیا، عزت دینا کیا ہوتا ہے یہ بتایا، اب وہ مجھے ایک مکمل عورت کا روپ دے رہا ہے تو میں کفرانِ نعمت نہیں کروں گی، وہ ہی تو اس ظالم دنیا میں میرا سہارا بنے گا اور میں اس کا سہارا بنوں گی، میں ایسا کچھ نہیں کروں گی ہنی، مجھے پتہ ہے تم میری بھرپوری میں یہ سب کہہ رہی ہو مگر تم کیا جانو کہ زندگی کے وہ خوب صورت پل جو میں نے اس گھر میں گزارے اور یہ بہترین رشتہ جو وہ مجھے اب نوازا ہے جارہا ہے، میرے لئے کیا ہے؟ اگر جان جاؤ تو کبھی ایسا نہ کہو۔“

”اس شخص کے پاس تو اب میں خود بھی نہیں جانا چاہتی، میں چھپ کر اس کے نام کی چادر میں عمر بھر گزارنا چاہتی ہوں، میں نہیں چاہتی میں اس سے ملوں اور وہ مجھے چھوڑ دے تو میرے پاس پھر جینے کا جواز کیا رہ جائے گا۔“ وہ جیسے کسی خواب کی کیفیت میں بول رہی تھی ہنی بس حریت سے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر پھیلی روشنی اسے سمجھ نہیں آ سکی کہ اس کے اندر سے پھوٹنے والے منہ کے رشتے کی بھی یا گناہ کے بعد گناہ کا احساس اور اللہ کا خوف تھا اور معافی کی طلب تھی، کیا تھا اسے سمجھ نہ آ سکی۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی، مگر پھر بھی کہوں گی کہ تمہیں اس سے رابطہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔ ہنی نے کہا تو وہ بس اس کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دل اور ضمیر کی جنگ میں دن اسی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے، پہلی دو بیویاں ساتھ چھوڑ دینے کے بعد کبھی اتنا یاد نہیں آتی تھیں جتنا وہ آتی تھی ایک دل اس کے حق میں دلیل دیتا نہ

رونے سے تکلیف ہو رہی ہے، میں مانتا ہوں کہ اس ہولناک آشٹاف کے بعد کئی بار میرا جسمیں مار دینے کو جی چاہا، خود کو مار دینے کو جی چاہا، مگر بزدل تھا ناں، ان میں سے کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکا، مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آ سکی کہ محبت اور نفرت ایک ہی انسان کے دل میں اکٹھے کیسے ہونپ سکتے ہیں۔“ وہ سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

”تمہارا ماضی اور اس کا حوالہ اتنا جان لیوا ہے کہ اس کو یاد کرنے کے بعد میں زندگی بھر تمہاری شکل بھی دیکھنے کو دل نہیں کرتا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگلے ہی بل میرے دل میں موجود تمہاری محبت کا مضبوط نقش اپنی ہوا سے اس نفرت کو اڑا دینے کی کوشش کرتا ہے اور اسی میں زندگی تمام ہو رہی ہے، جب رشتے میں ضد اور اتنا جائے تو یہ دونوں توجیت جاتے ہیں مگر رشتہ ہا جاتا ہے، میری اتنا بھی مجھے تم تک لانے کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھی، لیکن آج تمہیں اس حال میں سڑک کے کنارے بے حال دیکر بھی مجھ سے رہا نہیں گیا، میری غیرت نے آرا ہی نہیں کیا کہ میں تمہیں یہاں اس حال میں دیکھتا۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بول رہا تھا۔

”نہیں بیٹھے بیٹھے مجھے احساس ہوا کہ جب کوئی انسان گناہ سے بچتا دے اور پھر فی پر آئے تو وہ توداد کا مستحق ہوتا ہے حوصلے بھی مگر ہم کیا کرتے ہیں اس کو اس کے پچھلے ہوں کا حوالہ دے کر اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ان لیتے ہیں۔“

”میں تمہیں آج اپنے اسی گھر لے کر جا رہا ہوں، جہاں رہنے کا ہم دونوں نے خواب دیکھا تھا، اماں جی کو کبھی وہیں۔ میں گئے، چاچی شاہدہ ان کی بیٹیاں اور داماد نے گھر میں

تھکتا تھا مگر غنی کے ضمیر کی عدالت میں دل ایک طرف اکیلا تھا تو سامنے خالقین بھی بہت تھے، اس کا انداز ماضی بھلانے کی کوشش کرتا، تو دنیا والوں کا خوف سینہ تان کر سامنے کھڑا نظر آتا اس سے نظر چرا کر پہلے لگتا تو گھر والوں کے طعنے اور نشتر کون کون سے محاذ سے لڑتا، شائندہ اور شاہدہ بیگم ایک بار پھر اس کی طرف امید کا دامن پھیلائے کھڑی تھیں، اس بار ان کا ہتھیار محبت اور خوشامد تھی، محبت جو بڑے سے بڑے سورما کو زیر کر ڈالتی ہے، اس پر بھی اثر ہو جاتا اگر جو اس سے دوبارہ ٹاکرا نہ ہوا ہوتا، وہ اب سنجیدگی سے شائندہ کو زندگی میں لانے کا سوچ رہا تھا جب ایک دن آفس سے واپسی پر وہ اسے سڑک کے کنارے نظر آئی تھی، اسے دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ اسے پورے چھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا، چادر سے خود کو پوری طرح ڈھانپے وہ نقاب میں تھی اور شاپ پر شاید بس کا انتظار کر رہی تھی، اس کے بھرے بھرے سراپے پر نظر ڈالتے اسے اسی وقت احساس ہوا کہ شائندہ سے فوری شادی پر اسے جو جو چاہات روک رہی تھیں ان میں ایک وجہ وہ بھی تھی، نہ چاہتے ہوئے اس کا پیر بریک پر جا پڑا تھا، وہ ایک دم پیچھے کو ہٹی تھی، مگر اس پر نظر پڑتے ہی کچھ بل کو ساکت رہ گئی تھی۔

”بیٹھو!“ غنی اتر کر نیچے آیا اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر کہا، عائشہ کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا، اس کے بیٹھنے کے بعد وہ گاڑی میں آ بیٹھا، اس کے رونے کی آواز سن کر غنی کو اپنی آنکھوں میں بھی نمی کا احساس ہوا تھا۔

”کیسی ہو؟“ بہت دیر بعد جیسے ہی یہ سوال پوچھا گیا، وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

”رو مت عائشہ مجھے آج بھی تمہارے

”بے شک توبہ کرنے والوں اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لئے اللہ کے ہاں بڑا انعام ہے۔“

☆☆☆

اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اور دو کی آخری کتاب
- ☆ غبارِ گندم
- ☆ دنیا گول ہے
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆ ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں
- ☆ چلتے ہو تو چھین کو چلیے
- ☆ عمری عمری پھر اسافر
- ☆ خطا انشاء کی کے
- ☆ اس بستی کے اک کو کہے میں
- ☆ چاند نگر
- ☆ دلِ وحشی
- ☆ آپ سے کیا پروا

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

- ☆ قوا کا درد
- ☆ انتخابِ کلامِ ہیر

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ طیفِ نثر
- ☆ طیفِ غزل
- ☆ طیفِ اقبال

لاہور اکیڈمی

چوک اور دہ ماڈل لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

رہیں گے، بس ایک درخواست ہے تم سے۔“ وہ کہتے کہتے رکا تو ساکت بیٹھی عائشہ کا دل بھی سکڑ کر پھیلا تھا، اس نے مختصر آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں بھی اپنی عورت کے حوالے سے اتنا ہی طرف رکھتا ہوں جتنا ہمارے معاشرے کا ایک عام مرد، تمہارے ماضی کا حوالہ ایک ایسا کاٹنا ہے جو جب زیادہ نہیں دے گا تو ہو سکتا ہے میں تمہیں کچھ برا بھلا کہہ جاؤں ہو سکتا ہے کبھی بالکل چپ بھی ہو جاؤں کہ اب اس دل میں تمہاری محبت کے ساتھ ایک دردِ مستقبل نے بھی دل میں بسیرا کر لیا ہے، یہ ایک انسانی فطرت ہے اور میں اس سے منہ نہیں موڑ سکتا، مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر سے اس چادر اور چادرِ یواری کا حق کبھی بھی نہیں چھینوں گا جو تم نے اپنی دعاؤں اور توبہ کے بعد میرے حوالے سے حاصل کی ہے اور ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ہاتھ یہ درد کم ہوتا جائے اور سب ٹھیک ہوئے۔“ وہ جیسے اس سے زیادہ خود کو دلا رہا ہے تھا۔

”اور یہ آگیا تمہارا گھر۔“ ایک جگہ اس نے گلِ روک کر خوش گوار لہجہ میں کہا۔

عائشہ نے سٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

آپ کا مجھے اپنی زندگی میں لانا اور پھر اس پر قائم رہنا ایسے فیصلے ہیں جنہوں نے مجھے خراب کیا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ عمر بھر آپ کی وفادار ہوں گی اور آپ کے نام کی چادر کی حفاظت جان سے بھی بڑھ کر کروں گی۔“ غنی نے ان کو بغور سن کر اپنے اندر اتارا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اپنی مہر ای کا احساس بخش کر خود کو اور اسے کر دیا۔

ستمبر 2018

نویسے کے اسرار و اسرار

نایاب جیلانی

چھٹیویں قسط کا خلاصہ

جیسے پولوئج کے دن قریب آرہے تھے ویسے ہی نیل بر کا خوف بڑھتا جا رہا تھا، اس نے گلانی سے جب ذکر کیا تو وہ بھی پریشان ہوگی، لیکن پھر وہ خود کو سنبھال کر نیل بر کی ہمت بندھاتی ہے۔

حمت کو بی جاناں واپس بلا لیتی ہیں تو فارم ہاؤس میں مکین باقی سب لڑکیاں اداس ہو جاتی ہیں۔ سبا خانہ شاہوار کی بیوی کا ذکر کرتی ہے تو نسرہ پریشان ہو جاتی ہے، وہ شاہوار کا پوچھتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس نے عشیہ سے شادی کر لی ہے اور وہ بئوگل میں ہے پھر وہ سبا خانہ کے اصرار پر بتاتی ہے کہ عشیہ اس کی نند ہے۔

ادھر ہیام کو پتا چلتا ہے کہ عشیہ صندیر خان کے پاس کیسے پہنچی، اسی غصے میں صندیر خان کی گاڑی پر فائرنگ کر داتا ہے جس سے صندیر اور اس کا ڈرائیور شدید زخمی ہو جاتے ہیں اس فائرنگ کا شک جہاندار پر کیا جاتا ہے۔

ہوسپتال میں صندیر خان اور ڈاکٹر ہیام کی بحث ہوتی ہے جہاں ہیام اسے کہتا ہے کہ تم نے کس کی بیوی کو اغواء کر کے اپنے گھر رکھا ہے جہاندار اور اس کی بات پر جہاندار رہ جاتا ہے۔

سینٹیویں قسط

آب آپ آگے پڑھیں





پولو کا بیچ غیر معینہ مدت تک کے لئے منسوخ کر دیا گیا تھا، جس نے سنا حیران رہ گیا۔ جبکہ جہاندار کے لئے یہ خبر بہت شاکنگ تھی، پولو کا بیچ رک جانا اس کے جذبات پہ ایک تازیانہ تھا مگر بارسوخ ڈرائیج سے خبر مل رہی تھی کہ صندیر خان اس مقابلے میں آنا ہی نہیں چاہ رہا، یعنی وہ رنگ میں آنے سے پہلے ہی اپنی شکست کا اعلان کر رہا تھا۔

یہ پٹھانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا تھا اور پولو کی تاریخ میں تو ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا جہاندار کو چاروں طرف سے مبارک بادوں کے ساتھ ساتھ صندیر خان پہ قاتلانہ حملے کی خبریں بھی مل رہی تھیں۔

”یہ سب کس نے کروایا؟ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟“ جہاندار کو بھی تجسس تھا، بلکہ وہ یہ جانتا چاہ رہا تھا کہ صندیر خان پہ ہونے والا قاتلانہ حملہ کوئی ڈرامہ تو نہیں تھا، بیچ کو روکنا یا جہاندار پہ حملے کا الزام ڈالنا؟ صورت حال بہت حیران کن تھی۔

اشعر بتا رہا تھا، صندیر خان پہ آبادی کے ایک سینئر ڈاکٹر نے اپنی بیوی کے اغواء کرنے کے الزام میں قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

”صندیر خان شدید زخمی تھا۔“ اشعر کے پاس خاصی معلومات تھیں، پھر اخبار نے بھی یہ خبر مریج مسالوں کے ساتھ لگا دی تھی۔

”مگر الزام کچھ عجیب نہیں لگ رہا؟ جو بھی ہے، صندیر خان کسی کی بیوی بیٹی پہ نظر ڈالنے والا نہیں، غیرت مند پٹھان ہے، جتنا بھی برا کسی، مجھے یہ الزام جھوٹا اور بودا لگ رہا ہے، شاید کسی کی سازش ہو۔“ جہاندار نے سرے سے اس الزام کو رد ہی کر دیا تھا، اشعر منہ کھول کر اسے دیکھنے لگا۔

”وہ تمہارا دشمن ہے۔“

”دشمن ہے نا، اسی لئے بہت اندر تک سے جانتا ہوں، یہ الزام بے بنیاد ہے، مگر دیکھ لینا اس کے سیاسی کیریئر کو دھچکا ضرور لگ جائے گا، پٹھان اس جھوٹے الزام کو بھی معاف نہیں کریں گے۔“ جہاندار نے پرسوج انداز میں کہا تھا۔

”تو یوں سمجھو پھر کہ شیر اپنے جال میں پھنس گیا۔“ اشعر نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”جال بھی ایسا کہ ہزاروں دلیلوں اور کوششوں سے بھی نکل نہیں سکے گا۔“ اشعر نے ہاتھ جھاڑے تھے۔

”بے چارہ برا ہی پھنس گیا، اوپر سے علاقے کا سردار اور اتار الزام۔“

”سردار بوڑھے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔“ جہاندار نے تاسف سے سر جھٹکا۔

”اس کے دل پہ تو بلند وز چلیں گے، اس کی شان و شوکت اور عزت پہ لگا ہے داغ، اوپر سے ایکشن کے دنوں میں ان کی خاندانی سیٹ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائے گی۔“ اشعر نے تجزیہ کیا تھا۔

”ان کا مکافات عمل شروع ہو چکا ہے۔“

”تو کیا ہمیں ہتھیار پھینک دینے چاہیے۔“ جہاندار کا انداز چبوتا ہوا تھا۔

”میں نے یہ بھی نہیں کہا۔“ اشعر نے فوراً وضاحت کی تھی۔

”مگر کچھ چیزیں اللہ پر بھی چھوڑ دینی چاہیے، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ اچھے فیصلے کرتا ہے، اپنی دے چلتا ہوں، بچے ابھی تک جاگ رہے ہوں گے۔“ وہ ایک سوچ کا رخ اسے دے کر اٹھ گیا تھا، اس کے جاتے ہی نیل بر سرعت سے دبے قدموں اندر آگئی تھی، گوکہ اس نے اخبار کے حوالے سے ہی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”یہ خبر کیا سچ ہے؟ صندیر لالا اب ٹھیک ہیں کیا؟“

”میں احوال بری کرنے نہیں گیا تھا، اگر آپ حکم کریں تو یہ نیک کام ضرور کر دوں۔“ جہاندار نے اخبار سے نظر ہٹا کر جواب دیا تھا۔

”صندیر لالا کا یہ کون سا نیا دشمن نکل آیا ہے؟“ نیل بر ہر اس اناں میں پوچھ رہی تھی۔

”نیا نہیں، خاصا برانا ہے۔“

”مگر ہے کون؟“ نیل بر نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔

”اس کا مکافات عمل ہے اور کون؟“ جہاندار کا لہجہ ناچاچے ہوئے بھی کھردرا ہو گیا۔

”مجھے تو کوئی سازش لگتی ہے، میرے لالا ایسے نہیں ہیں۔“ نیل بر کے جذباتی انداز میں

”میرے لالا“ کہنے پر جہاندار نے بہت غور سے نیل بر کو دیکھا تھا، وہ حقیقت میں پریشان دکھائی دے رہی تھی، جہاندار کو حیرت نہیں ہوئی، وہ جانتا تھا، خون کے رشتے کہیں نہ کہیں اپنوں کا درد ضرور رکھتے ہیں، چاہے وہ اپنے ان کے ساتھ کتنا ہی برا کیوں نہ کر چکے ہوں، جہاندار نے اپنا تہمرہ محفوظ رکھا تھا اور اسے اٹھنے کے لئے کہا۔

”چوری جیسے ساری باتیں سن کر پھر معصوم بننا تو کوئی نیل بر سے سیکھے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا تھا، نیل بر پکڑے جانے پر جڑبڑ ہوئی تھی۔

”میں نے کب سنی کوئی بات۔“

”پردے کے پیچھے تو میں چھپا ہوا تھا۔“ جہاندار نے ایک آنکھ سے اشارہ کیا تو نیل بر جھینپ گئی۔

”وہ تو میں بے ارادہ ہی رک گئی تھی۔“

”کبھی کبھی بے ارادہ کوئی اور کام بھی کر لیا کرو۔“ جہاندار نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

”مثلاً کیا؟“ نیل بر نے اک بھول اچکا۔

”بہی محبت و حبت وغیرہ۔“ اس کا انداز گلفٹہ تھا۔

”وہ مجھے نہیں آتی۔“ نیل بر نے ناک چڑھائی۔

”تو مجھ سے سیکھ لو، میں سیکھا دیتا ہوں۔“ جہاندار فوراً کورٹش بجالایا تھا۔

”ضرورت نہیں ہے۔“

”ہاں، اب کیوں ضرورت ہوگی۔“ جہاندار نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”تو کیا پولو کا میچ واقعی نہیں ہوگا۔“ نیل بر نے اپنے بیڈروم میں آتے ہوئے معصومیت کے

ریکارڈ توڑتے ہوئے پوچھا تھا، جہاندار نے کبر اسانس ہوا کے سپرد کیا۔

”تمہارے صندیر لالا نے ”سیز فائر“ کر دیا، اس نے گتت سلیم کر لی۔“

”مگر کیوں؟“

”شاید اسے یقین ہو وہ ہار جائے گا۔“

”اور شاید وہ خون خرابہ نہ چاہے ہوں۔“ نیل بر نے بہت سمجھداری سے کتہ اٹھایا تھا۔

”اس کے نہ چاہنے سے خون خرابہ کیا نہیں ہوگا۔“ جہاندار کا انداز چبھتا ہوا تھا، نیل بر لمحہ بھر

کے لئے ہراساں ہوئی تھی۔

”تو کیا؟“

”وہ لوگ اتنی آسانی سے چھوٹ جائیں گے تو یہ تمہاری بھول ہے نیل بر۔“ جہاندار کا لہجہ

بدل گیا تھا۔

”تم اپنی نسلوں کے لئے خون خرابہ مروت میں چھوڑ کے جاؤ گے، ایک بات تو طے ہے۔“

نیل بر نے پھر کر اپنی بات مکمل کی تھی، جہاندار اس کا چہرہ دیکھتا رہا، جہاں پل پل رنگ بدل رہے

تھے۔

”ہاں تو یہ بات تو طے ہے کہ میں فرخزاد اور شیر شاہ کا خون معاف کرنے والا نہیں۔“ جہاندار

نے بڑے محل سے جواب دیا تھا، نیل بر اسے خون رنگ آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی، پھر اس نے

بس اتنا ہی کہا۔

”کچھ چیزیں اللہ کے لئے چھوڑ دینی چاہیے، کیا جچ، اس سے تمہیں ذہنی سکون مل جائے اور

اللہ کا بہترین انصاف بھی۔“ وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں تھی، جہاندار بہت دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا

اور پھر اس کے پیچھے چلا آیا۔

”تمہارا الزانی کا موڈ ہے۔“

”ہرگز نہیں، مگر تمہارا لگ رہا ہے۔“ نیل بر نے بیڈ شیٹ ٹھیک کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”میرا الزانی کا نہیں بلکہ میرا تو کچھ اور ہی موڈ ہے۔“ اس کا اشارہ بڑا دلبرانہ تھا، نیل بر نے

اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”اپنا کام کرو۔“

”اپنا ہی کام کرتا ہے۔“ وہ معنی خیزی سے بولا اور اس کے اور اپنے بیچ فاصلے کو سمیٹتا اس کے

قریب آ گیا تھا، نیل بر نے خشکیں نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”میں نے تم سے زیادہ مطلب جست کوئی نہیں دیکھا۔“

”میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔“ جہاندار نے لا جواب ہونا کہاں سیکھا تھا۔

”وہ لینے بنو خاندان کی عورتوں میں غرور بہت ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ اس نے نخوت سے ناک چڑھائی تھی۔

”اور ہمیں ان کا غرور توڑنا آتا ہے۔“ اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر نیل بر کو تپ

چڑھائی تھی، نیل بر کو توقع کے عین مطابق غصہ آ گیا تھا۔

”چہ نہیں خود کو کیا سمجھتے ہو۔“

”خود کو جہاندار اور تمہیں جہاندار کی جان سمجھتا ہوں، اب زیادہ غصے سے ہری نیلی مت ہو،“

ٹریفک کے اشاروں کا گمان ہونے لگتا ہے۔“ جہاندار نے اعے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر چڑایا تھا۔

”کیا ہے جہاندار تنگ نہیں کرو۔“ وہ نیم خفا سی سوری تھی۔

”تمہیں نہیں تو کیا تمہاری سیکلی کو تنگ کروں؟“ جہاندار نے اس کی نیم خفا آنکھوں میں جھانکنا تھا۔

”گھلائی تمہارے حواسوں پہ بہت سوار ہے۔“

”حواسوں پہ سوار ہے، دل پر تو نہیں۔“ وہ ہنس پڑا تھا اور نیل براس کی خوبصورت ہنسی کو

گھیرتا کہ محسوس کرتی کہیں کھوی گئی تھی، وہ ہنستا ہوا پہلے والے جہاندار سے بہت مختلف بہت الگ

لگ رہا تھا، نیل برنے بے ساختہ دعا کی تھی کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی ہنستا رہے۔

☆☆☆

تاحد نظر پھیلا فارم ہاؤس آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

ہیام نے دور تک پھیلے فارم ہاؤس میں بڑا خاندان کی شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

”نجانے کس کس کی ملکیت پہ ناجائز قابض ہو کر یہ محلات تعمیر کر رکھے ہیں۔“ ہیام پتھریلی

روشن پہ چلتا ہوا ایک خوبصورت اور شانہ نہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا، صندیر خان خاصا وضع دار

دکھائی دے رہا تھا، ہیام کو بیضا کر بولا۔

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں آئے گا، بہتر ہے میں نشرہ کو بلا لوں۔“ ہیام نشرہ کا نام سن کر بے

قرار ہو گیا تھا۔

”وہ تمہارے پاس ہے؟ وہ تمہارے پاس کیسے آئی؟“ وہ بے ربط سا ہو کر بول رہا تھا، اسے

اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا، کیا وہ اتنے دنوں بعد نشرہ کو دیکھ سکے گا؟

”یہ سوال تم اپنی بیوی سے پوچھ لینا، وہ تمہیں مجھ سے بہتر جواب دے کر مطمئن کر دے گی۔“

صندیر خان سنجیدگی سے بولا تھا اور پھر کچھ دیر بعد اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

”سلام لالا۔“ حمت اسے دیکھتے ہوئے بھاگی بھاگی چلی آئی تھی۔

”وسلام، حمت نشرہ کہاں ہے؟ اسے مہمان خانے میں بھیج دو۔“ صندیر خان نے مصروف سے

انداز میں کہا تھا، بالکونی میں کھڑی نشرہ اپنے نام کی پکار سن کر بھاگی چلی آئی تھی۔

”خیر تو ہے لالا، آپ اب ٹھیک ہیں، مگر مجھے تو نہیں لگ رہے؟ آپ ہسپتال سے کیسے چلے

آئے۔“ وہ مارے گھبراہٹ کے بے ربط ہو چکی تھی۔

”میں اب ٹھیک ہوں اور سنو، اب تم بوجھل نہیں جانا، شاہوار کی بیوی آپکی ہے۔“ اس نے

اگلی ہدایات بھی جاری کی تھیں، پھر اس کو دیکھ کر بولا۔

”نشرہ تم ڈرائنگ روم میں چلو۔“

”میں لالا، مگر کیوں؟“ وہ ہکا بھکا گئی تھی۔

”کیوں کا جواب اندر جا کے مل جائے گا۔“

وہ نشرہ کو اشارہ کرتا آگے بڑھ گیا تھا، اب یقیناً کونے کی کلاس لگتا تھی، حیران پریشان نشرہ

ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی، صندیر خان کو مے کی طرف آ گیا تھا، جو بہت بیزاری کے ساتھ اخبار بینی کر رہی تھی، صندیر خان کو دیکھ کر اچھل پڑی۔
”تم بچ کر آ گئے۔“

”ہاں تمہاری دعا سے۔“ اس نے خوشگوار انداز میں جواب دیا تھا، کو مے نے جیکسی نظروں سے اسے گھورا۔

”میں نے دعا کب کی؟“

”شاید دل میں کسی ہو، ورنہ بچنے کے امکان نہیں تھے۔“

”تم جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔“ اس نے ناک بھونچا کر کہا۔

”میرے مرنے سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا، الٹا سوچو، تو نقصان ہی ہوگا۔“ صندیر خان نے گہرا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”نقصان کیسا؟“

”واپس کیسے جاؤ گی۔“ صندیر خان کا سوال بھی خاصا ٹیکھا تھا۔

”تم نہ ہوئے تو چلی جاؤں گی، یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے تم نے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”تم حادثے میں لاپتہ ہو چکی یا مر چکی ہو، میں نے تمہیں قید نہیں کیا، بلکہ احسان کیا ہے ورنہ وہیں کسی کھائی میں نہ ہریلے جانوروں کے کاٹنے سے اب تک گل سڑ چکی ہوتی۔“ صندیر خان نے اس کی آنکھیں کھولی تھیں، کو مے کی تیوری چڑھ گئی۔

”اب اور کتنا احسان جتلاؤ گے؟“

”جب تک تم غم نہ دکھاتی رہی۔“ صندیر خان اطمینان سے بولا تھا۔

”مجھے واپس جانا ہے اپنے گھر۔“ کو مے ایک دم تھملا کر بولی تھی۔

”چلی جاؤ، روکا کس نے ہے، وہ سب تمہیں رو دھوکے بھول چکے ہیں، اب تمہاری روح کو بھوت ہی سمجھیں گے۔“ اس کا اطمینان اب بھی قابل دید تھا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوگا۔“

”سبحان اللہ۔“ صندیر خان نے کشیل نظر کو مے کے بیزار چہرے پر ڈالی تھی۔

”میں نے کہا تھا، ٹرپ کے ساتھ آؤ، ایک یونٹ میں لاپتہ ہو جاؤ، میں نے تمہاری مدد کی سرکاری ہسپتالوں کے علاج سے بچایا، بہترین خوراک، رہائش اور علاج مہیا کیا اب بھی میرا ہی قصور ہے، میں ہی برا ہوں۔“

”برے تو تم ہو۔“ کو مے نے ناک چڑھائی۔

”یہ سب کر کے میری نظر میں اچھے نہیں بن جاؤ گے۔“

”تمہاری نظر میں مجھے اچھے بننے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے۔“ صندیر خان نے استہزاء سے کہا۔

”تو کیا اب ساری زندگی میں یہیں رہوں گی؟“ وہ غصے سے چلائی تھی۔

”نہ تو تمہاری یہی ہے، تمہارے ناشکرے پن کی وجہ سے، اس عالیشان بنگلے کو قید کہہ رہی ہو، تم نے اصل قید دیکھی ہی نہیں، خیر میں اتنا ظالم نہیں اور نہ ہی تم کسی دیس کی شہزادی ہو، جسے قید

کر کے میں نے دیوالائی کہانیوں میں اپنا نام بطور ہیرو لکھوانا ہے، میں تو خود چاہتا ہوں جلدی ٹھیک ہو کر دفعتاً ہو جاؤ یہاں سے۔“ صندیر خان نے جس انداز میں بات کی تھی اسے سن کر کوئے کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔
 ”اتنی انسٹ؟“ وہ لال انگارہ ہو گئی۔

”یہ انسٹ نہیں، حقیقت ہے، تم بہت ہی ناشکری لڑکی ہو۔“ اس نے تاسف سے کہا۔
 ”ویسے تمہارا بھائی بالکل صحت یاب ہو چکا ہے، اب وہ اپنی ڈیوٹی پر ہے، مگر اس نے تمہیں تلاش نہیں کیا، اس کا مطلب ہے، تمہارا باب یہ لوگ بند کر چکے ہیں، بہتر ہے سکون سے بیٹیں رہو میں دل پر پتھر رکھ کے تم جیسی بدتمیزی لڑکی سے شادی کر لوں گا، عیش کی زندگی جینا، صندیر خان پر حکومت کر کے۔“ اس نے کوئے کے فوج کا نقشہ اس انداز میں کھینچا کہ اسے جبر جبری آگئی تھی۔
 ”فضول نہیں بکو، تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے خودکشی کر لوں، گھر والے تو ویسے بھی مجھے مرا ہوا سمجھ چکے ہیں۔“

”تو کرلو، پھر دیکھی ہے، بس مجھے بتا دینا کس چیز سے مرنا پسند کر دو گی؟ میں پرووائیڈ کر دوں گا۔“ صندیر خان نے مسکرا کر ہمدردی سے کہا، کوئے جو بیچ و تاب کھاتی گھاس والے سے باہر دیکھ رہی تھی ایک دم چونک گئی۔

”یہ نشر کہاں جا رہی ہے؟ اور کس کے ساتھ؟“
 ”وہ اپنے گھر جا رہی ہے، اب اسے دیکھ کر حسد کا شکار مت ہو، اسے ڈھونڈنے والے نے جلد ہی دریافت کر لیا، تمہیں کوئی ڈھونڈنے آیا تھا، ورنہ اب تک تم بھی جا چکی ہوتی۔“
 ”ایک اور چیز بھی ہے تم جہاں ہو، یہی تمہارا اصل ٹھکانہ ہے، اس لئے تمہیں کوئی ڈھونڈنے آیا ہی نہیں، اس لئے دل چھوٹا نہیں کرو۔“ صندیر خان نے پکارتے ہوئے کہا تھا۔
 ”مگر وہ کس کے ساتھ جا رہی۔“ کوئے اچھل ہی تو پڑی تھی۔

”اپنے شوہر نامدار کے ساتھ اور کیسے خوش نصیب لوگ ہیں واللہ۔“
 ”اس کے ہر بیٹے کو اس کا پتہ چل گیا کہ وہ یہاں تھی؟“ کوئے تو سر پر انڈیہ پہن چکی تھی۔
 ”پتہ کیسے چلنا تھا؟ یہ تو میں نے بتایا۔“ صندیر خان نے اس کی غلط فہمی دور کی تھی۔
 ”میرے گھر والوں کو بھی بتا دو۔“ کوئے نے ناک چڑھا کر طنز یہ کہا تھا۔
 ”ان کو بھی بتا دوں گا، ذرا دم تو لو۔“ اس کا انداز معنی خیز قسم کا تھا۔
 ”اپنی وے، ذرا نیور کے ساتھ اپنے چیک اپ کے لئے چلی جانا، میری اپنی طبیعت ناساز ہے، تمہاری بد دعاؤں سے۔“ صندیر خان نے جاتے جاتے طنز یہ لہجہ اختیار کیا تو کوئے کا منہ بن گیا تھا۔

”مجھے ضرورت نہیں بد دعائیں دینے کی۔“ وہ جربز ہوئی تھی۔

”تو اب نشرہ واپس نہیں آئے گی۔“

”واپس کیوں آئے گی؟“ صندیر خان نے اک بھول اچکا کر پوچھا۔

”اچھا بھلا اس کے ساتھ دل لگ گیا تھا۔“

”دل مسافروں یا مہمانوں کے ساتھ نہیں لگاتے، دل لگانا ہو تو میزبان کے ساتھ لگاتے ہیں۔“ صندیر خان کا انداز معنی خیز تھا۔

”میزبان بھی تو ڈھنگ کا ہو۔“
 ”کیا کہنے شہزادی حضور کی چواں کے، اگر میزبان ڈھنگ کا نہیں تو آسمانوں سے تمہارے لئے شہزادہ ہرگز نہیں اترے گا۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔
 ”مجھے ضرورت بھی نہیں۔“

”اچھی بات ہے، ضرورت اور خواہش کو محدود ہی رکھو۔“ وہ اسے پکارتا ہوا باہر نکل گیا تھا، کوریڈور میں حمت کھڑی تھی، اسے دیکھتے ہی الرٹ ہو گئی۔
 ”لالا وہ آپ کا انتظار کرتے رہے، پھر چلے گئے۔“
 ”میں ان سے مل لوں گا۔“ صندیر خان نے جواب دیا۔

”اس اندروالی نے دماغ ہی لگا دیا تھا۔“ وہ سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا تھا، پیچھے سے سباخانہ اور حمت حیران پریشان کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”نشرہ واقعی چلی گئی؟“ سباخانہ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”میرا خیال ہے، اب تم یقین کر ہی لو۔“ حمت کا انداز سادہ تھا۔

☆☆☆

”او، تو یہ تم تھے۔“ گھلائی نے دھوپ کی تمازت سے سرخ ہوتے چہرے کو چادر کے پلو سے ڈھانپتے ہوئے کڑی نظروں سے جنگل کا سروے کرتے اشعر کو جالیا تھا۔
 وہ اس افتادہ پامچل ہی پڑا تھا، پھر اپنے سامنے پہاڑی ٹین نقوش والی خوبصورت دوشیزہ کو دیکھ کر حوصلے میں ہوا۔

”اور..... یہ..... یہ آپ ہیں۔“ اشعر کا انداز بھی ڈرامائی قسم کا تھا۔
 ”تم وہی ہو نا، جس نے میرا کھیت اجاڑا تھا، تمہاری جیب نے میری ساری سبزیوں کو کچل دیا۔“ گھلائی کی آواز صدے کی شدت سے رنڈھ گئی تھی۔
 ”میں وہ نہیں ہوں، آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اشعر نے مکر جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔
 ”میری نظر کمزور نہیں اور نہ میرا دماغ خراب ہے میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔“ گھلائی اس کے مکر نے پرخ پا ہو گئی تھی۔

”نکالو میری سبزیوں کو۔“
 ”کچل ہوئی سبزیوں تو واپس نہیں لائی جاسکتیں۔“ اشعر نے مسکین صورت بنا کر کہا تھا۔
 ”مگر کفارہ ادا کر سکتا ہوں، میں آپ کو پیسے۔“
 ”مجھے پیسے نہیں اپنا ہرا بھرا کھیت واپس چاہیے۔“ گھلائی کی ڈیماٹھ نے فارسیٹ آفسر کے طوطے اڑا دیے تھے۔

”کھیت کیسے واپس لاؤں، میرے پاس تو جنات بھی نہیں۔“ وہ لا چاری سے بولا تھا۔
 ”میرا نقصان تو بھرتا ہو گا، میری ساری محنت جاہ کر دی۔“

”میں ادا نیکی کر دیتا ہوں۔“ اشعر نے عاجزی سے درخواست کی تھی۔
 ”مجھے پیسے نہیں چاہیے۔“ وہ غصے میں پھنک رہی تھی۔
 ”تو پھر کیا کروں؟“ اشعر بے حد لاچار نظر آیا، کچھ دیر سوچتا رہا۔
 ”کیا کھیت اگانے میں مدد کروں؟“

”اب کیا تا عقل مندانہ سوال۔“ گلابی نے سر ہلادیا، گویا اس کا آئیڈیا اسے پسند آیا تھا۔
 ”تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے سارے زمانے کی شبیہ منہ پہ طاری کرتے ہوئے پوچھا تھا۔
 ”شہر سے اعلیٰ قسم کے بیج لانے ہوں گے اور پھر میرے کھیت میں بوائی کا کام کرنا ہوگا، ہفتے میں تین دن کھیت کو پانی لگانا تمہاری ذمہ داری ہوگی، ضرورت کے مطابق کھاد بھی تم ہی ڈالو گے بولو منظور ہے۔“ گلابی نے سوالیہ مگر خفا نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔
 ”جی منظور ہے۔“ اس نے مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق حامی بھری تھی، گلابی کی جب بھر پور تفسی ہو چکی تو وہ مطمئن ہو کر واپس لوٹ آئی تھی جبکہ اشعر اسے پرسوج نظروں سے دیکھتا رہا۔
 ”اجاڑا ہے تو آباد بھی کروں گا۔“ بالآخر وہ اس نکتے پر پہنچ ہی گیا تھا۔

☆☆☆

یعنی کو ولید کے انداز بدلے بدلے لگ رہے تھے۔
 وہ اسے پیکنگ کا بول کر خود واش روم چلا گیا تھا، تب سے یعنی ست ہاتھوں کے ساتھ اس کی پیکنگ کر رہی تھی، اس کا دل خاصا بیزار تھا اور ولید بھی کچھ مشکوک لگ رہا تھا، یعنی کی تجسس پسند فطرت سے رہا نہیں گیا، وہ باہر آیا تو اس نے فوراً سوال کیا۔
 ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”تمہیں بتانا ضروری نہیں۔“ ولید کا انداز روکھا تھا۔
 ”تو پھر مجھ سے کام کروانا بھی ضروری نہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی شرٹ فوراً شیخ دی تھی،
 ”یہ بھی یعنی تھی، ولید جیسے بد دعاغ کی بد دعاغ کرن۔“
 ”یار! تم بھی نا۔“ ولید کا فوراً پینتر ایدلنا پڑا تھا، اسے جلدی نہ ہوتی تو یہ کام وہ خود بھی کر سکتا تھا، اب مجبوراً اسے یعنی کو خوشامد کرنا پڑی تھی۔

”میں نادرن ایریا جا رہا ہوں، ذرا دوستوں کے ساتھ گھومتے۔“
 ”تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔“ یعنی چل کر بولی تھی، ولید نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔
 ”میں دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

”تو پھر کیا ہو، میں بھی تمہارے ساتھ انجوائے کر لوں گی۔“ یعنی نے ضدی انداز میں کہا۔
 ”اسی بہانے نشرہ سے بھی مل لوں گی، وہ بھی تو شمالی علاقوں کی طرف ہی رہتی ہے۔“

”نشرہ سے بڑا بہنا تھا تمہارا جو ملنے جاؤ گی۔“ ولید کا انداز طنزیہ تھا۔

”اب میرے اس کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں۔“ یعنی نے برجستہ کہا۔

”مگر تمہاری نشرہ تو ویسے بھی لاپتہ ہے ابھی تک اس کا سراغ ہی نہیں ملا۔“ ولید نے اک بھونچکا کر اسے لا جواب کیا تھا۔

”اسے تلاش ہی تو کروں گی، نجانے بے چاری کے ساتھ کیا ہوا؟“ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔
 ”واللہ، یہ میرے گنہگار کان کیا سن رہے ہیں۔“ ولید نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔
 ”یہ نشرہ سے محبت کے سوتے کب سے پھوٹے۔“

”جب سے وہ کڈنیپ ہوئی ہے، پہلے کو سے لاپتہ ہو گئی، یا مر گئی اور اب ہماری نشرہ، یہ نہیں
 زندہ حالت میں لے گئی بھی یا نہیں۔“ یعنی تحقیق معنوں میں زور و رنج لگ رہی تھی، ولید پور ہو گیا۔
 ”ہونہہ ڈرامہ کو کہیں۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا تھا، مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔
 ”اسامہ بھائی کیا تو ہے پر ابھی تک کوئی اطلاع نہیں، جانے نشرہ کے ساتھ کیا ہوا۔“ یعنی کا
 انداز ہنوز وہی تھا، افسردہ اور دل برداشتہ۔

”میں نے بھی تو نشرہ کے ساتھ کبھی اچھا نہیں کیا، ہمیشہ اس سے لڑائی کی اس کے خلاف بغض
 رکھا۔“

”شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔“ ولید نے طنزیہ انداز چھا کر کہا تھا۔
 ”احساس تو مجھے پہلے بھی تھا مگر کرب زیادہ ہو رہا ہے۔“ یعنی نے پیٹنگ کا کام ختم کرتے
 ہوئے جواب دیا تھا، ولید نے کام ختم ہوتا دیکھ لیا اور بال بتاتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔
 ”تھینک یو ڈیر، تم نے میرا کام جلدی ختم کر دیا، چلتا ہوں اب۔“ وہ تیزی سے ہینڈ کیڑی اٹھا
 کر باہر نکل گیا تھا جبکہ یعنی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی نیچے آگئی تھی جہاں پر منظر کچھ بدلا
 بدلا لگ رہا تھا، امی اونچی آواز میں جوش کے ساتھ بولتے ہوئے بک رہی تھیں، ان کا گورا رنگ
 جذبات کی شدت سے تپتا لگ رہا تھا۔
 یعنی سارا ماجرا معلوم کرنے جلدی سے نہیں آئی، تب تک امی فون بند کر چکی تھیں، یعنی کو دیکھ
 کر بے تابی سے بولیں۔

”ہیام کا فون تھا نشرہ گھر آگئی ہے، رستہ بھول کر کسی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی، خیریت سے
 ہے۔“ امی کا رنگ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا، یعنی کو بھی فطری سی خوشی ہوئی، نشرہ کی گمشدگی نے پورے
 گھر کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔
 ”دشکر ہے، بات ہوئی آپ کی۔“

”ہاں ہوئی ہے، یہی تو تسلی ہوئی، میں ذرا نونی کو بتا دوں۔“ امی نے ایک مرتبہ پھر فون گود
 میں رکھا اور مصروف ہو گئیں۔

نشرہ کی واپسی نے منوں بوجھ اتار دیا تھا، یوں لگتا تھا کہیں نہ کہیں وہ بھی نشرہ کی گمشدگی میں
 قصور وار ہے، اور اسے تو نشرہ کی گمشدگی کے پیچھے ولید کا بھی ہاتھ لگتا تھا، اس نے فون بند کیا تو یعنی
 نے صاف صاف طریقے سے امی کو بتا دیا۔

”مجھے تو لگتا ہے، یہ ولید ہی نشرہ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“ یعنی دیے بھی ولید کے رویے سے
 ال برداشتہ ہو چکی تھی، سو ولید کی بے جا حمایت کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

”ہائے یعنی مجھے بھی اس کمینے سے شک ہے، کیا اس نے نشرہ کو آگے پیچھے کر دیا، مگر ہیام تو کچھ
 اور ہی بتا رہا ہے۔“ امی نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”اب ہیام اور کیا بتاتا، شاید اسے بھی پتہ نہ ہو، مگر آپ دیکھ لینا امی کہیں نہ کہیں ولید کا ہاتھ ضرور ہوگا، یہ انتقام میں اندھا ہو رہا ہے۔“ عینی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”اب یہ اس پیٹیم سے اور کیا انتقام لے گا، مکینہ ماں اور باپ کے پیچھے لگ کے عین بارات کے وقت ساتھ چھوڑ گیا، ایسا غیرت مند تھا تو نشرہ کو بغیر شرطوں کے بیاہتا، مرے ہوئے مامے کا بھی خیال نہیں آیا۔“ امی کو تو پرانی باتیں یاد آتے ہی آگ لگ گئی تھی۔

”آپ بھی اسے چلا نہیں کرتیں، جو کچھ ان لوگوں نے کیا، اب دوبارہ آتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔“

”شروع سے ہی ڈھیٹ اور ہٹ دھرم لوگ ہیں، اب وہ حصہ بنا کر بیٹھی ہے، حصہ لیے بغیر تو نہیں پیچھے ہٹے گی۔“ امی کو فرح پھپھو بے پناہ غصہ چڑھا تھا۔

”یہ مکان نشرہ کا ہے اور حصہ وغیرہ پھپھو کا کہاں سے بنتا ہے، اب بات کریں تا تو کورٹ میں انہیں پینج کر دیتا۔“ عینی نے ازلی بے وقوفی کے باوجود اس دفع پتے کی بات کر دی تھی، مشورہ ایسا تھا کہ امی کے دل کو لگ گیا۔

”تمہارا درویش باپ آئے گا تو اس سے کہوں گی، دیکھتی ہوں، اب کہاں سے یہ حصے لیتی ہے، دیکھ تو ہمیں پہلے خیال ہی نہیں آیا۔“

”اب تو آگیا، مجھے ویسے ہی آپ کو پتی رہتی ہیں۔“ عینی نے بسور کر کیا۔

”اتنی تو میں تمہارا ہوں۔“ وہ اترائی تھی۔

”اب ایسی بھی نہیں ہو اور اب چلنے کی کرو، نومی تمہیں لینے آ رہا ہے، پلوٹ بے چاری کی طبیعت اچھی نہیں۔“

”کیا ہوا انہیں۔“ عینی ذرا پریشان ہوئی پہلی مرتبہ اسے پلوٹ کی خرابی طبیعت پہ غصہ نہیں آیا تھا۔

”بہت ہی دکھی ہے امی، پلوٹ خالہ، بہت ہی ترس آتا ہے ان پر۔“

”بھئی تو کہتی ہوں کسی کی بے موت خدمت کر کے ثواب حاصل کر لے، اس دنیا سے کچھ نہیں لے کر جانا، میری یہ بہنیں بے چاری شروع سے قسمت اور حالات کی ستائی ہوئی ہیں۔“ امی آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”اچھا بھتی ہوں، تیاری کر لوں۔“ عینی نے بغیر بحث کے سامان باندھ لیا تھا، یہ معجزہ شاید آج کی تاریخ میں ہی ہوتا تھا۔

☆☆☆

نشرہ کی واپسی عروذہ کے لئے باعث قیامت تھی۔

اسے اپنی آنکھوں اور ساعتوں پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا، نشرہ کا واپس آنا اور ایک دوسرے سے آتنا سامنا، کھلا اعلان جنگ تھا، عروذہ کو دو تین قسم کے خوف بھی لاحق تھے، اس کا جھوٹ کھلنے والا تھا، اس کے بعد ہیام اس کا کیا حال کرتا؟ اس کا انجام کیا ہوتا، جھوٹ کھلنے کے بعد ہیام اس کا کیا حشر کرتا؟ وہ خوف زدہ ہو چکی تھی اور اس لئے کسی کا بھی سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اوپر سے عشیہ بھی پہنچ چکی تھی اور نشرہ ہیام عشیہ گول کمرے میں بہت دیر تک اکیلے بھی بیٹھے رہے تھے، ان کے باہر آنے سے پہلے بہتر تھا کہ وہ مورے کو اصل حقیقت بتا دیتی۔
وہ حقیقت جو ہیام نے سب سے چھپا رکھی تھی اور اب تلک یہ دونوں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے تھے، ولید کے انکشاف اور پکا عہد لینے کے باوجود عرفہ اپنے وعدے سے پھر رہی تھی، خود کو بچانے کے لئے اس نے غیر مناسب وقت پر ہیام اور نشرہ کے بیچ موجود رشتے کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

وہ مورے کے کمرے میں ان کے گھسنے سے لگی ہوئے ہوئے ان کے کانوں میں زہر پھونک رہی تھی اور مورے جیسے جیسے سنتی جا رہی تھیں، ان کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

”عرفہ بس کر دے۔“ بالآخر ان کا ضبط جواب دے گیا تھا، وہ چلا اٹھی تھیں۔

”بس کر دے عرفہ، میرا ہیام مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔“ وہ شدت غم سے نڈھال تھیں۔

”آپ کے ہیام نے آپ کو دھوکہ دیا ہے مورے، مجھ پر یقین نہیں تو اسے بلا کر پوچھ لیں، وہ اس لڑکی سے ٹکاخ کر چکا ہے، بیوی بنا کر لایا ہے اسے، ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی ہوئی ہے اس نے، وہ بھاگ گئی تو کیسے پر قرار تھا، کیسے صندیر خان کے گھلے پڑ گیا، اس کا خون بہا دیا؟ کوئی غیروں کے لئے یہ سب کرتا ہے؟“ وہ سانپ کی طرح بھکاری تھی۔

”میرا دم گھٹ رہا ہے عرفہ، خاموش ہو جا، میرا بچہ ایسا نہیں، میرا ہیام ایسا نہیں، وہ کیسے میرے عہد کو توڑے گا؟ اور وہ گھائی؟ میرا عہد، او میرے رب، مجھے کسی آزمائش میں مت ڈال۔“ وہ نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑی تھیں۔

تب ہی عشیہ بولتے ہوئے اندر آئی تھی اور اندرونی صورت حال دیکھ کر تھرا گئی، اسے فوراً کسی غیر معمولی پیشویشن کا ادراک تھا، وہ عرفہ کا مکروہ چہرہ دیکھتی مورے کی طرف بڑھی تھی۔
”کیا ہوا ہے انہیں۔“ اس نے مورے کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عرفہ سے سوال کیا تھا۔

”جو تم بہن بھائی نے ملی بھگت سے کیا، راز کھل گیا تم دونوں کے کرتوتوں کا۔“ عرفہ جواباً پھٹ پڑی تھی۔

”کیا بکواس ہے یہ۔“ عشیہ کے حواس منتشر ہوئے تھے، لمحہ بھر کے لئے وہ ہتھم سی گئی تھی۔

”مورے کو دھوکہ دیتے شرم نہ آئی، جب ہیام کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنی رہی، اتنا عرصہ ہم سے چھپائے رکھا، تم کیا جھٹیلتی تھی، ہم کبھی جانے گئے ہی نہیں، ہمیں پتا ہی نہیں چلے گا اور تم لوگ ہماری آنکھوں میں ایسے ہی دھول جھونکتے رہو گے۔“ عرفہ کی بکواس پر عشیہ کا متحیر رنگ آہستہ آہستہ نازل ہو گیا تھا اور پھر وہ اپنے ازلی جلال میں آگئی تھی۔

”سانپ اپنی فطرت نہیں بدل سکتا، نہ بچھو اپنی عادتیں ترک کرتا ہے، ڈنک مارتا جس کی فطرت ہو وہ مار کر ہی رہتا ہے، چاہے بھائی کی پشت ہو یا ماں کا کلیجہ، کیا مل گیا تجھے ساری بکواس کر کے۔“ وہ مورے کے کراہنے پر انہیں تسلی دلا رہی تھی ایک دم پھٹ پڑی تھی۔
”اور بھائی کو اپنی ماں اور بہنوں کے ارمان کھلتے ذرا شرم نہیں آئی، جس کو مہمان بنا کر لایا،

اس سے نکاح میں تھا۔“ وہ زہر خند ہوئی تھی۔

”نکاح میں تھا، گناہ میں نہیں تھا۔“ عشیہ اس سے بھی زیادہ زہر خند ہوئی تھی۔

”یہ سب تمہاری شہ پہ ہوا ہے، تم اس کے پیچھے تھی۔“ عروفہ کو آگ ہی لگ گئی۔

”پیچھے نہیں، میں اس کے آگے تھی، میں اس کے ساتھ تھی، میرا بھائی کچھ غلط نہیں کر سکتا، اس

نے جو بھی کیا، کسی کی زندگی بچانے کے لئے کیا۔“ عشیہ نے پھنکار کر کہا تھا، تب ہی مورے کے

مردہ وجود میں جان پڑی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھی ہی تھیں جب ہیام بھی شور کی آواز سن کر آ گیا تھا، ساری

چوکیدار تو اسے سمجھ آئی چکی تھی، مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی عدالت جج جائے گی۔

ابھی تو اسے عروفہ پہ شدید تاؤ تھا، جو کچھ اس نے کیا تھا، اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ پشیمان

ہونے کی بجائے مزید اپنی نفرت میں آگے بڑھ جائے گی اور اب جو کچھ ہو رہا تھا اسے کیسے ہینڈل

کرنا تھا؟ ابھی تو مورے کے سامنے جوابدہ ہونا تھا، کل کو بیایا نہیں بھی آ جاتیں، ہیام کا ماؤف

ہوتا دماغ چکرا رہا تھا، مورے اسے سامنے پا کر رونے لگی تھیں، عشیہ اور ہیام دونوں گھبرا گئے

تھے۔

”کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے ہیام، میرا بچہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔“ مورے کے آنسو اور

گرہ نے ہیام کو سخت پریشان کر دیا تھا، قریب تھا کہ وہ حواس باختہ ہو جاتا مگر عشیہ نے سارا معاملہ

سنیہال لیا تھا۔

وہ اپنے بھائی کا مقدمہ دہمی، ضدی اور جلالی ماں کے سامنے بڑی جی داری کے ساتھ لڑ رہی

تھی، اس نے ایسے دلائل دیئے کہ مورے خاموش ہو گئی تھیں، اس نے ہیام کو ماں کے سامنے ایک

ہیر و بنا کر پیش کر دیا، جس نے ایک بے بس اور مظلوم لڑکی کی مدد کی تھی، اس کے پیچھے کوئی محبت کی

داستان نہیں تھی۔

اور قریب تھا کہ مورے کا دل مکمل پیچ جاتا، عروفہ معاملہ ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر

شرانگیزی کرنے لگی تھی۔

”یہ دونوں ملے ہوئے تھے مورے، ان دونوں کی ملی جلت تھی، ان دونوں نے آپ کے

دعویٰ کا بھی نہیں سوچا، ان میں سے کسی نے بھی گھائی کا نہیں سوچا۔“

”گھائی بیچ میں کہاں آگئی؟ گھائی جہاندار شاہ کی منگ ہے، مورے کا بھائی ہے جہاندار

شاہ، اگر وہ لاپتہ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں، مجھے اس کی جگہ قربان کر دیا جائے، میرے معاملے

کے ساتھ کسی گھائی کا کوئی تعلق نہیں، سمجھی تم۔“ ہیام نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی تھی، عروفہ تو چاہتی

ہی یہی تھی کہ ہیام بولے اور اسے مزید انگارے چبانے کا موقع ملے۔

”یہ لڑکی جسے تم پنجاب سے بھگا کر لائے ہو، ہماری خاندانی روایات اور وقار کی دھجیاں بکھیر

چکے ہو یہ نہیں قبول نہیں۔“ قریب تھا کہ عروفہ کی مزید بکواس پر ہیام پھر جاتا اور اس پر ہاتھ رکھا

لیتا، عشیہ ہیام کو آپے سے باہر ہوتے دیکھ کر بیچ میں آگئی تھی۔

”کس کو کہا بھاگی ہوئی؟ نکاح کر کے لایا ہوں، اس کے خاندان کی رضا مندی سے، خبردار جو

بھاگی ہوئی کہا، بھول جاؤ گا، تم میری بڑی بہن ہو۔“ ہیام کا رنگ سرخ اور آنکھوں سے شرارے

پھوٹ پڑے تھے۔
دوسری طرف نشرہ بے چاری خوف و ہراس سے تھر تھرا کانپ رہی تھی، مورے کم صم تھیں،
عروذہ آگ بگولہ جبکہ عشیہ کسی سوچ میں کم تھی۔۔

مورے اس سارے شور شرابے سے گھبرا کر نڈھال ہو گئی تھیں، تب وقتی طور پر یہ عدالت بھی
برخاست ہو گئی، ہیام مورے کا چیک اپ کرنے لگا تھا، انہیں دوائیاں اور کلوز دیا، ان کی طبیعت
سنجیدگی تو دونوں بہن بھائی صحن میں آ کر بیٹھ گئے، دونوں پریشان اور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے
تھے، عشیہ نے ہیام سے کہا۔

”میں نے تمہیں بولا تھا، مورے کو بتا دیتے ہیں، تب بتا دیتے تو یہ صورت حال نہیں ہوتی۔“

”اس کو پتا کیسے چلا؟“ ہیام کسی اور پچ پر سوچ رہا تھا۔

”یہی تو پریشانی کی بات ہے۔“ عشیہ نے لب بچ لے لئے تھے۔

”مگر کوئی تو ہے، جس نے اسے بتایا ہے، وہ کون ہے؟“

”کیا تمہیں لگتا ہے؟ عروذہ کسی کے ساتھ رابطے میں ہے؟“ عشیہ کا سوال سنجیدگی لئے ہوئے

تھا۔

”ہاں مجھے لگتا ہے۔“

”پھر وہ کون ہے؟“

”تم پتا لگاؤ۔“

”ہاں میں دیکھتی ہوں۔“ عشیہ نے حامی بھری تھی، وہ خود بھی پریشان تھی مگر ہیام کو پریشان

نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم ریلیکس رہو، سب اچھا ہوگا، پتا چل گیا تو کیا ہوا؟ ایک دن تو پتہ چلتا ہی تھا۔“ اس نے

ہمیشہ کی طرح اپنے بھائی کی ہمت بندھائی تھی۔

وہ مشکور نظروں سے اپنی بہن کی طرف دیکھتا رہا، جس کے ہوتے ہوئے اسے کبھی یہ احساس

نہیں ہوا تھا کہ وہ اکیلا ہے، اس ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بہن کو یقین دلایا کہ اب وہ ریلیکس

ہے۔

☆☆☆

”تو تمہاری دعائیں رنگ لے ہی آئیں۔“ آج امام اپنے وعدے کے عین مطابق نیل بر

کے ساتھ چائے پی رہا تھا اور نیل بر اپنے ہاتھ سے بنے لوازمات سرو کرنی کچھ کفیوژن کا شکار تھی،

کہ آیا وہ اصرار کر کے امام کو کچھ کھلائے یا نہیں۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ سوال پیچیدہ تو نہیں؟“ امام فکر مند ہوا۔

”ارے نہیں، میں سوچ رہی ہوں، یہ حلوہ کھا کر تم پیار تو نہیں ہو جاؤ گے؟“ نیل بر خاصی

شرمساری حلوہ نما مغلوبہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بالکل بھی نہیں، یہ تو شفا یاب کرنے والی سوغات ہے، وہ بھی آپ کے بابرکت ہاتھوں سے

بنا ہوا، یہ تو باعث شفا ہوگا۔“ امام نے بہت بے تکلفی اور رغبت سے حلوہ کھایا اور تعریف بھی کی۔

”تمہیں واقعی پسند آیا ہے؟ یہ دل رکھنے کو تعریف کر دی۔“ وہ اب بھی کچھ مشکوک تھی۔

”میں نے دل سے تعریف کی ہے۔“ امام کو ریش بجالایا۔

”اب یقین کر لیتی ہوں، ویسے یہ ریشی مجھے اشعر نے بتائی تھی، وہ بہت اچھی کوکنگ کر لیتا ہے۔“ نیل برنے لگے ہاتھوں اشعر کے گھڑا پے کی بھی تعریف کر دی تھی۔

”ویسے جہاندار اور اشعر مل کر میرے بنائے کھانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔“

”بنانا بھی چاہیے۔“ امام کی زبان سے بے ساختہ پھسلا۔

”کیا مطلب؟“ نیل برنے اسے گھورا تھا۔

”کچھ نہیں یار، میرے سوال کا تو جواب دیا نہیں۔“ امام نے بسور کر کہا تھا۔

”کیا تم شادی کر رہے ہو؟ میں نے تو تمہاری شادی کے لئے دعا کی تھی۔“ نیل بر فرارز کھاتے ہوئے اسے چڑاتے ہوئے بولی تھی، امام نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”اے ایسے نصیب کہاں۔“

”کوئی پسند سے کیا؟“ نیل بر کا تجسس اٹھ آیا۔

”دل و جان سے۔“ امام نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

”کون ہے وہ؟“

”بتاؤ گا۔“

”ابھی بتاؤ۔“ وہ چل کر بولی تھی۔

”پہاڑی لڑکی ہے، بہت پیاری سی معصوم اور فرشتہ۔“ وہ جیسے کسی خوبصورت لمبے میں کھو گیا تھا۔

”تصویر ہے؟“

”نہیں۔“

”یہ کیسی محبت ہے؟“ نیل بر رور ہوئی۔

”تصویر تک نہیں۔“

”دل میں تصویر ہے اور آنکھوں میں۔“ اس کا انداز خواب ناک تھا۔

”ہوں، یعنی کہ سچی محبت ہے؟“ نیل بر نے رشک سے کہا۔

”محبت جھوٹی نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔“ امام کا اپنا ہی فلسفہ تھا۔

”اچھا، نام تو بتا سکتے ہو۔“

”ہاں، نام بتایا جا سکتا ہے۔“ امام نے چائے کا آخری سیپ لیا۔

”پھول کلیوں خوشبوؤں کو ملا کہ اس کا نام حمت بنتا ہے۔“ امام کا انداز خواب آگیا تھا، نیل

بر کو چائے پیتے پیتے اچھو لگ گیا تھا۔

”کیا حمت؟“ وہ چیخ پڑی تھی۔

”ہیں..... تمہیں کیا ہوا؟“ وہ گھبرایا۔

”تم بیال والی حمت کی بات کر رہے ہو، جو سردار بیٹو کی بیٹی ہے؟“ نیل بر نے حواس باختہ ہو

کرتیز لیجے میں پوچھا تھا۔

”ہاں وہی۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“ نیل برابر بھی بے یقین تھی۔

”تھوڑا بہت دیکھا تھا نا، تمہارے ساتھ ہی، تب سے ہی جانتا ہوں۔“ امام نے کچھ سنسر

کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔

”یعنی کہ حمت اور تم، ادے واہ، امام تم تو چھپے رستم نکلے۔“ گو کہ اسے پہلے بھی پتا تھا مگر امام کا حمت سے اقرار محبت والا انکشاف اس کے لئے خاصا حیران کن تھا۔

نیل برکو بہت ہی اچھا لگا، اس کی خواہش بھی ایک دفع حمت سے بات کر لے، اس کی یہ خواہش امام نے پوری کر دی تھی، اس نے حمت اور نیل برکی اپنے فون پر بات کروادی تھی۔

نیل برکو یہ سب خواب ناک لگ رہا تھا۔

حمت اسے پولو پیچ کے منسوخ ہونے کی مبارک باد دے رہی تھی۔

”میں خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی، خدا نے بڑے خون خرابے سے بچا لیا، مگر تمہیں شاید نہیں

پتا، صندیر لالا یہ قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔“ حمت نیل بر سے بات کر کے بے پناہ خوش تھی، امام ان دونوں کو پرائیوٹ سی دینے کی غرض سے میسر پہ چلا گیا تھا، اب وہ دونوں باتوں میں مگن ہو چکی

تھیں۔

”میں نے سنا ہے، اخبار بھی پڑھا تھا، مگر یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ تفصیل جاننا چاہتی تھی۔

”غلط فہمی میں ہوا، شاہوار لالا کے سالے نے یہ سب کیا۔“ حمت اسے بتا رہی تھی، نیل بر کے

بے حد تاسف ہوا۔

”یہ لوگ تو جہاندار لالا پہ ڈال رہے تھے، شکر خدا کا بات جلد ہی کھل گئی۔“ حمت نے مزید

بتایا۔

”مگر اس نے یہ سب کیوں کیا؟ اور وہ کون تھا؟“ نیل بر تفصیل جان کر ذرا متحس ہوئی تھی۔

”وہ..... دراصل بابا جان کا بیٹا ہے۔“ حمت نے کچھ ہچکچا کر بتایا۔

”بابا جان کا..... میرے بابا کا؟“ نیل بر حیرت سے چلا اٹھی تھی۔

”ہاں..... نا۔“ حمت نے دلی آواز میں کہا۔

”تمہیں پتا تو ہے، بابا جان کے اور بھی بچے ہیں۔“

”اور اب کیا صندیر لالا بلا لے لیں گے میرے بھائی سے۔“ نیل بر کے منہ سے بے ساختہ نکلا

تھا وہ ”میرا بھائی“ کہنے پر حیران رہ گئی تھی، یعنی کہ نیل بر کا بھائی، بہت حیران کن بات تھی، مگر نیل

بر کے بارے میں سب جانتے تھے، وہ کسی بھی تبدیلی کو جلدی قبول کرنے والی تھی۔

”ہاں..... تمہارا بھائی..... مجھے اچھا لگا نیل بر۔“ حمت نے خوشدلی سے اس کی حوصلہ افزائی

کی تھی۔

”تو کیا اب فساد اور بڑھے گا؟“ نیل بر متحکرتھی۔

”ایسا نہیں ہوگا، وہ سب غلط فہمی میں ہوا تھا، دونوں فریق غصے میں نہیں ہیں بلکہ جس نے

زیادتی کی اور ناحق خون بہایا اس نے معافی مانگ لی ہے۔“ حمت نے اسے تفصیلاً بتا کر بھرپور تسلی دی تھی۔

”شکر خدا کا، ایک لحاظ سے بہتر ہوا، صندیر لالا پیار ہیں اور اب پولوئنج نہیں ہوگا، جہاندار اور صندیر لالا ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں ہوں گے۔“ نیل بر نے کچھ بھرا سانس لیا تھا، تب ہی امام بھی آگیا۔

نیل بر خدا حافظ کہہ کر امام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔
 ”کسی دن تمہاری پوری حویلی دیکھوں گا۔“ امام چاروں اور دیکھتا ہوا خواب ناک انداز میں بول رہا تھا۔

”جانتی ہو، ہماری بھی ایسی ہی ایک حویلی تھی۔“

”ہیں، واقعی؟“ نیل بر کو اشتیاق ہوا۔

”تو پھر وہ کدھر گئی؟“

”شاید کسی نے گرادی۔“ وہ افسردہ اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

”ابھی دیکھ لو، آؤ میں تمہیں دکھائی ہوں، آج ہی۔“ نیل بر اسے افسردہ دیکھ کر بات بدلنے کی غرض سے بولی تھی۔

”آج نہیں، آج تو بہت دیر ہو چکی، پھر کبھی سہی، زیادہ وقت کے لئے آیا تو دیکھوں گا۔“ اب وہ جانے کے لئے اٹھ رہا تھا۔

”تمہارے شوہر نام دار بھی گھر میں بھی نظر آتے ہیں؟“

”مشکل سے ہی، اس کے تو کام ہی ختم نہیں ہوتے۔“ نیل بر روایتی بیویوں کی طرح جہاندار کی برائیاں کرنے لگی تھی، جلتے جلتے امام کو ریڈور میں ایک تصویر کے سامنے رک گیا تھا۔

”یہ تصویر؟“ وہ چونک کر دیکھنے لگا، یہ پہلے دیکھی جانے والی تصویر سے مختلف تھی، اس تصویر میں ایک نوجوان لڑکا، ایک نو عمر لڑکا اور ایک بچہ بھی تھا، وہ بہت غور بھی کرتا تب بھی اس بچے کو پہچاننا اس کے لئے ہرگز بھی مشکل نہیں تھا۔

”یہ تصویر پولوئنج کی ہے، جب فرخزاد بیچ جیت گیا تھا۔“ نیل بر نے گم صم کھڑے امام کو بتایا تھا۔

”یہ فرخزاد ہے نا، جہاندار کا بھائی اور یہ بچہ، ان دونوں کا بھتیجا ہے شاید۔“ نیل بر اسے کچھ اور بھی بتا رہی تھی۔

جبکہ امام کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی، بہت تیز آندھی یا کوئی طوفان اٹھا تھا، امام جیسے لمحوں میں تنکا تنکا بکھر گیا۔

”کیا جانتی ہو نیل بر! یہ بچہ کون ہے؟“ امام نے کچھ دیر بعد بہت سراسیمہ لہجے میں پوچھا تھا۔
 (بانی آئندہ)

☆☆☆

بیچے اپنی پھولی سانسیں سنبھالے شعاع کا چہرہ سوا
نیز سے بر آئے سورج تلے سرخ ہو رہا تھا، اس
سے پہلے کہ شعاع کچھ کہتی وہ یونیورسٹی کے کیفے
نیریا میں پہنچ چکی تھی۔
”اپنی ذاتی چیزوں کی حفاظت خود کیا
کریں، کیا اس کا ٹھیکہ بھی امواجانی نے اٹھا رکھا
ہے۔“
ستین جو اپنے یونی فیلوز کے ساتھ کھڑا

وہ تیزی سے روش پر چلتی جا رہی تھی، اس
کے دائیں ہاتھ میں بیک اور بائیں ہاتھ کی
انگوٹوں کی گرفت میں آئی ڈی کارڈ تھا، وہ تیز تیز
قدم اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھ چلتی شعاع کی
موجودگی کو بھی نظر انداز کر بیٹھی تھی، شعاع بھی
اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے کی ناکام
کوشش کر رہی تھی، وہ اب بھی اس سے چار قدم
بیچے ہی تھی، وہ تیز تیز چلتی جا رہی تھی اور بیچے

ناولٹ

باتوں میں مصروف تھا ایک کرخت آواز پر پلٹ
کر دیکھا تھا، اس کے ماتھے میں کچھ لکھوں کے
لئے سلوشن نمودار ہوئیں پھر غائب ہو گئیں، ستین
پر اس کی نفرت بھری نگاہ کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا
تھا، اس نے خاموشی سے اپنا آئی ڈی کارڈ تھاما جو
وہ آج صبح جلدی میں ناشتے کی ٹیبل پر بھول آیا
تھا، اس سے پہلے کہ وہ اپنا رخ موڑتا وہ تیزی
سے پلٹ کر جا چکی تھی، شعاع نے دیکھا ستین کا
چہرہ بے تاثر تھا اس کی نگاہ اب بھی اسی نفرت
بھری نگاہ کے زیر اثر تھی، نہ جانے اس نگاہ میں کیا
کچھ تھا وہ اس نگاہ میں چھپی تیز روشنیوں کو دیکھنے
کی تاب نہ لاسکی اس کا رخ اب موصوفہ کی طرف
تھا جو واپس پلٹتے وقت بھی اسے فراموش کر گئی
تھی۔

”محترمہ الفت شریل صاحبہ میں اللہ نے
نام کی حد تک ہی الفت رکھی ہے ورنہ.....“ وہ





اپنی پھولی سانسوں کو لئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ورنہ کیا.....؟“ الفت ڈھٹائی سے بولی۔

”تم خوب سمجھتی ہو میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں، بے چارے کو سب کے سامنے کیوں طنز کا نشانہ بنانا کیا یہ اچھی بات ہے محترمہ؟ اپنے نام کی طرح اپنی زبان میں بھی الفت کی دو بوند پڑکا لیا کریں پلیز؟“ شعاع کا انداز ذوق منی تھا۔

”ہوگئی نصیحت یا کچھ اور باقی ہے۔“ اس کا لہجہ اب بھی ساٹ تھا۔

”تم نہیں سدھرو گی۔“ شعاع کے لہجے میں تاسف تھا جس سے وہ ہنسی گئی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے یہ شخص زہر لگتا ہے۔“ وہ اب نیم کے سائے تلے کھڑی تھی۔

”وہ تمہارا کزن ہے، تم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہو، اس پر اتنی نفرت، بے چارے کے

ماں باپ بھی نہیں کچھ تو لحاظ مروت کر لیا کرو۔“

”لحاظ مروت کرنے کے لئے میری امو جان ہیں نہ۔“ وہ اپنے لہجے میں طنز سو کر ایک

نیمگی نگاہ شعاع پر ڈال کر بولی جس کی ہمدردیاں اس شخص کے ساتھ تھیں جس کی شکل دیکھ کر ہی

اسے ابکا کی آتی تھی، بات نامعقول تو تھی لیکن کیا کریں وہ بچپن سے ہی اسے کسی خاطر میں لانا

پسند ہی نہ کرتی تھی، وہ یونیورسٹی کا خوش شکل خوش لباس اور ذہین اسٹوڈنٹ تھا، لیکن الفت کو اس

سے سخت چڑھتی تھی، وہ اپنی ماں کی بچپن سے ہی اس کے ساتھ ناز برداریاں کرتے دیکھتی آرہی تھی، یہ حق تو صرف اور صرف اس کا تھا، تین چار سال کا

تھا جب ایک کار حادثے میں اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا، تین اس کی پچھو کا اکلوتا بیٹا تھا اور

پچھو اور اس کے باپا دو ہی بہن بھائی تھے، دادی پچھو کا نم نہ سہہ سکتیں، پچھو کے انتقال کے ایک

برس بعد ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا، تین امو کے لئے ویسی ہی ذمہ داری بن گیا تھا جیسے ان کی اپنی

اولاد الفت تھی، دونوں میں سال بھر کا ہی فرق تھا، اپنی ماں کی گود کا یوں بٹ جانا اسے ہرگز اچھا

نہیں لگا تھا، اس کے اندر غم اور اتانے جیسے جڑ پکڑ لی تھی، وہ ہر اس کام کی نفی کرتی جس پر تین

انگلی رکھ دیتا، تین کو جیسے الفت کے ان رویوں کی عادت سی ہو گئی تھی، وہ کبھی کبھی خفت بھی محسوس

کرتا، اپنے احساس اور جذبات کا قابو میں رکھنا اسے وقت نے بہت اچھے طریقے سے سکھا دیا

تھا، وہ اس کی کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا، اگنور کر دیتا تھا، لیکن یہ بات بھی الفت کے دل پر گراں

گزرتی، وہ غصے سے گردن ہلاتی اپنے ہر ناجائز رویے کو جائز ہی سمجھتی رہی، شعاع سب جانتی

تھی، پھر بھی حق بات کہنے سے کتراتے نہ تھی، آج بھی جب اس نے الفت کو کڑے تیوروں کے

ساتھ یونیورسٹی آتے دیکھا تو کچھ دیر میں حقیقت واضح ہو گئی، تین اپنی بانیٹ پر یونیورسٹی جاتا تھا

اور الفت اپنے ڈرائیور کے ساتھ یونیورسٹی جاتی تھی، آج جلدی میں ناشتہ کرتے ہوئے ٹیبل پر

تین اپنا آئی ڈی کارڈ بھول گیا، اب اس بات کو جیسے اس کی ماں نے سر پر سوار کر لیا، امو جان نے

چائے کا گرم کپ اس کے سامنے رکھ کر جلدی سے کہا۔

”ناشتہ جلدی کرو الفت!“

”کیوں کیا قیامت آگئی ہے۔“ وہ گرم چائے کا کپ تھام کر ایک سیپ لیتے ہوئے

بولی۔

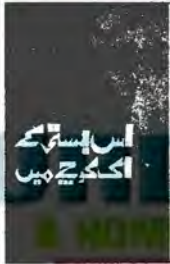
”دیکھو ذرا اپنا آئی ڈی کارڈ یہیں بھول گیا ہے جاؤ بیٹا جلدی یونیورسٹی پہنچ کر اسے پہلی

فرصت میں دے آؤ۔“ امو جان فکر مندی سے بولیں اور ان کی یہی افسردگی اور پریشانی دیکھ کر

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



ابن انشا کے شعری مجموعے



لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محل امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرم روڈ اردو بازار لاہور
فون: 042-37310797, 042-37321690

اس کا بی پی ہائی ہو گیا اور وہ خوشخوار نظروں سے
آئی ڈی کارڈ اپنی گرفت میں لئے ادھورا ناشتہ
ٹیبیل پر چھوڑ کر گھر سے باہر نکل گئی، جانتی تھی کہ
آئی ڈی کارڈ نہ دیا تو امو جان ناراض ہو جائیں
گی اور اپنی ماں کی ناراضگی ہزار خفگیوں کے
باوجود وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی، پیچھے امو جان
آوازیں دیتی رہ گئیں، لیکن اس نے پھر پلٹ کر
نہ دیکھا، اب اس کے لئے ناشتہ مکمل کرنا ایک
مشکل ترین امر تھا، وہ سیدھا گاڑی میں بیٹھ کر
ڈرائیو کو اب چلنے کا حکم دے رہی تھی، گاڑی اب
امو جان کی نگاہ سے دور ہو چکی تھی، ان کے لب
اب بھی دعائے کلمات کا ورد کر رہے تھے۔

☆☆☆

”اس شخص سے نفرت کرنے کی مجھے کوئی
معقول وجہ نظر نہیں آتی کیا صرف اس لئے یہ شخص
نفرت کے قابل ہے کہ تمہاری ماں نے اسے پالا
ہے، ایک ماں چار پانچ چھ بچوں کو بھی تو پالتی ہے
نہ پھر اتنی جیسی ایک بندے سے ہی کیوں؟“
”کچھ باتیں کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی،
انہیں سمجھانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بعض
نفرتیں خوردہ پودے کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی
ہیں، بلا وجہ..... بے وجہ بھی۔“

”شعاع! اس شخص سے نفرت کرنے کے
لئے مجھے کسی وجہ کی ضرورت نہیں..... مجھے کسی وجہ
کو کھوجنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

سر رضوان کی کلاس آف تھی اور وہ دونوں
اپنی کلاس کے باہر بیٹھی ہوئی تھیں، شعاع نے
موقع دیکھ کر پھر وہی موضوع چھیڑ دیا جس سے وہ
بدک جایا کرتی ہے، آج وہ اسے پھر سے بہت
ٹھوکی ٹھوکی سی لگی، بلیو جینز پر وائٹ کرتا میں
جھلکتا اس کے نام کا گولڈ لاکڈ جمول رہا تھا، وہ
خاک زین پر اکادکا گھاس پریشی اسے بے دردی

سے نوج رہی تھی اور شعاع اس کی اضطرابی کیفیت کو کھوجنے کی سعی کر رہی تھی، وہ اس سرے تک پہنچنا چاہتی تھی جو اس کی دوست کو خود سے بے گانہ کر دیتی تھی وہ اکثر یونہی کھوٹی کھوٹی سی رہتی۔

”وہ اس یونیورسٹی کا سب سے قابل اسٹوڈنٹ ہے، تمہارا کزن ہے کل کو تمہیں اس کی کسی بھی طرح سے مدد درکار ہوگی تو.....“ اس سے پہلے کہ شعاع مزید کچھ کہتی الفت نے اس کی بات تیزی سے کاٹ دی۔

”یہ شخص دنیا کا آخری فرد بھی ہوا تو بھی اس کی مدد لینا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں اور آئندہ اس شخص کا ذکر میرے سامنے یوں دلچسپی سے بیان مت کیا کرو ورنہ میری دوستی کے بجائے اس کی دوستی کا ہاتھ تمام لو جس کا ہاتھ پہلے ہی کٹی لڑکیوں نے دوستی کی آڑ میں تمام رکھا ہے۔“ وہ درشت لہجے میں پھینکارتے ہوئے بولی۔

شعاع نے اس کے کمرورے انداز کو دیکھ کر اپنے تاثرات یکدم بدل ڈالے اور کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

”اچھا بابا معاف کر دو، اب کیا آج یونہی بھوکا مارو گی نہ آج تم نے ڈھنگ سے ناشتہ کیا ہے اور نہ میں کر کے آئی ہوں چلو کیفے چلتے ہیں کچھ کھاپی کر فریش ہو کر آتے ہیں۔“ وہ رسائیت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی تو وہ کسی حلقی کو ظاہر کئے بغیر اٹھ گئی دونوں کا رخ کیفے کی جانب تھا۔

☆☆☆

حبیب اللہ کی دو ہی اولادیں تھیں، شرنیل اور بازغہ انہوں نے دونوں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، حبیب اللہ اپنی دونوں اولادوں میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے، اس وقت لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم

دلوانے کا رجحان نہ تھا، حبیب اللہ روشن خیال انسان تھے، انہوں نے بچوں کی تربیت کے معاملے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، شرنیل، بازغہ جب کالج سے نکل کر یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئے تو ان کی زندگی میں عارش اور ارجمند داخل ہوئے، بازغہ کی سیکلی ارجمند اور شرنیل کا دوست عارش میں یوں گہری دوستی ہوتی چلی گئی کہ یہ چاروں ایک ساتھ جہاں جاتے نظر آنے والوں کو ایک جاں ہی نظر آتے، اپنی ذہانت، خوبصورتی اور خود اعتمادی کی وجہ سے بازغہ کب عارش کے دل میں اتری عارش کو خبر ہی نہ ہوئی، یونیورسٹی ختم ہونے کے بعد عارش کو احساس ہوا کہ وہ بازغہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اپنی اس خواہش کا ذکر وہ کسی طور اپنے دوست شرنیل سے نہیں کر سکتا تھا، اسے لگا محبت کی اس کو پھل کو وہ سب سے پہلے ارجمند کو دکھائے گا، عارش نے فون پر ارجمند سے بات کرنے کا فیصلہ کیا وہ ہی اسے بہتر مشورہ بھی دے سکتی تھی، اس نے ارجمند کو فون کیا اور جب ارجمند نے سنا کہ عارش بازغہ سے محبت کرتا ہے تو اپنے دل میں عارش کے لئے الفت سینے میں دبائی وہ دل ہی دل میں اپنا موزانہ بازغہ سے کرنے لگی، سانولی سنولہ رنگ پر چٹکے نقوش والی ارجمند کے پاس شخص محبت کے اور کچھ بھی تو نہ تھا، وہ بازغہ کی طرح حسین، ذہین بھی نہ تھی، ارجمند کا تعلق اونچے خاندان سے تھا، صاحب ثروت لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، اس کے اندر ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا، جو سامنے والے کو اپنی طرف خود بخود متوجہ کر لیتا تھا، عارش بھی تو خوش شکل، اسماٹ اور اسی کی طرح کھاتے پیتے خاندان سے تھا، دونوں کی جوڑی واقعی بے مثال تھی، وہ دل ہی دل میں اس خوبصورت رشتے کو تسلیم کر چکی تھی، اپنے آنسو اپنے اندر ہی سمیٹ لئے، یہ

اس کی ایک طرف محبت تھی۔

”ارجمند! سن رہی ہوں، میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ عارش اس کی لمبی خاموشی سے گھبرا کر پول رہا تھا اور وہ ریسور تھا ہے اپنے آنسو پی رہی تھی۔

”ہاں۔“ اسے اپنی آواز بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی جیسے گہرا کنواں۔

”پھر کہو نا، بازغہ کی کہیں نسبت طے تو نہیں، یہ بات تم سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے میں جلد سے جلد رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں تم تو جانتی ہو، پاپا کی لیدر انڈسٹری ہے اب وہ ایک اور فیکٹری دوسرے شہر میں لگانا چاہ رہے ہیں مجھے اس فیکٹری کا کام سپرد کرنا چاہتے ہیں اور میں.....“ وہ کہتے کہتے رک سا گیا۔

”نہیں میرے خیال میں اس کی کہیں اور نسبت نہیں طے ہوئی ہے آپ اپنا رشتہ جلد بھجوا دیں۔“ ارجمند نے بہ مشکل کہا وہ اس لمحے احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی۔

”ہاں ضرور..... چلو پھر میں اپنے گھر والوں سے بات کرتا ہوں۔“ عارش خوش ہوتے ہوئے بول رہا تھا، محبت کا یوں مل جانا خواب و خیال سی باتوں کی طرح محسوس ہوتا ہے، لیکن ان کی محبت کا ٹکٹن ہونا قدرت نے منظور کر رکھا تھا، شادی و حوم دھام سے ہوئی ارجمند نے اپنے ہاتھوں سے اپنی عزیز کمپنی کو دہلین بنایا، بازغہ کی شادی کے روز ارجمند نے اپنے سینے میں دفن محبت کو سیاہ ڈائری میں مقید کر کے گھل لگا دیا، بازغہ کی شادی کے بعد ارجمند گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی، سلائی کڑھائی سے بھی اسے دلچسپی تھی اور اپنا فارغ وقت یوں ہی گزار کر دل کے زخموں پر پرمہم رکھتی رہی، ارجمند کو مکمل یقین تھا اس کے ذمہ ایک دن بھر ہی جائیں گے، بازغہ عارش کے ہمراہ دو ماہ

بیس گھنٹہ پھرتی رہی اس دوران وہ گا ہے لگا ہے ارجمند کو فون کرتی رہی، بازغہ کو محسوس ہوا کہ وہ جب بھی اس سے گفتگو کرتی ہے اس کا لہجہ دو گفتگو شناسی بھیگا سا محسوس ہوتا، لفظوں میں تکلف عود آیا تھا، وہ جو بے تکلفی سے بے ٹکان گفتگو کرتی تو کہتی چلی جاتی، اب ان لیوں سے نکلے چند حرف اسے کسی انہونی کا احساس دلا رہے تھے، وہ پوچھتی کیا ہوا ہے؟ وہ جواب میں کہہ دیتی، کچھ بھی تو نہیں۔

شاید یہ بازغہ کا وہم ہی تھا، بازغہ خود ہی کو تسلی دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی، دن یونہی گزرتے رہے، یہ مہینہ ایام وہ اپنی سیاہ ڈائری کی نذر کرتی رہی، دو ماہ بعد جب بازغہ واپس پاکستان لوٹی تو کہا کہ وہ اپنے ہمراہ اس کے لئے دو خوشخبریاں لا رہی ہے، پہلی خوشخبری کہ وہ نئے مرحلوں سے گزر کر ایک منصب پر فائز ہونے جا رہی ہے، وہی منصب جو اولاد کے وجود کے ساتھ عورت کو ماں کی صورت میں ملتا ہے اور دوسری.....

”کیا..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... ہوش میں تو ہو۔“ ارجمند بے حد شاکہ تھی، بازغہ اپنے بھائی شرجیل کے لئے رشتہ لے کر آئی تھی، شرجیل دیکھا پھالا تھا، ارجمند یونیورسٹی سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی، اس کے والدین کسی بہتر رشتے کی تلاش میں بھی تھے اور اس سے بہتر رشتہ مل بھی نہیں سکتا تھا، انہوں نے خوشی خوشی ہاں کر دی آخر ارجمند کے بعد باقی دو بیٹیوں کے متعلق بھی انہیں سوچنا تھا، ارجمند سے پوچھا تو وہ کچھ نہ کہہ سکی..... وہ کیا کہتی ہے..... اور کیوں کہتی؟ اس نے وقت اور ماں باپ کے حالات دیکھ کر سر جھکا لیا تھا، شرجیل ہوتا یا کوئی اور اب اس بات سے ارجمند کو فرق نہیں پڑتا تھا۔

گول مثل سا بچہ سب ہی کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا،
ارجمند اور شریل کی شادی کو ایک ماہ ہی گزر رہا تھا،
کسی کو کیا معلوم تھا یونیورسٹی میں ساتھ رہنے
والے یہ چاروں دوست یوں شادی کے بندھن
میں بندھ جائیں گے۔

ارجمند حلیم طبیعت کی مالک سلجھی ہوئی لڑکی
تھی کسی بھی ماحول میں آسانی سے رچ بس جانے
والی فطرت کو بازغہ کی دور اندیش ذہانت نے
بھانپ لیا تھا، محبت کی کک دل میں دفن کر کے وہ
شریئل کے ساتھ ایک اچھی زندگی کا آغاز کر چکی
تھی، بازغہ کی زندگی میں تو جیسے ستین نے شامل ہو
کر اسے مکمل کر دیا تھا، عارش کا بزنس آسمان کی
بلندی کو چھو رہا تھا، بزنس کی ترقی کا سہرا عارش
اپنی بیوی بازغہ کی قسمت اور ستین کے نصیب سے
ملنے والی ثروت کو اللہ کا فضل و کرم کہتا جو اللہ نے
بنیہر کسی مشقت کے ان کی جھولی میں ڈال کر ان
کی زندگی کو پرسرت اور پرسکون بنا دیا تھا، دریا
کی طرح بہتے اس پانی میں ہمیں کسی شور کا نام و
نشان نہ تھا۔

ستین کی پہلی سالگرہ پر ارجمند بھی نئی
خوشیوں کی نوید شریئل کو سنانے لگی، شریئل بے
حد خوش تھا اور اس طرح بازغہ نے بھی خوشی کے
اس دوہرے موقع پر مل کر ستین کی پہلی سالگرہ کا
کیک کاٹا، وہ پھپھو بننے جا رہی تھی، اکلوتا بھائی
اور اس سے وابستہ ارجمند سے بازغہ نے اپنی ماں
کو بھی یہی کہہ رکھا تھا کہ وہ ارجمند کے چاہنے
کے باوجود بھی اسے پلنگ سے نیچے پاؤں نہ
لٹکانے دیں اور ہوا بھی یوں ہی ارجمند بازغہ کی
محبت کے آگے مجبور ہو گئی، نہ چاہنے کے باوجود وہ
کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی اس نے آنے والی
منہی زندگی کے لئے ہر چیز اپنے ہاتھوں سے خود
بنائی، یوں الفت دنیا میں آگئی، بازغہ پھپھو بن

محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت
ستارے آرزو کے اس طرح سے جگمگاتے ہیں
کہ پہچانی نہیں جاتی دل پہ تپ کی صورت
محبت کے شجر پر خواب کے پتے اترتے ہیں
تو شاخیں جاگ اٹھتی ہیں
تھکے ہارے ستارے جب زمین سے بات کرتے

ہیں
تو کب کی منتظر آنکھوں میں
شمعیں جاگ اٹھتی ہیں
محبت ان میں جلتی ہے چراغ آب کی صورت
محبت خواب کی صورت!

محبت درد کی صورت
گزشتہ مومسوں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
شب بھر میں، روشن ستارہ بن کے رہتی ہے
منڈیوں پر چراغوں کی لویں جب تھر تھرائی ہیں
مگر من نا امید کی کی ہوا میں سنسنائی ہیں
گلی میں جب کوئی آہٹ، کوئی سایہ نہیں رہتا
دکھے دل کے لئے جب کوئی بھی دھوکہ نہیں رہتا
غموں کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شانے
تو

ہاں پہ ہاتھ رکھتی ہے
کسی ہمدرد کی صورت
گزر جاتے ہیں سارے، قافلے جب دل کی بستی

سے
فضا میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گرد کی صورت
محبت درد کی صورت

بازغہ ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن چکی
تھی، ارجمند نے نو مولود ستین کو اپنی گود میں اٹھا
لیا، ستین بازغہ کی طرح سرخ و سفید اور عارش کی
طرح و جیہہ شکل و صورت کا مالک تھا، صحت مند

کا علم تھا، لیکن وہ اس اعلان سے گھبرا جاتا تھا،
تھک ہار کر ارجمند نے اپنی آنکھیں بند کر لیں،
اس نے نومولود الفت کی طرف دیکھا جسے یہ نام
خود شریل نے دیا تھا، وہ اب سائے کے پیچھے
بھاگتے بھاگتے تھک چکی تھی، یقیناً اب وقت آ گیا
تھا کہ اسے اپنی ہار تسلیم کر لینی چاہیے، زندگی میں
انسان کو سب ہی کچھ تو حاصل نہیں ہو جاتا اس
نے تشکر کے ساتھ ایک گہری سانس لی اور الفت
کو سینے سے لگا کر شریل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام
لیا، پاس کھڑا شریل نے اپنے مضبوط ہاتھوں
میں نسوانی لمس کا احساس یا کر محبت سے ارجمند کی
آنکھوں میں دیکھا تھا جس کی آنکھ سے دو بوندیں
گر کر تکیے میں جذب ہو گئی تھیں۔

وہ زمین پر اپنے پیڑ مضبوطی سے رکھ کر کھڑی
ہو چکی تھی، لمحوں نے آگے خوشیوں کے ہنڈولوں
میں جھولے جھولے کر سر کننا شروع کر دیا تھا۔
وہ کل بھول گئی اور آج میں خود کو شاد رکھنا
سیکھ گئی اس نے وقت کا ہاتھ خوش دلی کے ساتھ
تھام لیا تھا، اس کے چہرے کی آزر دگی کھو گئی تھی،
وہ مایوسی کے اندھیروں سے نکل کر روشنی میں خود کو
پہچان چکی تھی کہ..... وقت کی عمارت میں ایک
گہرے شکاف نے اسے کھڑا کر دیا، ساکت.....
بے جان وجود اس کے سامنے پڑا تھا، ہر طرف آہ
و بکا کا شور و غل مچا تھا بازغہ اور عارش متین کو نانی
نے ہاں چھوڑ کر اسلام آباد کسی پر اب رہی کی ڈیل
کے سلسلے میں جا رہے تھے، جہاز کرئیں ہونے کی
خبر سب سے پہلے ارجمند نے سنی اور منظر بدلتے
چلے گئے، خوشیاں غموں میں بدل گئیں، یوں چار
سالہ متین اس کی گود میں سا گیا اور ارجمند متین کو
اپنی بانہوں میں سمیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو
دی۔

☆☆☆

کے بے حد خوش تھی ارجمند نے دیکھا الفت بالکل
اس کی طرح ہی تو نازک اور گندی رنگ کی تھی،
اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی وہ تصور میں
کسی پری کا چہرہ آنکھوں میں سائے بیٹھی تھی سوچا
تھا کہ اس کے آنگن میں پھول بالکل بازغہ کی
طرح سرخ و سفید رنگ کا ہوگا، دل میں نہ جانے
کیوں بازغہ سے وہ خود کو مقابلے میں کھڑا کر دیتی
تھی ہر موقع پر اسے اپنا پلڑا ہلکا ہی لگتا، سب
بے حد خوش تھے، یہ تو اس کی اپنی آپس کی سرور
جنگ تھی جو نہ جانے کیوں اور کب سے اپنے
اپنے محاذوں پر ڈٹی اسے اندر ہی اندر رکھا لگتی۔
”ارجمند! یہ تو بالکل تمہاری طرح ہی پیاری
ہے۔“ بازغہ نے الفت کو اپنے سینے سے محبت
سے چمکا کر کہا۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں تو اور کیا؟“

”اچھا۔“ وہ ہنس دی۔

ارجمند نے مختصر کھمکھم کر خود کو جھوٹی سی تسلی
دے ڈالی، اس نے ایک نگاہ بازغہ پر ڈالی جو
شادی کے ڈھائی سال بعد بھی ویسی کی ویسی تھی
سرخ و سفید رنگت کوئل سا چہرہ اور وہی مناسب
جسم، عارش کی محبت نے اس کے حسن کو اور بھی
زیادہ نکھار دیا تھا، ایک مکمل محبت کے احساس سے
مکمل وجود اس کے سامنے موجود تھا، ارجمند کو
ایک بار پھر نہ جانے کیوں احساس کمتری نے گھیر
لیا، شریل ایک محبت کرنے والا شوہر تھا وہ ایک
اچھی زندگی گزار رہی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود نہ جانے کون سا
ایسا احساس تھا جو اسے بازغہ کے مقابل کھڑا
کرنے پر اکساتا رہتا تھا اور وہ بنا چوں چرا کئے
خود کو ترازو میں تولے لگتی، وہ ایک ہارے ہوئے
لشکر کا ایک سپاہی تھی جسے اپنی ہار کے تسلیم ہونے

گھورتے دل گرفتگی سے دیکھتی رہیں اور اپنے ہاتھ
مسلی رہیں۔

☆☆☆

”نہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ابھی میرا
گر بوجہ نش مکمل ہونے میں دو سال باقی ہیں اور
آپ کہہ رہی ہیں سب ادھورا چھوڑ چھاڑ کر شادی
کر لوں، کیوں؟ کس خوشی میں؟“ وہ متوجش
نگاہوں سے ماں کا حکم سن رہی تھی، اسے اب بھی
اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا بڑا فیصلہ
یوں اچانک اس کے ماں باپ کر دیں گے، وہ
ان کی اگلی اولاد تھی، ان کی نظر میں بیٹی کی ذرا
اہمیت نہ تھی۔

”اپنے پاپا کی خوشی کی خاطر۔“ وہ ضبط
کر کے مختصر آویں۔

”پلیز ماما ایسا نہ کہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا،
میں اپنی پڑھائی مکمل کروں گی پھر جاب اور پھر
شادی کے متعلق سوچا جائے گا۔“ اس کا لہجہ اٹل
اور ضدی تھا۔

”الفت! زندگی بہت مختصر ہے اور تمہارے
منصوبے بہت طویل۔“ انہوں نے آہ بھری۔

”میں نے ایسی کون سی انہونی بات کر دی
پڑھائی ہی مکمل کرنے کو کہا ہے؟“ وہ زچ ہو گئی۔

”لوگ اچھے ہیں، تمہارے پاپا کی عدن
خالہ نے رشتہ بتایا ہے ہم ان سے پہلے تمہاری
پڑھائی کے متعلق بات کر لیں گے تم شادی کے
بعد بھی اپنی پڑھائی مکمل کر سکتی ہو، پڑھائی ہی
کرنی ہے نہ، ہو جائے گی وہ بھی مکمل، بس اپنے
پاپا کی فکر دوں میں مزید اضافہ نہ کرو، وہ چاہتے
ہیں اپنی زندگی میں تمہاری خوشی دیکھ لیں، تم اچھی
طرح جانتی ہو وہ دل کے مریض ہیں۔“ ان کا
لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”جانتی تو میں اور بھی بہت کچھ ہوں۔“ اس

ابھی تو رات ڈھلنی تھی ابھی تو پھول کھلنے تھے
ابھی تو رات ڈھلنی تھی ابھی تو زخم سلنے تھے
ابھی تو سر زمین جاں پہ اک بادل کو گھراتا تھا
ابھی تو وصل کی بارش میں ننگے پاؤں پھرنا تھا
ابھی تو کشتِ غم میں اک خوشی کا خواب بونا تھا
ابھی تو سینکڑوں سوچی ہوئی باتوں کو ہونا تھا
ابھی تو ساحلوں پر آگ ہوائے شاد چلتی تھی
ابھی جو چل رہی ہے یہ تو کچھ دن بعد چلتی تھی
”میں چاہتا ہوں تین جلد سے جلد اپنے
پیروں پر کھڑا ہو جائے اور کاروبار سنبھال لے،
اب جسم و جاں میں وہ طاقت نہیں رہی، تین کی
پڑھائی مکمل ہونے میں ابھی ایک سال باقی ہے،
اس دوران اگر الفت کا کہیں بہتر جگہ رشتہ ہو
جائے تو دونوں فرائض سے فارغ ہو جاؤں گا۔“
وہ کچھ سوچتے ہوئے شرجیل کیمیر لہجے میں
بولے۔

”اللہ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی
زندگی دے، جب اللہ چاہے گا سارے کام اپنے
وقت پر ہو جائیں گے، آپ فکر نہ کریں اپنی صحت
پر توجہ دیں۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ بیگم صاحبہ، لیکن آپ
بیٹی کی ماں سمجھی ہیں، جتنی جلدی اس فرض سے
سبکدوش ہو جائیں تو اچھا ہے کل کی کیا خبر کیا ہو
جائے، زندگی اور موت بے شک اللہ کے ہاتھ
میں ہے لیکن کوئی نہیں جانتا نصیب میں کیا لکھا
ہے، اس گھر کی چھت تلے اور کتنی زندگی نصیب
میں لکھی ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، آپ عدن
خالہ سے بات کریں شاید ان کی نظر میں الفت
کے لئے کوئی اچھا رشتہ ہو۔“ ارجمند نے افسردگی
سے شرجیل کی طرف دیکھا وہ اس پابست بھرے
لہجے میں جیسے درد کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی، لیکن پھر
کچھ کہہ نہ سکی، بس شرجیل کو چھت کو چپ چاپ

کے لہجے میں طنز ابھر آیا، نگاہ کے آگے رات کے پچھے ماما اور پاپا کی باتیں لہرانے لگیں، وہ پھر بھی ضبط کے ساتھ بیٹھی رہی، سوچ کے پردے پر وہی بار بار منظر اور دل میں ایک ہی خیال کہ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی سے زیادہ مشین کو سیشنل دیکھنے کی جلدی ہے۔

”کیا جانتی ہو؟“ بیٹی کی سرد نگاہ دیکھ کر وہ بے چلک انداز میں بولیں۔

”یہی کہ آپ کو میری خوشی عزیز نہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ چپا کر بول رہی تھی۔

”تمہارا ذہن کچا اور سوچ محدود ہے، انسان نیکی و بدی، خیر و شر کا مجموعہ ہے، اس کے ذہن میں بیک وقت دونوں باتیں آہی نہیں سکتیں تم زندگی کا وہ رخ دیکھ رہی ہو جہاں ابھی تمہیں خود کو حالات کو اور اپنے وقت کو مزید سمجھنے کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو وقت دو، تمہارے پاپا جتنے مردم شناس اور دور اندیش ہیں مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا، اپنے پاپا پر اعتبار کرو، ایک وقت آئے گا کہ تم خود ان کے فیصلے کی قدر کرو گی، کسی بڑے خیال کو یوں اپنے ذہن پر سوار مت کر لیا کرو۔“ الفت ماما کے سنجیدہ اور فطری لہجے کو کتنی ہی دیر ڈبڈبائی نگاہوں سے دیکھتی رہی شاید وہ خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ اس کی سگی ماں ہی ہے، پھر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا کچھ یوں اچانک آنا فانا اس کے ساتھ ہونے جا رہا ہے، وہ مستقل اپنے مہندی لگے ہاتھوں میں پہنی سرخ چوڑیوں کو دیکھ رہی تھی، ماہر بیویشن اب اس کے بالوں کو سنوار کر اختتامی شکل دے رہی تھیں، وہ اس وقت شہر کے ایک بڑے پارلر میں بیٹھی عروسی جوڑے میں ملبوس اپنے چہرے کا ایک عکس

بچانے کی کوشش کر رہی تھی، یہ وہی تھی۔ ہاں الفت..... جس کے چہرے نے کبھی کسی فاؤنڈیشن کو استعمال نہیں کیا تھا، ان لیوں نے خالی لب بام کے علاوہ کسی لب اسٹک کے احساس کو محسوس نہیں کیا تھا، اس کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ پندرہ دن پہلے ماما نے جس فیکل کوڈنر پر مدعو کیا تھا وہ اس کے ہاتھ میں اگلی پہنا کر قبولیت کی سند پیش دیں گے، وہ ایک کے بعد ایک خود پر گزر جانے والی ان حقیقتوں کو اب بھی فسانہ سمجھ رہی تھی، لیکن فسانہ یوں تو سچ حقیقت بن کر جھلکتا دکھائی تو نہیں دیتا ہے نہ..... یہ سامنے آئینہ جھوٹ کیسے بول سکتا ہے، وہ اپنی جھلک آئینے کے سامنے ڈبڈبائی نظروں سے دیکھ رہی تھی، پاپا کو فیکل ہر لحاظ سے مناسب لگی لڑکے نے لندن سے آنا تھا اور وہ ایک مہینے سے زیادہ چھٹی نہیں لے سکتا تھا، وہ لوگ شادی کا تقاضا جلد کر رہے تھے، ماما پاپا کو اس اکلوتے سیشنل لڑکے میں کوئی یہ ظاہر خافی نظر نہیں آ رہی تھی، فیکل بھی اچھی پڑھی لکھی تھی، پاپا نے اپنی بیماری کی وجہ سے شادی جلدی کرنے کی حامی بھری، یوں الفت کی ناراضگی اور فطری کو خاطر میں لائے بغیر ماما نے شادی کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں، ان کے خیال میں ماں باپ اولاد کے لئے زیادہ بہتر فیصلہ لے سکتے ہیں، وہ ناراض ناراض تو تھی لیکن نہ جانے کیوں بے حس بن گئی تھی خود کو حالات کے دریا میں اس نے چھوڑ دیا تھا، اب دریا اس کو کس سمت بہا لے جاتا ہے اسے اس بات کی پرواہ بھی نہ تھی، زندگی کا احساس دل میں ختم ہو گیا تھا، ماما جانتی تھیں چند دن کی یہ فطری خود بخود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدل جائے گی، سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سچ ہو جائے گا، وہ روز مشین کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ

کر و سامان ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی میں رکھواؤ،
تم ناشتے لے کر جاؤ گے، الفت کی دونوں خالہ زاد
کزنوں نے بھی ساتھ جانا ہے۔“

”میں..... نو ماما..... میں یہ سب ہینڈل
نہیں کر سکتا، آپ چلی جائیں نہ۔“ متین اپنی جگہ
سے اچھلا تھا۔

”بیٹا تمہارے پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور
ڈرائیور بھی کچھ دیر بعد چلا جائے گا اس کی بیٹی
بیمار ہے۔“

ماما کو فکر مند دیکھ کر متین نے جانے کی حامی
بھری، لیکن اس کا ہرگز موڈ نہیں تھا، وہ ماما کی
بات بھی نہیں ٹال سکتا تھا، یہ ان کا احسان تھا کہ وہ
اسے بالکل اپنے بیٹے کی طرح مان دیتی تھیں، وہ
جانتا تھا کہ بچپن میں وہ یتیم بن کر اپنے ماموں
اور ماما کے زیر سایے آ گیا تھا لیکن آج تک
انہوں نے اس بات کا اسے احساس نہیں دلایا، یہ
احسان اس کے دل و دماغ پر ہمیشہ حاوی رہتا تھا
اسی لئے وہ الفت کی کسی جارحانہ رویے کا برا
مانے بغیر انہیں کر کے آگے بڑھ جایا کرتا تھا، اس
نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”میرا اچھا بیٹا۔“ ارجمند نے محبت سے
متین کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا، وہ خور و نو جوان کی
شکل میں بالکل اپنے باپ سے مشابہت رکھتا تھا،
ارجمند نے بے اختیار نگاہ جھکا لی، اسے بازو بے
حد یاد آئے گی۔

”کیا ہوا ماما۔“

”کچھ نہیں۔“

”اچھا پھر میں چلتا ہوں اللہ حافظ۔“

متین ماما کی افسردگی بھانپ چکا تھا، شاید وہ
الفت کی وجہ سے خود کو تنہا محسوس کر رہی تھیں،
الفت کی دونوں کزنیں گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں،
سامان بھی ناشتے کا رکھوایا جا چکا تھا، ارجمند نے

کر کے آتیں، الفت نے ہمراہ جانے سے صاف
انکار کر رکھا تھا، ماما نے بھی زور زبردستی نہیں کی،
ایک خاموشی دونوں کے درمیان حائل تھی، کوئی
اپنا قدم آگے کی جانب نہیں بڑھا رہا تھا، ماما اور
الفت اپنی اپنی جگہ پر قدم جما کر کھڑے تھے، یہ
خود ساختہ ناراضگی دونوں کے درمیان نہ جانے
کب تک حائل رہنے والی تھی، اس وقت ماما اسی
بات پر مطمئن اور خوش تھیں کہ ان کی بیٹی اپنے
ماں باپ کے سائے میں رخصت ہو رہی ہے،
الفت پر روپ بھی خوب چڑھا تھا، سادہ سی رہنے
والی الفت پر نگاہ ہٹ ہی نہیں رہی تھی، سفید
شیر وانی میں لمبوس متین کی نگاہ میں سناکش تھی،
اس نے پھولے منہ کے ساتھ رہنے والی الفت کی
معصوم صورت کو سچا سنورا پہلی بار دیکھا تھا، اس
کی سرد نگاہ میں جو گھبراہٹ پانی تھا وہ رخصتی کے وقت
پاپا اور ماما سے لپٹ کر خوب برسنا تھا، وقت
رخصت الفت کی ساس نے الفت کو بہت مان
اور چاؤ سے تھام رکھا تھا انہوں نے ڈھیروں
تسلیاں دے ڈالیں، ماما اور پاپا نے قرآن کے
سائے میں الفت کو رخصت کیا۔

☆☆☆

حلوہ پوری، کچوریاں، نہاری، پرائے،
تاقان، ڈبل روٹی، انڈے، مکھن، دودھ، پھل،
مٹھائی کے ٹوکے پر نگاہ ڈال کر وہ ہر چیز کا
تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔

”لگتا ہے کل شادی میں آئی بارات کا ناشتہ
جارہا ہے۔“ متین ماما کو پہلی بار اتنا بوکھلایا ہوا
دیکھ رہا تھا، اس نے سب کی ایک خاش منہ میں
ڈال کر مسکرا کر ماما کو دیکھا تھا۔

”بیٹا لڑکی کی عزت ہوتی ہے بس کسی چیز کی
کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے، دیکھو دس بج رہے
ہیں، گھر پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا تم ایسا

”مطلب کیا ہے ان سب باتوں کا، آپ کو جو بات کرنی ہے صاف صاف کریں، پہیلیاں بھجوانے کی ضرورت نہیں۔“ متین کے بھڑکنے پر شرجیل نے اسے اشارے سے چپ رہنے کا کہا تو وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

”پہیلیاں ہی تو سلجھانے آئے ہیں بیٹے جی آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے ہم تو آپ کو معزز شریف اور خاندانی لوگ سمجھتے تھے لیکن آپ تو کنگے ہونے کے ساتھ ساتھ دھوکے باز بھی ہیں۔“

”زبان سنبھال کر بات کریں۔“ متین پاپا کی غیر ہونی حالت دیکھ کر انگلی اٹھا کر تنبیہ کے انداز میں پھر بولا، الفت کی ساس کا کرار انداز ان سب کے لئے نیا تھا، وہ تو بڑی محبت سے الفت کو رخصت کر کے لئے گئے تھے اور آج یوں صبح اچانک یہ کیسی افتاد آن پڑی تھی ان سب کے سروں پر..... ارجمند اپنا سر تھاٹے بھی تھی۔

”بیٹا یہ پوچھنے ہی تو آئے ہیں، اپنے گھر کے لوگوں سے پوچھیں..... اچھا بھائی صاحب یہ بتائیے تویر صاحب کو تو جانتے ہوں گے آپ۔“ شرجیل کا رنگ اڑنے لگا، وہ خود کو کسی بند کمرے میں محسوس زدہ محسوس کہہ رہا تھا، اسے سی کی کوئلنگ بھی اس کے شرابور جسم کو بھیجنے سے نہیں بچا رہی تھی۔

”بھائی صاحب آپ کے دوست تویر کا بیٹا میرے بیٹے کا کلاس فیلو تھا شادی پر آیا تھا اس نے بتایا کہ تویر صاحب آپ کے پارنٹر تھے، بزنس میں شدید نقصان کی وجہ سے آپ پر ان کے قرضے کے علاوہ بینک کا بھی لاکھوں کا قرضہ ہے۔“

”میں نے تویر کا قرضہ چکا دیا ہے اور اس سارے مسئلے سے اس رشتے کا کیا تعلق ہے آپ

الفت کو تاتھ لانے کی تاکید کی تھی، ولیمہ دو روز بعد تھا ایک الفت کے نہ ہونے سے گھر کتنا میاں سا لگ رہا تھا، وہ سوچ کر رہ گئیں۔

ابھی متین کو گئے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز پر وہ چونکی تھیں، یہ متین کی گاڑی کا ہارن تھا وہ لپک کر باہر کی جانب بڑھی تھیں، باہر متین کی گاڑی کے پیچھے الفت کے سرال والوں کی گاڑی بھی کھڑی تھی جس سے الفت کے ساس سرنگل رہے تھے، ارجمند نے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا تھا، ان کے چہرے بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔

”آئیے ہم آپ سے کچھ بات کرنے آئے ہیں۔“ حیران پریشان سی کھڑی ارجمند الفت کی ساس نے مخاطب کیا تھا ان کے پیچھے منہ لٹکائے الفت بھی کھڑی تھی، ان کا دل کسی انہونی کے خیال سے کانپ رہا تھا، لیکن چہرے پر یہ خیر مقدمی مسکراہٹ سجا کر وہ مہمانوں کو ڈرائنگ روم کی سمت لے آئیں۔

”ہمیں افسوس ہے ہمیں یوں اس طرح آنا پڑا، لیکن میرا بیٹا احمر کو اس بات کا شدید غصہ ہے کہ آپ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے، ہمیں اندھیرے میں رکھا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔“ ارجمند اپنے شوہر کے ہمراہ بیٹھی ان کے ماتھے کی سلوٹوں کو گہرا ہوتے دیکھ کر حیرانی سے بولی۔

”کیا یہ گھر آپ کا ہے؟“

”یہ گھر الفت کی دادی کا ہے۔“ شرجیل نے جواب دیا۔

”اور یہ پراپرٹی..... کیا یہ بھی۔“ الفت کی ساس کی تیوریاں چڑھ گئیں، ارجمند کا سانس اٹکنے لگا، متین ان کی بدلتی کیفیت کو دیکھ کر ہلچل کر بولا۔

اٹھا کر گزاری ہے، جیسے لڑکی آئی تھی ہم ویسے لے آئے ہیں، طلاقی کے کاغذات بن جائیں تو وہ بھی آپ کو مل جائیں گے، اس بات کو اب ختم ہی سمجھئے۔ وہ اپنی ساڑھی کا پلو ٹھہرے سے تھامے کھڑی ہو گئیں اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت کو ارا نہ کی، متین پاپا کے چہرے کو جھکا دیکھ کر ان کی طرف لپکا تھا۔

وہ صوفے کی ایک جانب لڑھک گئے تھے ان کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا فوراً میو لینس کو کال کی گئی، متین چیخ چیخ کر پکار رہا تھا ان کے ہاتھ پیر سہلا رہا تھا، ارجمند نے دیکھا شرجیل کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔

ہسپتال پہنچتے ہی موت و زندگی کی سس کمش میں مبتلا جسم سے روح کا رشتہ الگ ہو گیا، گھر میں کھرام برپا ہو گیا، متین ماما کو سنبھالتے سنبھالتے خود ہی ہلکان ہو رہا تھا، اس کے سر سے ایک بار پھر شفقت کا سایہ اٹھ گیا تھا، کوئی سلی، دلاسہ، ارجمند کے دل کو قرا نہیں دے رہا تھا، الفت کی نگاہ تو جیسے پتھر ہو گئی تھی، لوگ سن گئے لے کر اپنی اپنی کر رہے تھے، سب کی باتوں سے قطعی بے نیاز الفت سامنے بڑی باپ کی میت کو دیکھ کر اتنا بلک بلک کر روئی کہ متین اس کو دیکھ کر دکھ سے چور ہو گیا۔

☆☆☆

گیٹ سے خاکی لفافہ وصول کر کے وہ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا تھا، لفافہ چاک کر کے اس کا متین اسے پھر سے دکھ میں مبتلا کر گیا، کیسے بے حس لوگ تھے، اس گھر سے جنازے کو اٹھے پندرہ دن ہی ہوئے تھے اور ان لوگوں نے الفت کو آزادی کا پروانہ بھجوا دیا تھا، کوئی معذرت، کسی نے تعزیت کے دو جملے بھی فون کر کے نہ بولے، متین نے دل ہی دل میں

کی جوذیمائے ہے آپ وہ بتائیے، میں پوری کروں گا میں نے کسی چیز میں کوئی کسر نہیں اٹھائی آپ کو اعتراض کس بات کا ہے؟

”بھائی صاحب ہمیں اعتراض آپ کے دھوکے کا ہے یہ پراپرٹی بھی آپ کی نہیں ہے یہ گھر اور بزنس جس کی ملکیت کے آپ دعویدار بن رہے ہیں آپ کے بھانجے متین کا ہے، آپ اور آپ کی بیٹی کے حصے میں اس پراپرٹی کا کوئی حصہ شامل نہیں کیونکہ آپ نے اپنا حصہ بیچ کر تنویر صاحب کا قرضہ اتارا ہے اور اس وقت آپ کی مالی حیثیت زریو ہے آپ نے یہ بات ہم سے چھپائی ہے، ہمارے بیٹے گورشتوں کی کمی نہیں جو ہم لنگھوں میں اپنا رشتہ جوڑ کر خاندان میں اپنی ناک کٹواتے پھریں گے، وہ ہرگز ایسے گھر سے رشتہ قائم رکھنے پر راضی نہیں ہیں مجبور ہوں۔“ انہوں نے صاف اور تھیکے انداز میں بات ختم کر دی، متین ہکا بکا دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے جائیداد کے لالچ میں میری بیٹی سے شادی کرتی تھی اس بات کا اندازہ اگر مجھے پہلے ہوتا تو ہم بھی یہ شادی نہ کرتے لیکن اب شادی ہو چکی ہے یہ دو زندگی ہی نہیں دو خاندانوں کی عزت و رسوائی کا بھی معاملہ ہے۔“ ارجمند کا انداز التجائیہ تھا، دل و دماغ پر بھاری سل جیسے کسی نے رکھ دی تھی، سب کچھ بہ ظاہر اچھا ہوتے ہوتے ان کے ساتھ یوں برا ہو جائے گا خبر نہ تھی۔

”اب یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ لڑکے کا دل ہی راضی نہیں رات گھر پہنچتے ہی یہ بات جیسے ہی احمر کو اپنے دوست کے ذریعے پتا چلی اس نے رات ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا، وہ ایک ویل سیٹل بندہ ہو کر محسوس لوگوں سے رشتہ جوڑنے پر راضی نہیں ہے، ساری رات اس نے غصے میں آسمان سر پر

اور بروقار چہرے کو دیکھتی رہ گئیں، وہ خود ہاتھ
تھام کر ارجبند کو کھانے کی ٹیبل تک لایا تھا، مگر
میں کام کرنے کے لئے اس نے ایک ملازمہ اور
خانسامہ کو رکھ لیا تھا، کھانا میز پر جن دیا گیا تھا۔

”کیا آج بھی الفت کا کمرے سے نکلنے کا
ارادہ نہیں؟“ وہ الفت کی مخصوص کرسی کو خالی دیکھ
کر پانی گلاس میں اٹھیلتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”آج تمہارے پایا کو گھسنے چاہیے دن ہو
گئے ہیں اور وہ..... اس کی چپ ہے کہ ٹوٹنے کا
نام نہیں لیتی، میں ہی تو قصور وار ہوں، مجرم
ہوں..... اس کی..... جو کچھ ہوا میری وجہ سے تو
ہوا ہے۔“

”پلیز ماما آپ میرے لئے بہت قیمتی ہیں
خود کو سنبھالنے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

ملازمہ چاول کی ٹرے ہاتھ میں لئے داخل
ہوئی تو متین نے کھانا اپنے ہاتھ سے ماما کو نکال کر
دیا، وہ دونوں اب خاموشی سے کھانا کھا رہے
تھے، ملازمہ سے پوچھنے پر متین کو معلوم ہوا کہ
الفت اپنا کھانا پہلے ہی لے کر جا چکی تھی، وہ ایک
ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی کمرے کی چھت کو گھورتی
نہ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ متین جارحانہ انداز
میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا وہ ہڑ بڑا کر
سمٹ کر بیٹھ گئی، دروازے کی سمت متین کے وجود
کو اس نے سرد نگاہ سے دیکھا تھا۔

”کمرے میں داخل ہونے کے بھی کچھ
آداب ہوتے ہیں، یہ کیا طریقہ ہے کسی کے
کمرے میں داخل ہونے کا، ذرا تمیز نہیں ہے
آپ کو۔“

”تمیز کا ٹھیک تو آپ نے اٹھا رکھا ہے، کیا
آپ کو میرا پیغام نہیں ملتا تھا کہ کل سے کھانے کی

ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی، اب وہ یہ لفافہ لے کر
کہاں جائے، الفت نے خود کو اپنے کمرے تک
محدود کر لیا تھا اور ماما وہ بس صبح یا قرآن پڑھتی
رہتی تھیں روتی رہتی تھیں مگر پر جھانی افسردگی کے
اس ماحول میں پھینکا یہ پتھر ان غموں کو پھر سے
زندہ کر دے گا، یہ سوچ کر لفافہ مسمیٰ میں رہائے وہ
اپنے کمرے میں آ گیا اور لفافہ اپنی ایک فائل
کے اندر رکھ کر بند کر دیا۔

اس کے ایگزیم ہو چکے تھے، وہ اب اپنی
مکمل توجہ کاروبار کی طرف لگانا چاہتا تھا، متین
نے برنس کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور
باقاعدگی کے ساتھ فیکٹری جانے لگا، وہ صبح جاتا
اور رات گئے واپس آتا، ماما نے دیکھا کہ وہ ذمہ
داری سے برنس کے ساتھ ساتھ گھریلو امور پر بھی
توجہ دیتا ہے، ان کے دل میں اطمینان در آیا، متین
کی امانت اس تک پہنچانے کی شرجیل کو بھی جلدی
تھی، لیکن شرجیل ہی نہ رہا کہ دیکھتا کس طرح ذمہ
داری کے ساتھ متین کا رو بار سنبھال رہا ہے، اب
بس انہیں الفت کی فکر تھی، شاید انہوں نے اس کی
شادی کے معاملے میں جلد بازی سے کام لیا تھا
کاش وہ الفت کی بات سن لیتیں، اس کا کہنا مان
لیتیں تو آج یہ داغ اس کے آچل پر نہ لگا ہوتا،
لیکن قسمت کے کھیل کو سوائے اللہ کے اور کوئی
نہیں جان سکتا، کب کسی کی قسمت میں کیا لکھا ہوتا
باقی ہے یہ تو رب ہی بہتر جانتا ہے، انسان کا
ارادہ قسمت کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتا، وہ ہر لمحہ
خود احتسابی کی رسی پر چلتی رہتی تھیں خود کو پرکھتی
رہتی تھیں، بیٹی کی قسمت، اس کی تکلیف کو سوچ کر
اندرونی اندر مکمل رہی تھیں۔

”ماما چلیں آئیے کھانا کھاتے ہیں۔“ متین
کمرے میں داخل ہو کر بولا تھا، وہ اپنے ہی
خیالوں میں ملن صبح ہاتھ میں لئے متین کے منجیدہ

ٹیل پر ماما کے ساتھ بیٹھ کر آپ کھانا کھائیں گی۔“

الفت نے حیرت سے متین کے تحکم بھریے انداز کو دیکھا تھا وہ اس کے اس انداز سے قطعی ناواقف تھی، اس نے تو کبھی اس سے غصے کی حالت میں بھی اف تک نہ کہا تھا اور آج یوں حکم دینے والا انداز اس کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا، غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، اپنی ہنک محسوس ہونے لگی تو وہ ترخ کر بولی۔

”مجھے حکم دینے والے ہوتے کون ہیں آپ؟“

”دیکھو الفت ماما بہت پریشان ہیں، یوں خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھنے کے بجائے ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرو، ان کا دل بھی بہل جائے گا، وہ تمہاری وجہ سے فکر مند رہتی ہیں۔“ وہ اب نرمی سے بول رہا تھا۔

”ان کی فکریں مجھ سے نہیں آپ سے وابستہ ہیں اور آپ کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہیں، جہاں میرا تعلق ہے تو مجھ سے تو انہوں نے جان چھڑالی تھی، لیکن یہ میری بد قسمتی تھی کہ میں پھر..... میں ان کی بیٹی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، آپ ان کی سگی اولاد ہیں، میں ہوں سوتیلی، کیا سنگے رشتوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے، جواب دیں..... چپ کیوں ہیں..... بھینک دیا مجھے اٹھا کے..... میں بہتی رہی..... مجھے نہیں کرنی یہاں شادی..... مجھے پڑھنے دیں..... لیکن انہیں صرف آپ کو سہیل کرنا تھا، اتنی جلدی تو انہوں نے کبھی نیا جوڑا لینے میں بھی نہیں کی میں..... ان کی اولاد..... نہیں..... میں نہیں ہوں۔“ وہ اب ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی، متین گھبرا سا گیا تھا، وہ اس کی غیر ہونی حالت دیکھ کر ملازمہ کو آواز دینے لگا، کہ وہ پھر بلند آواز میں چیخی۔

”چلیں..... جائیں یہاں سے..... مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں..... جائیں یہاں سے۔“ الفت متین کا گریبان تھامے اسے اب دھکے دے رہی تھی، متین خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل گیا، وہ اپنی پیشانی کو مسلنے لگا، الفت نے اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے چیزوں کو پختا شروع کر دیا تھا، یہ اس کے اندر کا شدید اضطراب تھا، جو وہ اپنے کمرے کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر نکال رہی تھی، آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں، متین اس کے کمرے کے باہر کچھ دیر یونہی کھڑا سوچتا رہا، وہ اب دروازہ نہیں کھولے گی یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا، اسے اس کے حال پہ چھوڑ دینا بہتر تھا، یہی سوچ کہ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

تم مجھے کہیں رکھ کر بھول گئے ہو کاغذ کے ڈھیر میں ایک وزینگ کارڈ کی طرح

مجھے رکھ کر بھول گئے ہو

گھر کے فرنیچر، قالین، دیواروں پر لگی تصویروں کے ساتھ

تمہاری نظر مجھ پر سے بھی گزر جاتی ہے کسی بینک میں کھولے جڑوٹی اکاؤنٹ

بڑھی ہوئی کتاب، ادھ کھلی ڈائری کی طرح

میں بھی کہیں موجود ہوں

شاید مجھے بھول جانا ہی بہتر ہے

تاش کی ہاری ہوئی بازی

شطرنج کی بساط پر کھائی ہوئی

مات کی طرح

اس کی روٹی روٹی سرخ ڈوروں کی لالی اور گیلی پلوں کی جھلر بار بار اس کی سائیڈ ٹیل کا

سے بڑھ کر ایک کپڑوں کے ڈیزائن سلوائے گئے تھے۔

کچھ روز آیا فرینچر ملازمہ نے جھاڑ پونچھ کر رکھوا دیا تھا، وہ ایک ایک چیز پر اپنا ہاتھ پھیر کر محسوس کر رہی تھی، اس کے پاپا نے بڑی محبت سے اس کے لئے ہر چیز لی تھی، وہ گھنٹوں تلے پیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کے دماغ میں اب بھی احمر کے کہے جملے تازیانے کی طرح دماغ پر برس رہے تھے۔

”تم لوگ دھوکے باز ہو، فراڈ کیا ہے میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ، لاکھوں روپے کا قرض ہے اب بھی تمہارے پاپا کے کندھوں پر، او مائی گاڈ، کن فقیروں میں میری شادی ہو گئی ہے۔“

”او ہیلو، میں اپنی ہر چیز کے معاملے میں بہت چوڑی ہوں، اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کا معیار میرے لئے بہت اہم ہے اور تمہاری اوقات کیا ہے؟“ تو کیا وہ بھی ایک چیز ہے جس کا معیار اس کے اتنے عامیانہ انداز میں پرکھا تھا کہ اس کی شخصیت کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔

ہاں وہ ان سب رکھی ہوئی قیمتی چیزوں کی طرح ایک چیز ہی تو تھی اس کو اٹھا کر رکھنے میں اس کے ماں باپ نے بھی تو اسے مہلت نہ دی تھی۔

☆☆☆

ستین اپنے کمرے میں بیضالیپ ٹاپ گود میں رکھے تیزی سے اٹھیاں چلانے میں مصروف تھا کہ اچانک اسے چیخنے چلانے کی تیز تیز آوازیں سنائی دیں، اس نے تیزی سے لیپ ٹاپ آف کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا اپنی آستین اوپر چڑھائے دو کمروں کے بعد الفت کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، اس کے دماغ میں فوراً یہ خیال

تغائب کر رہے تھے جہاں وہ خاکی لفافہ رکھا تھا جو دس روز قبل اس کے کمرے میں نہ جانے کون رکھا گیا تھا، نہ جانے قسمت میں اس کے لئے اور کون کون سے دکھ اور اذیتیں لکھی ہیں جن کو پڑھنا ابھی باقی ہے، اس میں تو اب ان اذیتوں کو سہنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی، پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا، وہ زندگی کی طرف مڑ کر بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل میں ستین کے لئے نفرت اور بڑھتی ہوئی کس طرح پورے گھر پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا، وہ اب گھر کیلئے امور کے معاملات بھی طے کرنے پر قادر تھا، اسو جانی نے تو جیسے سیج پکڑ کر اپنے کمرے کا کونہ سنبھال لیا تھا، وہ اب ہر جمعرات کو درس پر بھیجی جانے لگی تھیں، عدت ختم ہونے کے بعد خاندان کے چند لوگ آئے تھے، شعاع بھی آکر اس کو کئی بار سمجھا چکی تھی، لیکن وہ اس دل کا کیا کرے جو ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا، بے مقصد سی زندگی میں اسے اپنے لئے روشنی کی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی، وقت کو جیسے تیسے وہ اپنی لاتعداد سوچوں تلے گزر ا رہی تھی، شعاع کا ہر دوسرے دن فون پر بھی تقاضہ تھا کہ وہ ایک بار پھر یونیورسٹی آکر اپنی پڑھائی مکمل کرے اس کا دل بہل جائے گا، جینے کا کوئی مصرف حاصل ہو جائے گا، وہ چپ چاپ اس کی ہر بات سن لیتی لیکن دل بجھا ہو تو قدم آگے نہیں بڑھ پاتے، پاپا کی اچانک موت سے وہ سنبھل ہی نہیں پا رہی تھی، شادی کا دن ہر لڑکی کے لئے کتنا اہم ہوتا ہے، وہ تو خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی ایک نئی زندگی کا آغاز محبت کے ساتھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کا استقبال تو نفرت نے کیا تھا اور دل کھول کر کیا تھا، ان سب باتوں میں اس کا کیا قصور تھا؟ اس کے بیڑ پر شادی کے تحائف اور جہیز کی چیزیں بھری پڑی تھیں، ایک

کیون کھڑی ہو، خوشیاں تو تمہاری زندگی میں آنا چاہتی ہیں لیکن تم خود ہی نہیں چاہتی۔“

”کون دے گا خوشی..... جواب دیں..... میری زندگی میں لگا داغ کون دھوئے گا، آپ دیں گے خوشی..... جواب دیں..... کوئی نہیں دے گا..... اور مجھے کسی بمبک کی ضرورت بھی نہیں ہے، مسٹر متین کہنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے، جائیں چلے جائیں یہاں سے۔“ وہ اس کی بات سن کر متوجس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بول رہی تھی، جس کا جارحانہ انداز اب ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا، وہ دیرے دیرے قدم اٹھاتا دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھ کر کچھ لمحے کھڑا رہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ارجمند نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے متین کی طرف دیکھا تھا جس کے ہاتھ میں ارجمند کی سیاہ ڈائری تھی، وہ سیاہ ڈائری بنا کچھ کہے بول رہی تھی، آنسو اپنی پوری رفتار کے ساتھ اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے، وہ کچھ بھی تو کہنے کے قابل نہ تھیں، متین انہیں جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ خاموش تھیں۔

”بس..... اب نہیں۔“

متین نے ان کے دونوں نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے کہا، ان ہاتھوں کی لرزش متین اپنے مضبوط ہاتھوں میں محسوس کر رہا تھا۔

”تمہارا یہ احسان۔“ وہ کہتے کہتے پھر سے رونے لگیں۔

”ماما! پاپا کے کندھوں پر اب کوئی قرضہ باقی نہیں، میں نے ان کے اکاؤنٹ بھی کلیئر کروا لئے ہیں، یقیناً ان کی روح اب خوش ہو رہی ہوگی، اب آپ بھی سکون کے علاوہ کچھ نہیں سوچیں گی، میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے، آپ دونوں کی

کوندا کہ الفت پھر سے فرمشین کا شکار ہو کر کمرے کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رہی تھی، اس کے کمرے کا دروازہ اپنا ہاتھ بڑھا کر دھکیلنا چاہا تو وہ خوش قسمتی سے لاک نہیں تھا اور کھلتا چلا گیا۔

افت فرش پر بیٹھی ٹوٹے گلاس کے کاغچ کے ٹکڑے سے کھیل رہی تھی، غدا حال بے جان وجود کی متوجس آنکھیں کاغچ کے ٹکڑے کو پھیلی سے مسلتے ہی لگی تھی کہ متین نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی کلائی مضبوطی سے تھام کر کاغچ کا ٹکڑا احتیاط سے اس کے ہاتھوں چھین لیا، الفت نے چیل کی طرح اسے جھپٹ کر دھکا دینا چاہا تو متین نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے چہرے پر جڑ دیا، ایک زنانے دائرہ چھتر کی آواز کمرے میں گونجی تھی، وہ اب مکمل حواس میں گالوں پر ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔

”رک کیوں گئے، ماریں اور تھپڑ ماریں، ماریں..... مارتے کیوں نہیں۔“ وہ پھر سے جنونی ہونے لگی۔

”ہوش کرو الفت، ورنہ ایک اور تھپڑ مار کر دماغ درست کر دوں گا۔“

”کرو..... سب مل کر میرا دماغ درست کرو، مارو مجھے، قسمت کی مار کھا رہی ہوں، کیا فرق پڑتا ہے، اب مجھے کسی مار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مارو مجھے۔“ وہ چہرہ چمپا کر اوپچی آواز میں رونے لگی، متین اس کے پھرے بال زرد چہرہ دیکھ کر افسردگی سے اپنی ہاتھیاں بھینچنے لگا اور اس کے قریب گھٹنوں تلے بیٹھ کر نرم لہجے میں بولا۔

”آئی ایم سوری، لیکن خود کو دیکھو، ماما کو دیکھو، اب ختم کرو یہ سب، باہر نکلنا کہ اس فرمیشن والے ماحول سے خود کو نکال سکو، قسمت کو قصور وار نہ ٹھہراؤ، جو ہوتا تھا ہو چکا ہے اب آگے کی طرف دیکھو، ابھی پوری زندگی پڑی ہے راستہ روک کر

اس سے ہمدردی میں شادی کر رہا تھا، ایک بار پھر وہ اپنی زندگی تباہ ہونے نہیں دے گی، اموجان تو پہلے بھی اسے ہی اہمیت دیتی تھیں اور اب..... اب تو جیسے ہر چیز سے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے تمام ذمہ داریاں اس کے سپرد کر ڈالیں تھیں۔

”کیسی غلط فہمی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بہتر ہے آپ اپنی تمام غلط فہمی دور کر لیں۔“ وہ اپنے موبائل پر کسی کو میسج کر رہا تھا کہ الفت کی جارچانہ آواز آئی، وہ اس کے سر پر کھڑی برس رہی تھی، اور وہ اپنی جگہ سے ٹس سے ٹس نہ ہوا تھا۔

”مجھے اموجانی سمجھنے کی غلطی مت کیجئے گا، میرے اوپر آپ کا رعب چلنے والا نہیں، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“

”زیادہ دن نہیں رہیں گی آپ اپنی مرضی کی مالک، ایک ہفتے بعد ہمارا نکاح ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے، میں سیریس ہوں۔“

”آپ بھی سن لیں میں آپ کے لئے سیریس ہوں۔“ وہ اب اس کی آنکھوں میں ڈائریکٹ چھانک رہا تھا، اس کے لہجے کی مضبوطی سے وہ شیشانے لگی۔

”میں سب جانتی ہوں آپ یہ سب اس دن میرے کپے جملوں کی زد میں آکر ہمدردی کی بناء کر رہے ہیں وہ تو میں نے جذبات میں آکر کہہ دیئے تھے اس میں میرا ذاتی ارادہ ہرگز شامل نہیں تھا۔“ وہ زچ ہو کر بول رہی تھی۔

”آپ یہ خوف ہیں..... میں نہیں۔“ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور گاڑی کی چابی جیب میں ڈال کر آگے بڑھ گیا، وہ اس کی نگاہ کی

محتبوں کا قرض ہے مجھ پر اور میں بس اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ دھیمہ اور مضبوط تھا۔

”تم نے تو میرے سارے فرائض ادا کر دیئے، تمہاری ماں بہت اچھی عورت تھی، اس نے اپنے بھائی کی شادی مجھ غریب سے کر دی، میں تو کسی قابل نہ تھی۔“

”نواما! ایسا نہیں ہے، آپ کی خوبیاں دیکھ کر ہی ماما نے یہ فیصلہ کیا ہوگا، میں جو کچھ بھی ہوں وہ آپ کی ہی تربیت کا نتیجہ ہے، میں جو فیصلہ کروں گا آپ یہ مست سوچیں مجھے اس پر کوئی ملال ہوگا، مجھے لوگوں کو پرکھنا آتا ہے۔“ متین مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔

”اے اس خوبی سے میں ناواقف ہوں، تم بالکل اپنی ماں کی طرح ہو، وہ بھی لوگوں کو پرکھنا خوب جانتی تھی بس میں ہی.....“ وہ دلگرفتی سے بولیں۔

”آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے۔“ وہ ان کی آنکھوں میں چھانک رہا تھا۔

”خود سے زیادہ ہے بیٹا۔“

”پھر میرا یقین کر لیں۔“ ارجمند نے اس کی نگاہ میں دیکھا جہاں بڑے عزائم پوشیدہ تھے، ارجمند نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆☆

”آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے اور میں آپ کی غلط فہمی درست کرنے آئی ہوں۔“ الفت نے جو سنا تو خود کو قابو میں نہ رکھ سکی، اس دن جو کچھ جذبات میں آکر اس نے متین سے کہا تھا اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ہمدردی میں آکر اموجانی سے زندگی بھر تعلق جوڑنے کی بات کر لے، وہ اس سے تعلق جوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اسے شدید نفرت تھی ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، جو

رہے تھے، اپنے کاروبار میں انہیں شدید نقصان اٹھانا پڑا، ان کے دوست کو ملک سے باہر سیٹل ہونا تھا، وہ اپنی رقم طلب کر رہے تھے، پاپا کو مجبوراً حالات سے تنگ آ کر اپنے حصے کی جائیداد گروہی رکھنی پڑی، بینک کا لون نہ دینے پر بڑھتا چلا گیا انہوں نے اپنی مکمل توجہ عارش انکل کے بزنس کی طرف کر لی اور بینک کا لون آہستہ آہستہ چکانے کی کوشش کرنے لگے، قرضوں کے بوجھ تلے وہ دل کے مریض بن بیٹھے تھے، ان کا کچھ بھی اپنا نہ تھا، جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، سب کا مالک متین تھا، اس کی امانت وہ اس تک جلد پہنچانا چاہتے تھے۔

شاید اسی وجہ سے انہیں بیٹی کی شادی کی جلدی تھی، اپنی بیماری کی نوعیت سے وہ واقف تھے، ناواقف تھی الوقت تھی، گھر کے حالات سے تابلد الفت کے سینے پر بھاری بوجھ در آیا تھا، ڈائری نے سارے پردے چاک کر دیئے تھے، پھر الفت نے کانپتے ہاتھوں سے وہ سفید لفافہ اٹھایا جو ڈائری پڑھنے کے بعد متین نے اسے دیا تھا، اندر خوشبو میں بسا ایک گلابی صفحہ تھا، وہ صفحہ کھول کر پڑھنے لگی۔

محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو

کرتلی کو بے بسی سے دیکھتی رہی، اچانک متین نے پلٹ کر اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے لی، سیاہ ڈائری دراز سے نکال کر اس نے جارحانہ انداز میں اس کی ہتھیلی پر رکھی تھی۔

”یہ ڈائری آپ کی اموجانی کی ہو سکتا ہے، آپ کے دل میں جتنے شکوے اپنی ماں کے لئے موجود ہیں وہ دھل جائیں اور اگر شکوے دھل جائیں اور دل صاف ہو جائے تو پھر یہ لفافہ کھول کر پڑھئے گا، آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں، کسی بات کے لئے پابند نہیں، آپ کو اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے، میں نے جو فیصلہ کیا تھا سوچ سمجھ کر کیا تھا اس میں آپ کی کبھی اس دن کی باتوں کا یا پھر کسی ہمدردی کا شائبہ تک نہ تھا، میں آپ کے تیج کا انتظار کروں گا، مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔“

وہ سیاہ ڈائری اسے تھا کر جا چکا تھا، وہ اس کی پشت دیکھتی رہی، پھر سیاہ ڈائری کو عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ڈائری کا ہر ورق اس کی ماں کی زندگی کا مانی دھار رہے تھے، اس کی ذہن کی اسکرین پر جیسے منظر چل پھر رہے تھے، وہ متین سے اتنی محبت کا اظہار کیوں کرتی تھیں، الفت کو اپنے لئے وہ محبت کیوں نظر نہیں آتی تھی وہ سب کچھ پڑھتی چلی گئی، کچھ باتیں ہماری لاشعور میں ایسی بسی ہوئی ہیں کہ ہم ان کے آگے مجبور اور بے بس بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے ماں کے لاشعور میں بھی کچھ باتیں خوشبو کی طرح بسی تھیں اور وہ ان کے آگے مجبور اور بے بس تھیں، اس کے پاپا نے عارش انکل کا بزنس اپنے بزنس کے ساتھ سنبھالا تھا وہ دونوں طرف توجہ نہیں دے پا

”مجھے تم سے محبت ہے۔“ الفت نے
موبائل سینے سے لگا کے اس کے حق میں فیصلہ
دے کر خود سے سرگوشی میں بولی۔
”اور شاید مجھے بھی۔“

تو یہ محرم نہیں ہوتا
محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت
ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب
- ☆ خمار گندم
- ☆ دنیا گول ہے
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلے
- ☆ نگری نگری پھر اسافر
- ☆ خط انشائی کے
- ☆ بستی کے اک کوچے میں
- ☆ چاند نگر
- ☆ دل وحشی
- ☆ آپ سے کیا پردہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

- ☆ قواعد اردو
- ☆ انتخاب کلام میر

لاہور اکیڈمی، چمک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز 7321690-7310797

وہ دوبار سے پڑھ چکی تھی، ہاتھ میں تھاے
گلابی صفحہ لئے وہ سوچتی رہی کہ اسے ستین کی نگاہ
نام دیتی پھر وہ تو ہمیشہ اسے دھکاری ہی آتی ہے،
پھر یہ سب کیا تھا، کتنے ہی لمحے پوں ہی خاموشی
سے سرک گئے اور وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پارہی
تھی، وہ اس کے حق میں کیا فیصلہ دے، ہاں.....
ناں، اچانک اس کے موبائل پر اس کی مخصوص
ٹون بجی، اس نے اپنا موبائل اٹھا یا میج آیا ہوا تھا،
ان باکس میں جا کر اس نے میج کھولا، یہ ستین کا
نمبر تھا۔

آنکھوں میں جو خواب ہیں ان کی باتیں کرنے دو
ہونوں سے وہ لفظ کہو جو کا جل کہتا ہے
موسم جو سندیسہ لایا اس کو پڑھ تو لو
سن تو لو وہ راز جو پیاسا ساحل کہتا ہے
اس کے لبوں نے نرم مسکراہٹ کو چھوا تھا جو
بڑی گہری اور معنی خیز تھی، الفت نے اپنی
مسکراہٹ دانتوں تلے ہونٹوں کو دبائے موبائل
پر پہلائے کا آپشن دیا تھا، پھر دل کا سائن متین
کے نمبر پر پہنچ دیا، ایک لمبی اور گہری سانس لے کر
اس نے گھڑکی کے پار گہرے کالے بادلوں کو
دیکھا تھا، کئی دنوں سے موسم جس زدہ تھا، آج یقیناً
بارش کھل کر پیاسی زمین کو سیراب کر دے گی، وہ
کچھ سوچ کر مسکرا دی، موسم کی پہلی بارش کی
پھنوار اس کا چہرہ بھگور رہی تھی اور پھر اس نے مٹی
کی سوندھی خوشبو کو گہری سانس لے کر اپنے اندر
بی متین نوشاداب کیا تھا، موبائل کی ٹون پھر بجی
تھی، ستین کا میج تھا۔

موئے ہو گئے اب جا کے آرام آیا، اماں جی نے بھی مونگ پھلی پہ جو ہاتھ صاف کیے کھانسی نے تو انہیں پکڑ ہی لیا، ایسا سانس بند ہوتا ہے کہ سوچ نہیں سکتا اگلا سانس آئے گا بھی یا نہیں۔

یہ دیکھیں اماں جی کو پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے، میں چلتی ہوں انہیں دیکھوں، بہت حالت خراب ہو جاتی ہے ان کی، چلیں ٹھیک ہے باقی کی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

خدا حافظ

صبا

پیارے رامش!

پھولوں کا موسم ہو خوشبوئیں چار سو ہوں پھر کیوں نہ کچھ لکھنے کو جی چاہے، مارچ کے مہینے میں ہر چیز اچھی بھلی اور ٹھیک ٹھاک لگتی ہے، اماں جی اور اماں جی بھی اچھے بھلے ہو گئے ہیں، اماں جی روزانہ اخبار پڑھ کر شہر کی سیر کو نکل جاتے ہیں، اماں جی بھی روزانہ پودوں کو پانی دے کر گرے ہوئے موتیا، چنبیلی اور گلاب کو اکٹھا کر کے ہمارے کمرے میں رکھ جاتی ہیں، دونوں کی صحت اچھی ہو گئی ہے آج تو اماں جی نے کہا تھا وہ آتے ہوئے تازہ سموے لائیں گے اور اب دروازے پہ دستک ہو رہی ہے، شاید اماں جی سموے لے آئے ہوں، میں دروازہ کھولوں جا کے، چلیں ٹھیک ہے باقی کی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

خدا حافظ

پیارے رامش!

جنوری دروازے پہ آیا ٹھہرا ہے، بنے سال کے ساتھ سردی بھی شہر میں آن چکی ہے، ہر طرف دھند کا بسیرا ہے، تیز ہوائیں بھی سردی کا خوب ساتھ دے رہی ہیں ایسے میں آپ کے اماں ابانے تو لفافوں سے خوب دوستی کر چکی ہے، صبح شام بستر ہی میں رہتے ہیں، خشک میوہ جات سے خوب صفایا کرتے ہیں خصوصاً مونگ پھلی اور اخروٹ کی تو شامت آئی ہوئی ہے اور کشمیری قہوہ بھی خوب چل رہا ہے، الے لوا اماں جی نے پھر آواز دے لی، شاید انہیں پھر سے کشمیری قہوے کی طلب جاگ اٹھی، چلیں ٹھیک ہے باقی کی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

خدا حافظ

تمہاری بیوی

صبا

پیارے رامش!

فروری کا مہینہ شروع ہو گیا ہے مگر سردی میں مجال ہے جو رتی برابر بھی کی آئی ہو، ٹھنڈک نے چار سو قبضہ جما رکھا ہے، اب کے بار تو پہاڑوں پہ بھی جیسے برف آن جی ہے، سارے شہر کے لوگوں نے چادروں کی بھل مار رکھی ہے، چہرہ نکا ہوتا نہیں تیز سردی چڑھتی نہیں اور پھر تو بخار کا پوچھتے ہی مت نمونیا ہو کر رہی رہتا ہے، اماں جی کو خنڈ لگ گئی تھی ایسا بخار ہوا کہ نمونیا کا لبادہ پہن لیا، ڈاکٹروں کے چکر لگا لگا کے ہم سب آدھ

تہنہاری بیوی
صبا

پیارے رامش!

گر میاں شروع کیا ہوئیں ہر بندہ حال سے
بے حال نظر آتا ہے، بجلی کی تو آپ کو پتہ ہے آتی
کم ہے جاتی زیادہ ہے اور اگر بھول کر آئی جائے
تو نہ ہونے کے برابر، ایسے میں فریج کیا خاک
حلے ہیں روزانہ بازار سے برف لانی پڑتی ہے
شکر ہے اباجی روزانہ یہ فریضہ سرانجام دے لینے
ہیں، اماں جی تو ٹھنڈے پانی کے بتابات بھی نہیں



ہوں۔

اللہ حافظ

تمہاری بیوی

صبا

پیارے رامش!

عید آئی گزر گئی، اباجی کی تمام دوست ہمیشہ کی طرح نماز پڑھتے ہی سیدھے ہمارے ہاں آ گئے، اماں جی نے ہمیشہ کی طرح سویاں، شیر خورمہ اور کھیر بنا کے ان کے سامنے رکھ دی مگر اس دفعہ اباجی نے انہیں دوپہر کا کھانا کھائے بغیر اٹھنے نہ دیا، سارا دن خوب رونقیں لگی رہیں، اماں جی کی بھی تمام دوستیں سہیلیاں دو دن تک آئی رہیں تیسرے دن اماں جی اور اباجی ان لوگوں کے گھروں میں گئے، خوب مٹھائیاں اور کیک لے کر گئے، آپ کو تو پتہ ہے اباجی کو شوگر ہے، مٹھائی تختی سے منع ہے، مگر عید کے ان تین دنوں میں انہوں نے کوئی پرہیز نہ کیا اور شوگر ہائی کر لی اب ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں، اماں جی ساتھ ہیں انہوں نے بھی اپنا بلڈ پریشر چیک کرانا تھا، کافی دیر ہو گئی ہے ابھی لوٹے نہیں، میں ذرا باہر جا کے انہیں دیکھ آؤں، چلیں ٹھیک ہے باقی باتیں اگلے خط میں کروں گی اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

خدا حافظ

تمہاری بیوی

صبا

پیارے رامش!

بقرعید میں کچھ ہی دن باقی ہیں اماں جی کی خواہش ہے دو بکرے لیں جبکہ اباجی تیل پہ بھند ہیں، آپ کو تو پتہ ہی ہے جیتنا آخر اماں جی نے ہی ہے آج آئیں یا کل آئیں آنے بکرے ہی ہیں اباجی پچھلے دس دن سے بکرہ منڈی جا جا کر

کرتیں اب بھی جلے پیر کی ملی کی مانند برآمدے اور صحن میں چکر کاٹ رہی ہیں اب جب تک برف نہیں آ جاتی انہوں نے پانی نہیں پینا، اباجی نجانے آج اتنے کیوں لیٹ ہو گئے ہیں دیکھو ذرا، چلیں ٹھیک ہے باقی باتیں اگلے خط میں کروں گی اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

خدا حافظ

تمہاری بیوی

صبا

پیارے رامش!

اس دفعہ تو روزے سخت گرمی میں آ گئے ہیں، پانی بجلی کا بھی مسئلہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے روزہ رکھ کے اندر گھسا جاتا ہے نہ باہر ٹھہرا جاتا ہے، باہر تپتی لواندر حد درجہ جس ہر ذی روح بے چین اور بے قرار نظر آتا ہے، روزہ رکھنے کی وجہ سے اماں جی کی صحت کافی گری گری رہنے لگی ہے مگر میرے اور اباجی کے منع کرنے کے باوجود وہ روزہ نہیں چھوڑ رہیں، حالانکہ پرسوں بلڈ پریشر بھی لو ہو گیا تھا، اللہ اللہ کر کے روزہ اختتام تک کو پہنچا، اباجی نے اگلے روزے پہ انہیں اٹھنے سے منع کیا تو وہ بگڑ گئیں کہ مرنی مر جاؤں گی روزہ نہیں چھوڑوں گی اباجی اور میں ناچار چپ ہو گئے، اباجی کی پرزور فرمائش پہ میں پلوٹے روزانہ بناتی ہوں، اباجی خوب دل لگا لگا کر لھاتے ہیں (یہ اور بات روزوں میں بھی کہہ کر ڈنڈی بھی مار جاتے ہیں)

اماں جی کے لئے فروٹ چاٹ نہ بناؤں تو ان کا منہ بن جاتا ہے کہ انہیں چٹا چاٹ کے بغیر افطاری ادھوری لگتی ہے، اب بھی چولہے پہ پالانے کے لئے چنے رکھے ہوئے ہیں، اوہ پریشر مگر کی سیٹی بج گئی، چلیں ٹھیک ہے باقی کی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک

مرغالانے کا کہتی ہیں کہ اس میں سے کم از کم کانٹے تو نہیں چٹنے پڑیں گے تا مگر اباجی کا اپنا شوق، اب دیکھیں پھٹی لاکر اماں جی کے سامنے رکھ دی جس پہ وہ ناک بھوں چڑھاری ہیں، میں چل کے انہیں دیکھتی ہوں، چلیں ٹھیک ہے باقی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

اللہ حافظ

تمہاری بیوی

پیارے رامش!

میرا کیا پوچھتے ہو، دسمبر آچکا ہے، سردی نے زور پکڑ لیا ہے، بارشوں نے دروازوں کے پار جیسے ڈیرا ہی جمالیا ہے اور ہوائیں تو کھڑکیوں پہ قبضہ جمائے بیٹھی ہیں میرا اور تمہارا کمرابرف جیسا ہوا چاہتا ہے اور بستر کا تو حال دسمبر سا ہے، خاموش سہج، تنہا اور غمزدہ

ہاں رامش بھی حال میرا ہے اور یہی باقی کی بات ہے، پچھلے چار سالوں چھ مہینوں تین ہفتوں اور پانچ دنوں سے میں ایسے ہی ہوں، ایسے ہی گزر رہی ہے میری، بہت رہ لیا ہے تنہا، بہت جی لئے پردیس، اب اور نہیں، چلے آؤ رامش دسمبر آ گیا ہے، یہ کمرہ تمہارا بلارہا ہے لوٹ آؤ رامش دسمبر تمہیں بلارہا ہے، میں تمہیں بلارہی ہوں، میرا دل تمہیں بلارہا ہے، باقی والی باتیں یہی ہیں اور میں تمہارے بغیر نہ کبھی ٹھیک کبھی اور نہ کبھی ٹھیک ہو سکتی ہوں، لوٹ آؤ رامش، تمہاری صبا اور یہ دسمبر تمہیں بلارہے ہیں۔

☆☆☆

خوار ہو رہے ہیں نہ اچھے کمرے مل رہے ہیں نہ بیل بھی آج اماں جی کو جوش چڑھا تو وہ ساتھ ہو گئیں، یقیناً وہ کہیں نہ کہیں سے چھان پھٹک کے دو بکرے لے ہی آئیں گی، اے لواماں اباجی دونوں آگئے ان کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں، ٹھہریں میں پوچھ کے آتی ہوں، کیا ہوا، یہ خالی ہاتھ کیوں ہیں؟

ہاں تو پوچھ لیا بلکہ وہ جو لینے گئے تھے لے کر ہی آئے، اس دفعہ دونوں نے اپنی اپنی خواہش پوری کر لی ایک بیل دو بکرے پچھلے گھن میں بندھ بھی گئے ہیں اب میں نے انہیں چارہ ڈالنا ہے، چلیں ٹھیک ہے باقی باتیں اگلے خط میں کروں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور میں ٹھیک ہوں۔

اللہ نگہبان

تمہاری بیوی

صبا

پیارے رامش!

سردیاں پھر سے شروع ہو گئی ہیں اماں جی نے تمام لحاف اور کبل نکال کر دھوپ میں سینکنے کے لئے ڈال دیئے ہیں، یوں تو دن کو دھوپ ہی ہوتی ہے البتہ شام کو کافی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔

دن پر لگا کر اڑ رہے ہیں، جب کہ راتیں ٹھہر ٹھہر کر گزر رہی ہیں، رات کو چلتے پھنکوں کی اسپینڈ کم کر دی گئی ہے، لیکن پچھلے پہر تو ٹھیکے بند کر دیئے جاتے ہیں پچھلے پہر سردی بڑھ جاتی ہے نا، اکتوبر کا آخر اور نومبر کا آغاز یوں ہی مست مست سا ہوا کرتا ہے، اباجی کا پھٹی کھانے کو روز جی کرتا ہے جی ہفتے میں آج چوتھی بار پھٹی ہونیں گے، اباجی پھٹی ہی لینے گئے ہیں، یوں تو اماں جی بھی پھٹی کا خاصا شوق رکھتی ہیں مگر کانٹے جن جن کر ان کا سارا شوق ہوا ہو جاتا ہے وہ روزانہ اباجی کو دیکھی



شناکول

پارک میں گھومنے جانا چاہتی تھی، ہر وقت کی روک ٹوک نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

وہ غصے سے سوچی موبائل اٹھا گئی، آج کل ہر کسی کا فوٹو فیس بک آن کیا، ہنسی مسکراتی تصویریں زندگی سے بھر پور لوگ کتھن سلیبی انٹرینٹ اس کا دماغ کچھ بھر میں فریس ہو گیا، کبھی جہازیں آن لائن آیا۔

”ہائے کیا کر رہی تھی۔“ میج موبائل کی اسکرین پر چکا۔

”کچھ نہیں۔“ اداسی سے ٹاپ کیا۔

”او۔“ سیڈی تصویر اسکرین پر ابھری وہ مسکرائی اور اگلے میج نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

”مجھے لگتا تم بھی مجھے یاد کر رہی تھی۔“

”تم بھی مطلب۔“ دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”میں تو تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔“ اس کا دل رک سا گیا بے اختیار اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”کیوں؟“

”پتہ نہیں، جب سے تم سے چٹ کرنا شروع کیا ہے ہر لمحہ بس تمہارا ہی خیال رہتا ہے، دل کہتا ہے اس کے بال ایسے ہونگے اس کے ہونٹ گلابی ہونگے اس کی آنکھیں شاید براؤن ہونگی۔“ میج پڑھتی وہ خود سے شرمائی۔

”سوری میں فری ہو رہا ہوں مگر کیا کروں مجھ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔“ موبائل پر میج چکا۔

آسمان کے پہ چمکتا چاند اسے آج بڑا چپ چاپ لگا، اس نے نہایت اداسی سے اسے دیکھا۔

”کیا زندگی کی اداسی چاند کو بھی اداس کرتی تھی۔“ اس نے تعجب سے سوچا، پھر سر جھکتی بیڈ پہ آ بیٹھی۔

آج اسے جان سے پیاری دوست عنایا کی سالگرہ تھی جس پہ اسے جانے کی اجازت گھر والوں نے نہیں دی وہ ہمیشہ اس کے ساتھ یہ ہی کرتے تھے۔

بچپن سے لے کر اب تک ضرور یہ ہی جملہ ہوتا تھا اس کے بابا احمد یار کا۔

”آخر کیا ضرورت ہے دوستیاں کرنے کی یا ان کے گھر جانے کی۔“ اور اس کی ضرورت ہے کا جواب وہ چاہ کر بھی نہ دے پائی، باقی رہی تھی کسراں پوری کر دیتی۔

”زندگی دوپٹہ لو، زندگی نقاب کر دو، زندگی ہنسومت، زندگی خود کے علاوہ کسی پہ اعتبار مت کرو، زندگی کسی کے ساتھ فری نہ ہوا کرو۔“ زندگی زندگی زندگی اسے اتار دو کاٹو کا جانا کہ اسے لفظ زندگی تک سے نفرت ہو گئی۔

وہ اکثر سوچتی کاش وہ اسی گھر میں پیدا نہ ہوتی کسی جھوپڑی میں پیدا ہو جاتی پر یہاں نہیں۔

وہ آزادی سے سانس لینا چاہتی تھی ہنسا چاہتی تھی دوستوں کے گھر جانا پارٹیز کرنا دوپٹہ کے ساتھ بازار جانا رات کو آٹسکریم کھانے یا پھر

”نہیں تم کہو۔“ اس نے جیسے اجازت دی،

ہاں اجازت ہی تو دی خود کو بے مول کرنے کی
اجازت ہی تو دی خود کو لٹنے کی، اجازت تو دے
دی اس نے مگر کیا صحیح کیا۔

”تم میرے خیالوں سے نکلتی ہی نہیں۔“

اقرار ہوا وہی اقرار جو قیس بک کی دنیا کی زینت
تھا جو ہر بربادی کی جڑ تھا جو شیطان کا پھینکا پتا تھا
جو بربادی کی شروعات تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں سب کچھ عجیب
لگ رہا ہے مگر۔“ اتنا کہہ کر اسکرین تاریک ہو گئی



جاتا ہے۔

”مجھے کیا ہوتا ہے۔“ چڑ کر کہا۔

”تم آج کل کچھ بدلی بدلی سی رہتی ہو۔“
کھوجتی نظروں سے پوچھا۔

”اماں میری جاسوسی کرنا تو اب آپ چھوڑ
ہی دو۔“ دل کا چور چھپانے کو وہ مصنوعی سا غصہ
کرتی اٹھ گئی، پیچھے ماں کی کھوجتی نظروں نے دور
تک اس کا تابق کیا۔

☆☆☆

فیس بک۔

”کیا تم بھی میرے لئے وہی محسوس کرتی
ہو جو میں تمہارے لئے کرتا ہوں۔“
”یہ نہیں۔“ وہ ہچکچائی۔

”کیا مطلب۔“ بے تابلی و حیرت سے
پوچھا۔

”جہانزیب تم کیا کرتے ہو۔“ اس نے
بات بدلی۔

”تم سے محبت۔“ شیطان نے محبت کا تیر
پھینکا۔

”بس کرو۔“ اس نے سرخ ہوتے چہرے
سے ٹاپ کیا۔

”تم مجھے تڑپانا بس کرو زندگی۔“
”میں کہہ رہی تڑپانی ہوں جان تو آپ کی

باتیں نکال لیتی ہیں میری۔“ اس نے اقرار کیا۔
یوں جیسے ہتھیار ڈال دیئے ہوں، شیطان

نے قبضہ لگایا۔
”تو تم مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔“
”اقرار بھی تو نہیں کیا۔“

”مجھے شرم آتی ہے۔“
”اقرار کرتے شرمایا نہیں کرتے۔“

”مگر۔“

صرف سکرین نہیں شاید اس کی تصویر بھی۔
اس نے بڑبڑاتی سے موبائل کھولائیں بک
یہ اس کی آئی ڈی دیکھی، جہاں پہ وہ لاگ آؤٹ
کر گیا تھا، وہ منہ بتاتی انھی بے اختیار آئینے کے
سامنے آکھڑی ہوئی۔

دھڑکتے دل چلتے جذبات کے ساتھ، میج
کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

دل کہتا ہے اس کے بال ایسے ہونگے، اس
کے ہونٹ گلابی ہونگے، اس کی آنکھیں شاید

براؤن ہونگی۔
اس نے اپنے لمبے سلکی بالوں کو پھو پھراپنے

ہونٹ اور اس کے بعد اپنی آنکھوں کو چھوئی وہ
سمٹ کر رہی تھی۔

زندگی میں جیسے ست رنگی پہاڑی آگئی،
محبت کی دیوی اس پہ مہربان ہونے لگی مگر کیا واقعی

محبت کی دیوی۔
محبت کیا ہے، فیس بک کی دنیا میں وقت

گزاری، انٹرنیٹ کی رنگینی میں بربادی
اور تحریروں کی دنیا میں ست رنگی تلخی جینے کی وجہ۔

اور حقیقت میں صرف بربادی، کیونکہ محبت
صرف وہ ہے جو مرد صرف اپنی بیوی سے کرتا ہے

شادی کے بعد باقی سب وقت گزاری ہے،
شیطان کی چال۔

فی الحال جو بھی تھا شیطان اپنی چال چل
چکا تھا، بنت حوا جس میں پیر رکھ کر خود کو دنیا کی

خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی تھی مگر کب
تک۔

”زندگی کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو۔“ اماں نے
حیرت سے اس کے چہرے کے چمکتے رنگوں کو

دیکھا۔
ماں اور بیٹی کا بڑا عجیب رشتہ ہوتا ہے اور

بیٹی کی دھڑکنیں رہ بدلتی ہیں اور ادھر ماں کو پتہ چل

حشر میں اور اس نے کہہ دیا کہ اے انسان وہ تو تیرے ماں باپ سے تھے انہوں نے تیرے کچھ غلط کیا بھی تھا تو تیرے ہاں سے تیرے بدلے میں پوچھتا مگر تو نے صبر نہ کر کے خود کو خود ہی دنیا اور آخرت میں رسوا کر لیا اور تب ہم کہہ کریں گے، انسان کو دنیا میں سب سے لڑنا چاہیے مگر ماں اور باپ سے کبھی نہیں کیونکہ جو ان سے لڑتا ہے وہ خود اپنے اچھے نصیب سے لڑ کر اسے گنوا بیٹھتا ہے، مگر کیا ہم بھگنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

☆☆☆

مسلسل دودن جہانزیب آف لائن رہا اور ان دونوں میں وہ لمحہ لمحہ مرمر کے جیتی رہی اور پھر بالآخر تیسرے دن وہ آن لائن آیا۔

”تم کہاں تھے زیب، تمہیں پتہ ہے میں پاگلوں کی طرح موبائل کو دیکھتی رہی ہوں تمہیں میری ذرا پرواہ نہیں۔“ شدت جذبات سے میج ٹاپ کرتی وہ ردی، اس کی بے قراری محسوس کرتا شیطان ہنسا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سی بات۔“ وہ بھی نہیں۔

”تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے جیسے ہار مان کر اقرار کیا۔

”ہاں کیا؟“ وہ انجان بنا۔

”ہاں میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”کتنی؟“

”پتہ نہیں۔“

”کیا کر سکتی ہو میرے لئے۔“ اسے آزمایا

اس نے۔

”کچھ بھی۔“ اس نے لکھا۔

”کچھ بھی۔“ اس نے اسے پکا کیا۔

”اگر مگر کچھ نہیں اب تم مجھ سے صرف اس وقت بات کرو گی جب اظہار کرنا ہو۔“ موبائل اسکرین پھر سے تاریک ہوئی۔ زندگی دل موسوں کر رہ گئی، وہ فیس بک سے لاگ آؤٹ کر گیا تھا۔

”زندگی بیٹا! چاول کھالو۔“ اماں پلیٹ اس کے سامنے رکھی مڑ کر پوچھی اور حنا کو چاول پلیٹوں میں نکال کر دیئے لگی۔

”مجھے نہیں کھانے ابلے ہوئے پھیکے چاول۔“ منہ بنایا۔

”زندگی! شکر کر یہ ہی اللہ نے دیا تو ہے ورنہ ہمارے گناہ جتنے ہیں نا وہ یہ بھی نہ دیتا تو پھر۔“

”اماں کون سے گناہ ہم کون سا ہر وقت معاذ اللہ گناہ کرتے ہیں۔“

”معاذ اللہ زندگی کیا کہہ رہی ہے ارے کس وقت ہم گناہ نہیں کرتے جھوٹ بولنا چٹلی کرنا غیبت کرنا، رب کی بنائی چیزوں پہ نام رکھنا نماز نہ پڑھنا اور۔“

”اماں بس کر، تو اماں ہے تو اماں ہی رہ

مجھے اچھا برا نہ بتا۔“ وہ ہاتھ نہائی بولی۔

”میں نہیں بتاؤں گی تو کون بتائے گا۔“ وہ

زخمی سے بولیں۔

”اماں آپ نے نہ میرا جینا حرام کر دیا ہے

اس سے بہتر تھا کہ میں پیدا ہی نہ ہوئی۔“ غصے

سے کہتی وہ اپنے کمرے میں مہس لگی، وقت نے

نہایت اداسی سے جنت کی آنکھوں میں آنسو

دیکھے۔

”کاش ہم اپنی ماں کے سامنے چیخنے

چلانے یا غصہ کرنے سے پہلے چند لمحے کو روک کر

سوچیں، کہ اگر وہ ہمارے ساتھ غلط کر بھی رہے

ہیں تو اللہ پاک کے سامنے جب ہم حاضر ہو گئے

”کچھ بھی۔“ اس نے اظہار کیا۔

”یاد رکھنا پھر۔“

”مجھے یاد ہے گا۔“

”تم نے کھانا کھایا۔“ جہانزیب نے

پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”تم آن لائن نہیں ہو رہے تھے تو پریشانی

میں۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”چلو اب کھالو ورنہ بیمار ہو جاؤ گی۔“

”تم نے کھالیا۔“

وہ کیا کہتی کہ کھانے کو کچھ ہے ہی نہیں اسی

لئے بات بدلی۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”تم سے بات کرنا تو ہی چین ملتا۔“

”اتنی محبت کرتے ہو۔“ وہ حیران ہوئی۔

”خود سے بڑھ کر۔“

”شادی کرو گی مجھ سے۔“ اس نے ایک دم

ٹائپ کیا۔

”کیوں؟“

”کیوں کیا مطلب محبت کرتے ہو تو کیا

شادی نہیں کریں گے۔“ تیزی سے میسج کیا۔

”مذاق کر رہا تھا۔“ ہنسی ہوئی تصویر

ابھری۔

”بتاؤ تا۔“ وہ بے چین ہوئی۔

”صرف تم سے کروں گا۔“ اس نے تشکر

بھری سانس لی۔

”کہاں رہتے ہو؟“

”ماڈل ویلو، تم۔“

”نینسی۔“

”سنو۔“

”کہو۔“

”میں تم سے اب مزید دور نہیں رہ سکتا اسی

لئے۔“ وہ رکا اسے بے چینی ہوئی۔

”اسی لئے کیا؟“

”میں تمہیں اپنی امی سے ملوانا چاہتا ہوں،

اصل میں میری امی تھوڑی سی نفاست پسند خاتون

ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر والوں کو بتائے

بنا پہلے ایک بار میری امی سے مل لو میں چاہتا ہوں

جب وہ تمہیں پسند کر لیں تب تم اپنے گھر والوں کو

میرے بارے میں بتاؤ۔“

”پہلے کیوں نہ بتاؤں۔“ اسے الجھن سی

ہوئی۔

”اگر میری امی نے تمہیں پسند نہ کیا تو تم

سب کی نظروں میں مذاق بن جاؤں گی جو میں

نہیں چاہتا۔“

”مگر میں۔“

”محبت کرتی ہوتا تو اک موقع دو مجھے تمہیں

اپنانے کا۔“

”اوکے۔“ اس نے جیسے ہار مان لی۔

”تم کل رات نو بجے نینسی کے قریب جو

پارک ہے وہاں آ جانا میں تمہیں وہاں سے لے

جاؤں گا اور دس بجے تک تم واپس گھر چلی جانا۔“

اس نے سارا پلان بتایا جسے وہ مان گئی اب

اسے بے چینی سے کل کا انتظار تھا، وہ کل جو اس کی

زندگی بدلنے والا تھا۔

اگلے دن وہ جلدی اٹھ گئی کمرے سے نکل

کمرھن میں آئی تو پہلی نظر برگر کے نیچے پڑے

تخت پہ بیٹھی دادی پہ پڑی دوسری نظر حن میں

جھاڑ دیگانی اماں پہ پڑی۔

”جی پو علی اندر سے سکول جانے کے لئے

بیک لے کر نکلے اماں نے مڑ کر اسے پکارا۔

”زندگی آج میری کمر میں بہت درد ہے تو

وہ باہر نکل آئی، رات کی تاریکی تڑپ چمکتے چاند نے اسے روکنا چاہا مگر گرجا بڑا سا کت سا اس نادان سی لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا۔

تاریکی چینی، اے نادان لڑکی تو عزت ہے اس گھر کی اس گھر کو برباد نہ کر، دلہیز پار کرتے ہوئے دلہیز جی اٹھی۔

اے نادان لڑکی اگر آج تم نے یہ دلہیز پار کی تو مڑ کے نہ آسکو گی اور وہ باہر نکل آئی، فیس بک کی محبت کا ہاتھ تھمائے گھری کھائی میں تاریک گھری میں جہاں یہ اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا اور دو دن بعد اخبار میں اک خبر لگی وہی جو ہر ہفتے مہینے بعد لگتی ہے، عام اور معمولی سی خبر، جس خبر سے نہ روح کا پنے نہ دل رکے نہ ہی انسانیت جاگے وہ عالم اور معمولی ہی ہوتی ہے بیکاری خبر۔

ماڈل ٹاؤن کے پارویرانے میں ایک لڑکی کی برہنہ لاش برآمد ہوئی جسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ اے نادان لڑکی، تم مان ہو یقین ہو عزت ہو،

اپنے گھر اپنے ماحول کی اس لئے تمہارا ہر قدم سوچ کر سوچ کر اٹھے۔

☆☆☆



ذرا انہیں سکول تک چھوڑ آ۔“

”اماں دو گھنٹیاں چھوڑ کر تو ان کا سکول ہے خود اکیلے چلے جائیں گے ویسے بھی کوئی بچے نہیں یہ آٹھ دس سال کے ہیں خود جاسکتے ہیں۔“

”بات قریب یا دور یا چھوٹا بڑا ہونے کی نہیں ہے بات احتیاط کی ہے میرے یا تمہارے بابا کے پاس ہے ہی کیا تم لوگوں کے سوا، تم نہیں جانتی کہ تم لوگ اس گھر کی عزت ہو ہمارے جینے کی وجہ ہو اگر تمہیں سے کسی کو کچھ ہو گیا نا تو ہم تو جیتے جی مرجائیں گے، ویسے ہی آج کل حالات ایسے نہیں ہیں۔“

”اماں جاتی ہوں۔“ منہ بتاتی وہ چپل پہن کے آگے بڑھی۔

”زندگی کتنی بار کہا ہے لڑکی کی عزت اس کی چادر اور نقاب میں ہوتی ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوتا بس بندہ خود صحیح ہو۔“

”بات ہمارے صحیح ہونے کی نہیں ہوتی بات سامنے والے کی نیت کی ہوتی ہے اگر بنا پردے کے عورت کی عزت محفوظ ہوتی نا تو اللہ پاک عورت کے پردے کا حکم نہ دیتا، ویسے بھی ہمیں کیا پتہ کہ کسی پل کس کی نظر ہمیں دیکھ کے خراب ہو جائے کچھ پتہ نہیں چلتا، اپنی حفاظت خود کو چھپا کر کرنی پڑتی ہے مگر تم ہو کہ سمجھتی نہیں۔“

اور اے کاش وہ اس پل سمجھ جاتی مگر شاید شیطان کی بچھائی چال بہت مضبوط ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی پھلتی ہی اس نے اپنا سفید انیمیر اڈری والا سوٹ پہنا، ریڈ لپ اسٹک لگا کے بال بتائے کلائیوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں پہنی اور دوپٹہ خود پہ اڑھتے لمحے بھر کو اس کے ہاتھ رکے اس نے مڑ کر چار پائی پہ بڑی چادر اٹھا کر اپنے ارد گرد اچھی طرح اوڑھ لی، آہستہ آہستہ چلتی

سردار سردار احمد کا کہر

سیما بنت عاصم

جب جاگ پڑے وہ صبح کو اک گھیر خاموشی کے ساتھ۔
 ہر دکھ یا رب سو جایا کرے
 وہ سندر پھولوں جیسا ہے
 کوئی دکھ نہ اس پہ آیا کرے
 ارم پیلس کے سیاہ داخلی دروازے کے اس
 پار زندگی فجر کے کچھ دیر بعد مسکرا پڑتی، داخلی
 احاطہ کے دفنی جانب چھت کو جاتا زینہ جس کے
 ہر در سے پرنسرخ خوش رنگ پھولوں سے سجے
 گملوں کی قطار تھی، اسی زینہ تلے میرے اکلوتے
 لائق و فائق بیٹے ارمغان سپد کی سرخ آلتو آفس
 فائلز کے علاوہ نظر آتی ارم پیلس کی اندر کی جانب
 کھٹنے والا جالی کا دروازہ، وا ہوتا تو دفنی جانب
 مختصر مگر اسٹاکش کچن جو میری بہو سحر کی اعلا
 درجے کی ہنرمندی، سلیقہ و صفائی پسندی کا منہ
 بولتا آئینہ دار تھا، سامنے کی جانب دو بیڈ رومز،
 جن میں سے ایک ان کا اپنا جبکہ دوسرا میرا تھا اور
 دفنی جانب ڈرائنگ روم تھا۔

بچے دو ہی اچھے اور اتنے اچھے کہ اب تک
 ان کا بیڈ روم الگ کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی
 تھی، درمیان میں لاؤنج جو بیک وقت ڈائننگ
 اور بی وی روم کا کام دیتا۔
 اس گھر کی زندگی بڑی گلی بندھی، منظم اور
 خاموش تھی، دن کا آغاز یکے بعد دیگرے بھتی
 گھنٹیوں، الارم و ہارن کی آوازوں سے ہوتا اور
 ان تمام آوازوں سے مختلف قیاس آرائیاں،
 جوڑتی میں اس ماحول کا حصہ رہتی تو وجہ صرف اور
 صرف اس گھر کا لگا بندھا معمول سکوت و ٹھہراؤ۔

سب سے پہلے ہانکر سائیکل کی گھنٹی بجاتا
 اخبار ڈالتا گزرتا، سحر ڈسٹ بن اٹھا کر صدر
 دروازے کے اس پار رہتی، واپسی میں اس کے
 ہاتھ میں تازہ اخبار جو اگلے پل اس کی نرم مدھم
 مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے ہوتا، اس کے
 کچن کا رخ کرنے کے کچھ دیر بعد الیکٹریک لٹل
 کا شور، ٹوسٹر کی کلک، جو سر مشین کا شور، یعنی بچوں
 کا ناشتہ ارمغان کا جوس تیار، بچوں کی تیاری ان
 کے کمرے میں ہوتی، ناشتہ لاؤنج کی ڈائننگ پر،
 فضا میں کلگری کا معمولی سا ردھم اور پھر کچھ دیر
 بعد اسکول وین کا ہارن، فضا میں وہی خاموشی،
 ٹھہراؤ اور سکوت، ارمغان کی آمد، اس کا ناشتہ اور
 پھر تیاری۔

سب اسی مدھم، معمولی، نپی تلی آوازوں
 کے ساتھ، اس کے جاتے ہی ماسی کی آمد، ادھر
 ادھر کی کھٹ پٹ، کچن میں لٹخ کے لئے سحر کی



تیار، بچوں اور پھر ارمغان کی آمد، شام کی
 آؤنگ ڈنر، اک عجیب لگا بندھا خاموش سا
 ماحول تھا، کوئی ہنگامہ خیزی و افراتفری، دنوں
 میرے کان ترستے کوئی تو ہو جو دو گھڑی میرے
 پاس بیٹھ کر میری بھی سنے مگر نا، اس کی بندھی
 زندگی میرے لئے کسی کے پاس وقت ہی نہ تھا،
 شاید اس لئے کہ میں کہیں نہیں تھی۔
 اک ریٹائرڈ لائف اک عرصہ ہو گیا ہے،
 جو سینئر ٹیچر سے، پرنسپل کے عہدے تک، اک
 وقت گزارا تھا، جبکہ میرے رشتے حیات، اک

شپنگ کمپنی سے ریٹائرڈ تھے۔

ساس بہو میں سے ایک فریق اگر اسی غیر جانبداری کو اختیار کر لیں تو ساس بہو کی جنگ ہی ختم ہو جائے۔

یہ وہ وقت تھا جب وہ مجھے کچھ وقت دیتی اور ان تھوڑی سی باتوں میں، میں نے جانچا، کہ وہ یقیناً اک سادہ معصوم اور خیال رکھنے والی لڑکی ہے اور یقیناً محبت کیے جانے کے قابل، میری نظر میں۔

محبت کا فارمولا بہت آسان اور سادہ سا ہے، جو محبت کرنا جانتے ہیں، وہ محبت پا بھی لیتے ہیں اور سحر کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہوا تھا، مگر وہ جو میرا خیال تھا کہ سحر کے میری زندگی میں آنے سے میری تنہائی مٹ گئی، اب میرے گھر آگن میں رونق چکرا اور کچھ عرصہ بعد قلقاریاں گونجیں گی، خام ثابت ہوا، گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سحر مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی اور اس کی ذات، لگتا سارے زمانے کا ٹھہراؤ، سکوت، خاموشی، ٹھنڈک، اور دھیمپن اس میں آن سب ہے، اس کے پاس کرنے کو بہت سے کام تھے، مگر اسی خاموشی و سکون کے ساتھ اور وہی دھیمپن، اور ٹھہراؤ اس گھر کے ماحول میں بھی آن بسا یوں نہ تھا کہ وہ کسی فالتو رزے کی طرح اک کونے میں ڈال کر مجھے بھول گئی تھی یا کہیں بھی کسی طرح مجھے روکیا کرتی۔

مگر میں نے بتایا تا میں نے از خود غیر جانبداری کی پالیسی روا رکھی، وہ میرا خیال بھی رکھتی مجھے اور میری بات کو اہمیت و ادویت بھی دیتی تھی، مگر اس کے پاس میرے لئے وقت نہ تھا اور یہ نظر بھی آتا تھا مگر میری زندگی اک یکسانیت و جود کا شکار تھی، تنہائیوں اور خاموشی کے بڑھتے ڈستے ناگ، گھر کا لگا بندھا خاموش دھیمپن، ٹھنڈا ماحول، مجھے تنہا کر جاتے تھے۔

میں اپنا دکھ سکھ کس سے کہوں، کس سے اپنا

میں نے پیسہ کو ہمیشہ پیسہ سمجھا اور ہمیشہ اہم ضروریات کے لئے اسے ہوا، دکھائی، سو آسودگی میرے گھر کی باندی رہی ارمان سید اور سدرہ امی میرا کل اثاثہ ہیں جن کی تعلیم و تربیت کے لئے، میں نے دن رات ایک کیے رکھا، نتیجتاً وہ آج اپنی زندگیوں میں کامیاب و آسودہ ہیں، دیکھا جائے تو راوی میرے لئے چین ہی چین لکھتا تھا، کامیاب، خوش و خرم، آسودہ حال، زندگی۔

سحر سے ارمان کی شادی، لو میرج تھی، گو کہ اس وقت میں ارمان کی شادی کے موڈ میں نہ تھی، ابھی اس نے تعلیم مکمل کر کے پروفیشنل لائف میں قدم رکھا ہی تھا، اسے اسٹبلش ہونے میں کچھ وقت درکار تھا، گو کہ میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، میرے اور میرے شوہر کے تمام فنڈز رجبوئی گنڈ ڈیہ پاؤت میں جمع تھے۔

یہ خاصا وسیع و کشادہ اسٹبلش مکان میرا اپنا تھا، اس کے علاوہ بھی جو کچھ اثاثہ تھا اس میں میری دونوں اولاد برابر کی حصہ دار تھی، سدرہ کی شادی سے میں فارغ ہو چکی تھی، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کام کا اک وقت ہوتا ہے اور جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ہزار ویسے بن ہی جاتے ہیں سو سحر کے معاملہ میں بھی یہی رہا، میں نے ارمان کی شادی کے لئے بڑے خواب دیکھے تھے، مگر شاید اس طرح، اک بہترین لڑکی ڈھونڈنے کی دوسری سے بچ گئی تھی، مجھے اعتراف ہے وہ اک بے مثالی لڑکی تھی، اس نے اس گھر کو ذمہ دار بہو کی طرح، گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال کر مجھے بالکل فارغ کر دیا تھا، شاید اس لئے کہ میں نے بھی گھر کی راجدھانی مکمل اس کے حوالے کر کے اک گوشہ سنبھال لیا تھا۔

”بیٹا اچھا نہیں لگتا؟“ میری وہی ہمیشہ کی جھجک۔

”بس پھر وہی پرانے دور کی پرانی باتیں۔“ اس نے کتنی بار کہا، وہ آپ کے بیٹے ہیں داماد نہیں، اور بیٹے کے گھر آ کر رہنے کے لئے آپ کو کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے، سمجھیں آپ۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن۔“ جواباً وہی اس کا نان اسٹاپ اور دو ٹوک انداز۔

”بس مجھے آپ کی ایک نہیں سنی، آپ تیاری پکڑیے، اس سنڈے میں اور اسد آپ کو لینے آرہے ہیں اور اگر آپ نے واپسی کا نام بھی لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، کان کھول کر سن لیں آپ۔“ اس کا انداز اتنا سخت اور دو ٹوک تھا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

☆☆☆

اس کے گھر کی صبح بھی خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ اک عجیب پیچم پکار، افراتفری کا ساما حول اور وہی گھٹیاں سیٹیاں، ہارن، الارم، ساتھ سدرہ کے رواں تیرے منہ پھٹ انداز، اونچی بوڑھائیں، ڈراوے، تکرار۔

”اف تو بہ، یہ گھر ہے کہ اک عذاب، مجال ہے کہ اک آواز میں کوئی سن لے، اے تومیہ اتنی دیر سے الارم بج رہا ہے اور تم عذیر کاٹوں میں روٹی ٹھونس رکھی ہے کیا بتائے دیتی ہوں اٹھی تیل سے پہلے ہی اٹھ جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ الیکٹریک ٹھیکل کی گھنٹی بجی تھی، ساتھ جوسر کی پرسوز آواز، سدرہ کی آواز دب گئی۔

اور لہجے جناب عذیر صاحب بستر سے اٹھے اور تومیہ غرغرا آپ سے ہاتھ روم، ادھر اسد کی واک سے آمد اور اک نیا شور جاگ اٹھا، کسی کی یونیفارم پر بس نہیں تھی، چھوٹی کاٹ میں پڑی رو رہی تھی اسی افراتفری کے دوران سدرہ ہاپتی کا پتی تازہ

آپ شیر کروں میرے اندر خاموشی کا یہ سحر نیچٹا طوفان۔

اف خدایا، میرے کان صرف گھڑی کی ٹک ٹک یا پھر ان بے در بے بختی سیٹوں، گھنٹیوں، ہارن کی آوازوں سے آس پاس سانس لیتی، زندگی کی نوید دیتے اور میں یوں ہی اک گوشہ میں ان آوازوں سے منظر بنتی، تشکیل دیتی رہ جاتی۔

اس سب میں..... میں کہاں تھی؟ شاید کہیں نہیں؟

اور یہیں آ کر میری تنہائی..... بڑھ جاتی۔ اور خاموشی سوا..... محسوس ہوتی

☆☆☆

”آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر میرے گھر آ جائیں، مگر آپ میری مانتی ہی نہیں، جانے کون سے مردے وہاں کڑے ہیں جن کی قبروں پر صبح وشام دیئے جلانے ہیں آپ کو۔“

اسی شام میری بیٹی سدرہ نے فون پر میری خبر لی تھی، وہی اس کا رواں انداز ولہجہ۔

”میں نے بھی تمہیں ہزار بار بتایا ہے، وہ اپنی دنیا میں مست و مکن ہیں تو میں ان کی خوشی میں خوش ہوں بس بل دو بل کوئی تو میری سننے والا ہو۔“

”تو آپ سے کس نے کہا ہے کہ ان سے امیدیں باندھے، یا ان کا انتظار کیجئے، بھی نہیں اپنی دنیا میں مست و مکن رہنے دیجئے، آپ کا خیال رکھنے کے لئے ہم لوگ کم ہیں کیا؟“

”خیر میں نے ایسا تو کوئی شکوہ بھی تم سے نہیں کیا؟“

”اوہو ماما، مجھے معلوم ہے، سحر لاکھوں میں ایک بہو ہے، مگر میرے پاس آ کر رہنے کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری تو نہیں۔“

”میں سمجھی مر گئے، فاتحہ تک پڑھ لی تھی۔“

اور اب ان کی تکرار جاری ہو گئی اس نے اولاد کی سائیڈ لی اور نشانہ بنا۔

”اسد یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے نہ تم اولاد کی حمایت لے کر سر چڑھاتے نہ ان کے مزاج آسان کی سیر کرتے۔“

”کیا کروں، ایک ہی تو بیٹا ہے لاکھوں میں ایک۔“ اس نے دانت دکھائے۔

”اور بیوی، کیا بیویاں دس بیس پال رکھی ہیں۔“

”اوی اللہ۔“ میری آنکھیں چو پٹ کھل گئیں۔

”ہائے یہ نہ تھی ہماری قسمت۔“ اسد نے چڑایا۔

”اسد میں تمہیں اٹھا کر شیخ دوں گی۔“ وہ نہ جانے کتنی بار یونہی کسی کو چٹختے کسی کو الٹا لٹکانے کی دھمکی دیتی۔

”حد ہوتی ہے۔“ میں جھلائی، ادھر پروا کسے تھی۔

”مت بھولا کرو، میں بھی کسی کی اولاد ہوں جا کر بیٹھ گئی نا، اپنے میکے تو چار دن میں تارے نظر آجائیں گے۔“

بقیہ کی آواز سکول دین کے شور میں دب گئی، اور وہ جس کی اولاد تھی وہ اسی طرح اک گوشہ میں گم صم بیٹھی سوچتی رہ گئی، کہ شاباش سدرہ کی فرائے بھرتی زبان کو دی جائے یا ان سب کے اعلا درجے کی، بے شرعی و ڈھٹائی کو۔

ان ہی ٹھنڈیوں، سیٹیوں، ہارن کے اختتام پر وہ سب سدھار گئے اور پھر ماسی کی آمد اور سدرہ کی وہی شعلہ بیانی۔

”آگئیں تم، میں تو سمجھی گزر گئی۔“ ادھر وہ بھی شاید اس فرائے بھرتی زبان

اخبار اور بیڈٹی میرے سر ہانے رکھ کہ یہ جاوہ جا۔
ٹومیہ کی یونیفارم پر لیس کرتے ہوئے سدرہ کی زبان تیز گام کی رفتار سے چل رہی تھی، اس بار نشانہ ستم اسد کی معصوم ذات تھی۔

”آگئے تم، اور پیٹھ گئے ہوں گے اخبار میں منہ دے کے ذرا پروا نہیں اس آدمی کو، مگر اور اولاد کی، سارے عذاب اک میرے ہی سر پہ ہیں، کبھی تو میری کسی بات پہ کان دھر لیا کرو، ارے ٹومیہ کو دیکھو وہ ہاتھ روم سے نکلی کہ نہیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے، اسکول دین آنے والی ہے، چھوٹی کوڈا کر میں بٹھا کر اک بسکٹ پکڑا دو۔“ اس نے جانے سنا کہ نہیں، مگر یونیفارم پر لیس ہو گئی تھی، سدرہ کی اگلی جھلاٹک بچ باکس کی تیاری کے لئے، پھر پکن میں، بچے، کمرے سے برآمد ہوئے اور اک اور شور مچا، کسی کو جس درکا تھا تو کسی کو ناشتے میں پراٹھا درکا تھا اور سدرہ کا پارہ آسان پہ۔

”آف یہ اولاد، کسی دن اپنا پاس کا سر دے ماروں گی دیوار میں، مجال ہے جو کہیں کسی بات پر شکر کا کلمہ نصیب ہو جائے، ہندری اولاد، کھاتے ہو یا لگاؤں دو، ہزار بار کہا کہ پراٹھا صرف سنڈے کو مل سکتا ہے۔“
”تو مجھے بھی ناشتہ نہیں کرنا مجھے پراٹھا چاہیے بس۔“

”کیوں تمہارے باپ کی نوکر لگی ہوں۔“
”نہیں کرنا تو مرو، نہ کرو۔“ ادھر پروا کسے تھی۔

”اوہو بھی سدرہ کبھی تو زبان پر کٹر دل کر لیا کرو بچے ہیں آخر۔“ یہ لقمہ اسد کی جانب سے تھا۔

”تم زندہ ہو۔“ سدرہ کا مزاج آسانوں کی سیر کرنے لگا۔

پن ماحول میں اتر آیا تھا، کہ میرا وقت اک عاقبت میں گزرتا۔

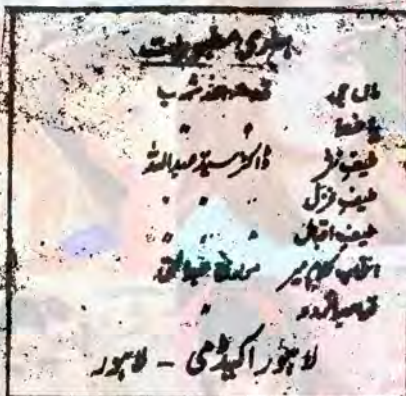
بچے آگئے اور اک کا دوسرے یہ اتفاق نا ممکن تھا، اسی ماہ میں لٹج ہوا، اٹھانچ، میرے دماغ و وجود کی چولیس مل گئیں اور یہ اک دن کی بات نہ تھی، ان سب کی یہی روئین اور مزاج تھے، یونہی تو نہیں سدرہ کا مزاج آسمان پر رہتا اور یارہ ہانکی اور سحر کی نرمی و خاموشی سے سب کچھ سنبھالتی۔

کچھ ہی دیر میں میرا یوریا بستر واپسی کے لئے بندھ گیا تھا، یونہی تو نہیں، زمانہ عورت کی عظمت و سلام کرتا ہے۔

گلشن حیات کی آبیاری، نگہداشت میں، وہ اپنا آپ مٹا دیتی ہے خود کو پھول جاتی ہے، تو میرا تو پھر ذکر ہی کیا، جبکہ خود مجھ پہ، یہ وقت اور کڑا گزرا تھا، مجھے گھریلو زندگی کے ساتھ پروفیشنل لائف بھی سنبھانی تھی۔

سحر ہو، یا سدرہ، وہ جن سب کے لئے اپنا آپ مٹائے دیتی ہیں، وہ میرے ہی گلشن کے تو پھول ہیں، یہ نکتہ اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆



کے لشکاروں کی عادی تھی، سوداگت نکال دیے، اور سدرہ جا کر چھت کو لگی۔

”چپ کرو منہ بند کرو اپنا، صبح جاگ کر منہ بھی دھویا تھا کہ نہیں، کچھ پروا ہے میری ادھر ان سب کے مزاج نہیں ملتے، ادھر تم بار بار کم ہو جاتی ہو، بتائے دیتی ہوں، چھٹی کر دوں گی اور تم نے کیا بولا تھا، برابر والے کو جوتی کی نوک پہ رکھتی ہوں۔“

”اوہاں جی بولا تھا، سنا تھا میں نے کسی سے تبھی بولا تھا۔“ ادھر پروا کسے تھی۔
”مجھے نام بتا دو اس کا، میں ٹکڑے کر دوں گی۔“

”کیوں بتا دوں جا میں نہیں بتاتی۔“
”تمہیں نوکری کرنی ہے کہ نہیں کرنی؟“
”نہیں کرنی جی، ایسی نوکریاں بہت، ابھی حساب کرں میرا۔“ وہ بڑی گئی تو سدرہ کی ٹون پل بھر میں بدل گئی۔

”ادھر تم تو برا مان گئی۔“ نوکریانی دعا دے جاتی تو سارا گھر اس کے سر پر نہ آن پڑتا۔
”او..... نا جی نا..... کہہ دیا نا..... نہیں کرنی نوکری..... ایوں ای..... متھا خراب کر کے رکھتی ہیں۔“

”اچھا..... چلو جانے بھی دو۔“ بڑی مشکل سے اسے منایا وہ بک بک کرتی، کام دھندے میں لگ گئی۔

ادھر موبائل کی بیل بجی، کال بیلز، اک افراتفری بھاگ دوڑ، چیخ پکار سدرہ کا وہی پل پل رنگ بدلتا، نان اسٹاپ انداز و لہجہ اور میرا دل چاہا، گر بیان بھاڑ کے صحراؤں میں نکل جاؤں، اف کتنا سکھ، سکون اور عاقبت تھی، میرے اپنے گھر میں۔

سحر کے مزاج کی تمام نرمی، ششک، دھیما

ہیں۔
☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ تو ہماری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے، مگر لوگ اسے علم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

ساجدہ احمد، ملتان

فطرت

ایک دفعہ ایک بزرگ کسی حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک بچھو بار بار حوض کی طرف جاتا تھا اور وہ بزرگ بار بار اس کا رخ بدل دیتے تھے، ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرید نے جب بار بار یہی نظارہ دیکھا تو عرض کیا۔
”اے مرشد صاحب! آپ اس کو اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے، یہ بار بار آپ کو ڈستا ہے اور آپ بار بار اس کے حق میں جیگی کرتے ہیں۔“ بزرگ نے فرمایا۔
”جب یہ کیزا ہو کر اپنی فطرت سے باز نہیں آتا تو میں انسان ہو کر اپنی فطرت سے کیوں باز آؤں؟“

صفہ خورشید، لاہور

محبت

خلیل جبران کہتا ہے۔
آسمانوں سے ہماری محبت ہمارے دل پر

شرک کا عذاب
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص کو دوزخ میں سب سے ملا عذاب ہوگا تحقیق اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، اگر تیرے پاس اس وقت زمین بھر کا مال ہو تو اس کو دے کر تو اپنے آپ کو چھڑانا چاہے گا۔“
وہ کہے گا۔
”یقیناً۔“
اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

”میں نے تو اس سے بہت ہی آسان بات تجھ سے چاہی تھی، جب تو آدم کی پشت میں تھا یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا تو نے نہ مانا اور شرک ہی پر اڑا رہا۔“ (بخاری شریف)

سارا حیدر، ساہیوال

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔
”میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں پر چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں، اس لئے نہیں پاتے۔“
☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے، مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔

نے عرض کی۔

”جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادہ کے قدموں میں گزری ہے، غلامِ ادا شناس ہے، ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا، دکن کی جانب نگاہ ڈالی اور دست مبارک مونچھوں پر پھیرا، میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔“

آصفہ نعیم، نورث عباس

دسمبر

دسمبر کی سرد ہواؤں کو
کون بتائے کہ اندر لگتی ہوئی آگ کو
اس کی برف ہوتی شامیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں
ان کھر آلودراتوں کو کیا پتا کہ
دل کی چوٹ سیاہ ہو جانے کے بعد
پھر وہاں سورج نہیں نکلتا

فریندا سلم، میاں چنوں
باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر
معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔ (انگریزی
مقولہ)

☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے، وہ اک خاندان کا
مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لئے
اجنیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔ (چیکو سلواکیہ کی
کہاوت)

☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے
ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے، ورنہ وہ بیٹی کو بھی
کھودیتا ہے۔ (کواٹر)

☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس
کی شادی نہ ہو، لیکن بیٹی تمام عمر کے لئے بیٹی
ہوتی ہے۔ (فلر)

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

☆☆☆

اترتی ہے اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے،
ہمارے لئے ہر منظر، ہر موسم اور کیفیت کے معنی
بدل دیتی ہے، ایک نیا احساس جگاتی ہے، پھول
سے خوش رنگ، مٹک اپنی خوشبو سے کچھ اور سوا،
سبزہ اور بھی تراہٹ بخش ہو جاتا ہے، سادون
رت کی ٹھنڈی پون اور جمومی گھٹا، جذبات میں
آگ لگا دیتی ہے اور پھر بارش بالکل پاگل کر
دیتی ہے، خوش گمانی کی حسین پریاں، ہمیں اپنی
نرم گداز بانہوں میں سمیٹ لیتی ہیں اور کبھی ایک
نظر عمر بھر کے لئے زندگی بن جائے، لیکن اس
کے باوجود اسی کا نام محبت ہے، جہاں سے
کائنات شروع ہوتی ہے۔

محبت ایک طلسم کدہ ہے جس میں اگر انسان
پھنس جائے تو پھر ساری زندگی رہائی کے لئے
تر پتا ہے اور شہر دل کے موسم بھی عجیب ہوتے
ہیں، کبھی تو برسوں نہیں بدلتے اور کبھی لمحوں میں
دل کی دنیا بدل دیتے ہیں، محبت ایسی ہی ہوتی
ہے امبر کی طرح دل پر چھا جاتی ہے۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

اداشناس

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک
دفعہ مشہور ہو گیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے
ہیں، اگرچہ آپ اس معاملہ کا ارادہ کر چکے تھے،
مگر ابھی تک کسی سے اظہار نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ
معتد خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، مگر
لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔

سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ
خبر کیسے پہنچ گئی، محکمہ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ
لگائیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی، کھوج لگتے
لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازم خاص کی زبان
سے یہ بات سنی گئی، اس کو بلا کر پوچھا گیا۔

”کہ تم نے یہ بات کہاں سے سنی؟“ اس

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ لگانہ ہے وہ یکا
جو دوئی کی بو ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
تجھے مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
حتا شاہین: کی ڈازری سے ایک خوبصورت نظم
”اسے کہنا“

اسے کہنا دمیر آگیا ہے
دمیر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کے
گھٹا..... میں ڈوب جائے گا
مگر جو خون..... سو جائے گا جسموں میں نہ جا کے

گا
اسے کہنا ہوا میں سرد ہیں اور زندگی کے
کھرے دیواروں میں لرزاں ہیں
اسے کہنا شگونے ٹھنیوں میں سو گئے ہیں
اور ان پر برف کی چادر بھی ہوئی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو برف کیسے پھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

شافقہ خاتم: کی ڈازری سے ایک غزل
دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی
کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی
دیکھا تھا جسے میں نے کوئی اور تھا شاید
وہ کون ہے جس سے تری صورت نہیں ملتی
ہتے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت

رابعہ انور: کی ڈازری سے ابن انشاء کی نظم
چل انشاء اپنے گاؤں میں
یہاں اچھے اچھے روپ بہت
پر اصلی کم بہروپ بہت
اس بیڑ کے نیچے کیا رکنا
جہاں سائے کم دھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں!
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سوالی ہے
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اس دیس بے رامت کرنا
یہاں مفلح ہونا گالی ہے
چل انشاء اپنے گاؤں میں
جہاں سچے رشتے یادوں کے
جہاں وعدے پکے پیاروں کے
جہاں سجدہ کرے وفا پاؤں میں
چل انشاء اپنے گاؤں میں

فرزانہ رانا: کی ڈازری سے ایک غزل
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیسے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھتے ترے تیریم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوئی جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں کسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے

رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی
 نکلا کرو یہ شمع لئے گھر سے بھی باہر
 تنہائی سجانے کو مصیبت نہیں ملتی
 آسیہ فرید: کی ڈائری سے ایک غزل
 تیرے سینے میں دل اپنا سجا کر کیا کریں گے ہم
 تمہیں اپنا بنا کر مسکرا کر کیا کریں گے ہم
 کسی ویران بستی میں اگر تنہا نہیں چھوڑا
 نشین پھر محبت کا بنا کر کیا کریں گے ہم
 جگر میں درد باقی ہے بھی جب چوٹ کھائی تھی
 نئے دکھ اور نئے صدمے اٹھا کر کیا کریں گے ہم
 ہمارے درد پر ہمدرد یاروں کو ہوئی خوشیاں
 کسی کے درد پر خوشیاں منا کر کیا کریں گے ہم
 ہر اک شب اشک بہتے ہیں مگر سنو دی نہیں قسمت
 تمہاری یاد میں آنسو بہا کر کیا کریں گے ہم
 بڑا بے کار ہے جیون ہوا نہ پیار کے قابل
 تمہارے واسطے جیون لٹا کر کیا کریں گے ہم
 ہر اک چہرہ کسی کے حال کی تصویر ہوتا ہے
 برے حالات کے قصے سنا کر کیا کریں گے ہم
 میرے ہدم بڑی ہی سنگدل دنیا ہے کچھ سوچو
 تمہیں پننے کی عادت ہے رلا کر کیا کریں گے ہم
 مریم انصاری: کی ڈائری سے خوبصورت غزل
 راہ عشق میں سفینوں کو چلایا نہیں کرتے
 یوں ہی انمول خزینوں کو لٹایا نہیں کرتے
 سجدہ ہے اس مسعود و معبود کے لائق
 ہر اک کے آگے جبینوں کو جھکایا نہیں کرتے
 جانے کس روپ میں رب مل جائے
 در پہ آئے گداؤں کو ٹھکرایا نہیں کرتے
 پردہ داروں میں لازم ہے پردہ داری
 سر بستہ راز سر محفل لایا نہیں کرتے
 لگی رہتی ہے در پہ جانے کیوں آنکھیں
 جانے والے بھی لوٹ کے آیا نہیں کرتے
 گرد سی جم گئی ہے ہر اک شجر پر

کسی کے صبر کو یوں آزمایا نہیں کرتے
 سنگدل محبوب کہتے پھرتے ہیں گلی گلی
 ٹوٹی ہوئی کرچاں دیواروں پہ سجایا نہیں کرتے
 عزمہ فیصل: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
 ”ہاں ابھی نہیں“

جذبے زنجیر نہیں ہوتے، سائے تو اسیر نہیں ہوتے
 جو منظر ہے، پس منظر ہے، وہ کیوں تصویر نہیں ہوتے

جتنے بھی خیال گزار لیں وہ کیوں تحریر نہیں ہوتے
 اب خواب سراب سے لگتے ہیں
 دن رات عذاب سے لگتے ہیں
 کہیں جلتے بجھتے سائے سے
 کہیں ان دیکھے ہمسائے سے
 آنگن بازار میں گلیوں میں سب موت کا کھیل اٹھا
 لائے
 کوئی کسی کی فرد جرم لکھے، کوئی کسی کی جیل اٹھا
 لائے

اک خوف بچا ہے رستوں میں
 بارود چھپا ہے بستوں میں
 اب زہر سے رات کی رانی میں
 کہیں آگ لگی ہے پانی میں
 تم کہتے ہو تمہیں آن ملے
 تمہیں کیسے آن ملے آخر
 جو کچھ تھا بے ترتیب ہوا
 اس گھر کا حال عجیب ہوا
 فارسیہ سلیم: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
 ”کیا اچھا کیا برا“
 ٹھہرو!

کچھ پل بھلا کر ان پرانی باتوں کو
 جو دوری کا سبب تھیں
 دبیر کی دھوپ میں بیٹھ کر

☆☆☆

س: آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے اٹے لٹے
جوابات پڑھ کر اب حنا کے قارئین کیا
سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟

ج: کیا غضب کے جواب دیتا ہے یہ بندہ۔
س: چلیں آج جلدی سے اپنی فورٹ ڈش اور
مشروب کا ٹائم بتا دیں؟

ج: پی جی ایام کی گئی کوئس کے ناصر۔
س: آپس کی بات ہے، آپ وہی عین غین ہیں
ناں جو تین سال پہلے.....؟

ج: ہاں ہاں وہی ہوں جس نے تمہیں قرض
خواہوں سے بچایا تھا۔
س: میرا دل آج کل بے حد اداس ہے، اگر
میرے سوالوں کے سیدھے منہ جواب نہ
دیتے تو میں.....؟ آگے آپ خود سمجھدار
ہیں؟

ج: پہلے یہ بتاؤ دل اداس کیوں ہے اور وہ بھی
آج کل۔

طاہرہ آصف -----
س: وقت طوفان کب اٹھاتا ہے؟
ج: جب تم کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو اور
”گرل“ کا بھائی آ جائے۔

س: کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟
ج: بہت ضروری ہے ورنہ۔
س: سکون کی تلاش؟
ج: اپنے اندر تلاش کرو۔

س: کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟
ج: کون کہتا ہے۔

رابر علی -----
س: غ غ غی کیا کر رہے ہیں؟
ج: تم کیا کر رہی ہو۔

س: لو یہ کیا بات ہوئی الٹا ہم سے سوال؟
ج: چلو بتائی دیتے ہیں کیا یاد کر گئی۔
س: اب بتا بھی دیں؟

ج: مجھے بے صبرے لوگ پسند نہیں ہیں صبر سے
کام لو۔
س: آپ کیا پسند کرتے ہیں؟

ج: سب کچھ پسند ہے آپ مرضی جو بھیج دیں۔
س: ہم تو حلوہ پوریاں بنائیں گے کیسے بھیجوں
مشکل ہو جائے گی۔

ج: ویسے ہی تمہاری نیت نہیں ہے بہانے نہ
بناؤ۔
س: ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں؟

ج: میں خود آ جاؤں کھا بھی لوں گا اور دل بھی لوں
گا۔

سازیرہ رفیق -----
س: ہوں دیکھیں غ غ غی آپ تو حد سے بڑھ
گئے، آپ کو انٹی پکڑائی آپ ہاتھ پکڑنے
لگے۔

ج: تو یہ تو یہ ہوش کے ناخن لو میں بھلا تمہارا ہاتھ
کیوں پکڑنے لگا میرے لئے کوئی کمی ہے۔
س: دل میں بسنے والوں سے ماہانہ کرایہ وصول
کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: اسے دل کے ساتھ اپنی آنکھوں میں بھی بسا
لیں۔

س: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟

ج: جب پیوی میکے ہو۔

س: آپ اتنی زیادہ ذہین کیوں ہیں؟

ج: یہی بات کل امان اللہ سے بھی کہہ رہے تھے۔

عافیہ رحیم

س: اب کیا ہوگا؟

ج: وہی جو ہم چاہتے ہیں۔

س: جدائی کی رات بہت طویل اور کربناک کیوں ہوتی ہے؟

ج: اکیلے میں ڈر جو لگتا ہے۔

س: وفا کی راہ میں آج میں اکیلی ہوں؟

ج: نہیں سی لانی بے قد راں نال یاری۔

س: کیا گئے ہوئے لمحات واپس آ سکتے ہیں؟

ج: گیا وقت پھر کب ہاتھ آتا ہے۔

س: کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی نہ ہو؟

ج: تاکہ گزری ہوئی باتوں پر کبھی خوش کبھی رنجیدہ ہو سکیں۔

س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟

ج: دل آنے کے ڈھنگ ہیں۔

واجدہ امیر

س: آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں یا کلیاں؟

ج: کلیاں کیوں کہ انہیں ابھی کھلنا ہوتا ہے۔

س: آپ کو ہمینس کے آگے بین بجانا کیسا لگتا ہے؟

ج: مجھے تو چین کی صرف ہنسی بجاتی آتی ہے۔

س: سبھی ہوئی حسینوں اور ابھی ہوئی حسینوں میں کیا فرق ہے؟

ج: جو ایک سمجھدار انسان اور ایک نا سمجھ انسان میں ہے۔

س: انسان جیتے جی کب مرتا ہے؟

ج: جب اس کی عقل کام نہ کرے۔

س: عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس بات کی تمنا کرتی ہے؟

ج: نئے ماڈل کی کار، وسیع و عریض بنگلہ اور دولت مند شوہر۔

س: اگر میں تمہاری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوچھوں کہ بوجھ تو؟

ج: بوجھ کیس گئے۔

سعدیہ بیرو

س: ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں کئی دنوں سے؟

ج: اندھے کوندھیرے میں بڑی دور کی سو جھی۔

س: ایک ڈال پر طوطا بیٹھا، ایک ڈال پر مینا غ جی کیا کہنا؟

ج: دونوں کو صحیح جگہوں پر رہنا چاہیے۔

س: اگر خواب صرف خواب ہی رہیں تو؟

ج: خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ اپنی جان کو روتے ہیں؟

ج: شادی بور کے لٹو ہیں جس نے کھائے وہ بھی پچھتائے جس نے نہیں کھائے وہ بھی پچھتائے۔

س: عورت اپنی عمر اور مرد اپنی آمدنی کیوں چھپاتے ہیں؟

ج: یہی چیز تو فساد کی جڑ ہے۔

س: لوگ کہتے ہیں عشق خلل ہے دماغ کا؟

ج: یہی تو عاشقوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

فاطمہ محمود

س: یہ زندگی تیرے بغیر کیسے کئے گئی؟

ج: جیسے اب تک کئی ہے۔

☆☆☆

بیٹھے دیکھا تو ہمدردانہ انداز میں سبب پوچھا، جنید صاحب بولے۔

”دو ماہ پہلے میرے ایک خالوکا انتقال ہوا، ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، انہوں نے تر کے میں میرے لئے چھ لاکھ روپے چھوڑے۔“

”تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ فیاض صاحب نے کہا۔

”پچھلے ماہ میرے ایک چچا مر گئے تھے، انہوں نے میرے لئے دس لاکھ روپے چھوڑے۔“ جنید صاحب نے گویا ان سنی کرتے ہوئے بتایا۔

”تو پھر آخر آپ منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہیں؟“ فیاض صاحب نے حیرت سے ایک بار پھر پوچھا۔

”بھئی..... یہ پورا مہینہ ختم ہونے کو آ رہا ہے، ابھی تک کہیں سے مزید کوئی خبر نہیں آئی۔“ جنید صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عزہ فیصل، قصور

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی کے پاس بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پسینے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں، اتنے میں ان کا ایک دوست ادھر آیا اور اس نے جب یہ منظر دیکھا تو ان صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے

انداز پیاں اور.....

پچھلے دنوں ”ہیملٹ“ کی طرح ”پلاسٹک کے لفافوں“ کے سلسلے میں بھی شور مٹا تھا، لوگوں کا خیال تھا کہ آلودگی کے ذمہ دار یہ پلاسٹک کے لفافے ہیں جو شاید حکومتی اقدامات کے بعد اب کبھی دکھائی نہ دیں، اس اند شری سے وابستہ لوگوں نے تو متبادل کاروبار کی تلاش بھی شروع کر دی تھی، ”ہفتہ صفائی“ بھی منایا جائے گا۔

مگر پھر کیا ہوا، پلاسٹک کے لفافے بننے لگے، بنتے رہیں گے، بلکہ اب تو کسی پلاسٹک کے برتن میں سالن ڈال کر کھاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے جو پلاسٹک اس جنم میں سالن ڈالنے والے برتن کی صورت میں سامنے ہے، پہلے جنم میں کہیں چپل کی شکل میں نہ رہ چکا ہو۔

آسیہ فرید، خانوال

بے چارگی

”تمہاری یہ جرات کہ تم میرے ڈیڑی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو؟“ لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا، میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں، تدفین کا خرچ میں اٹھالوں گا۔“

مریم انصاری، سکھر

نقصان

ہوٹل میں جنید صاحب کو ان کے دوست فیاض صاحب نے اداس، غم زدہ اور منہ لٹکائے



تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے
فرینہ اسلم ----- میاں چٹوں
ہر بار کی طرح تیرا یہ بے وفا سا وعدہ
معلوم ہے کہ جھوٹا مگر اعتبار لازم

میری بھینٹیں پلکوں کے جو خواب ہیں ٹوٹے
تو تیری یادوں کے سب گلاب ہیں سوکھے
نیند میری پلکوں سے دور ہو گئی
جب سے تیرے سارے خواب ہیں روٹے

آئینے میں غبار اتر آیا
عکس ٹکرا رہے ہیں پتھر سے
میں تھکن اوڑھ کے کدھر جاؤں
آسماں ہٹ گیا ہے میرے سر سے
مہین آفریدی ----- ایٹ آباد
آنکھوں میں بھر کے سادہ محبت کی ڈوریاں
مٹی میں بند کر کے دل و جاں کی چوریاں
دھرتی کو لٹتی ہیں تبسم کی اوٹ سے
چالاک کس قدر ہیں یہ گاؤں کی گوریاں

ظہیر جا آبلہ پا دن ذرا کچھ اور ڈھلنے دے
سکنتی ریت پر چلنا بڑا دشوار ہوتا ہے
جدائی کی رتوں نے ہی نہیں مارا مجھے
کسی کی یاد کا آسیب بھی خونخوار ہوتا ہے

اس شبنم وفا کو جو دل کی شکست پر
اک پل کو آکے رو گئی میں ڈھونڈتا پھرا

بہاول نگر ----- عابدہ حیدر
مہکے سدا بہار کی صورت تیرا وجود
تو مسکرائے شام کی رعنائیوں کے ساتھ
خوشیاں تیرے نصیب کا حصہ رہیں سدا
وابستہ تیرا نام رہے شہنائیوں کے ساتھ

اشفاقا سمجھ کو وہ درس وفا دے جائے گا
زخم دے کر اک درد آشنا دے جائے گا
کس قدر نادم ہوا ہوں میں برا کہہ کر اسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دعا دے جائے گا

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود پر ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لئے
آصفہ نسیم ----- فورٹ عباس
دل میں تھی ویرانی ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم موسم کتنا پیارا ہے
باتوں باتوں میں آؤ اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر اب دنیا کا ہر دکھ ہمیں گوارا ہے

ہئے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہی ایسے جوان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سر دوستاں ہمارے

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تسکین نہیں اور آس بہت ہے
امید یار نظر کا مزاج درد کا رنگ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفائیں گے اعزاز کے ساتھ

اپنی اپنی انا کے قیدی تھے
ہمارے بچ کوئی دوسرا نہ تھا
حاشا ہیں ----- حیدر آباد

وہ تعلق توڑ کر مہربانی کر گیا
رہا جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا
میں سمجھا تھا کہ مل کر داستان پوری ہوئی
وہ تو پھڑک کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
میں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

چکانے ہیں وہ قرضے سطح پر ہیں کہیں زیر زمیں ہیں
ابھی اس خاکل میں تم بھی زندہ ہو رہے ہم بھی نہیں ہیں
ابھی میدان میں ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں ہارلمی
ابھی تو ٹھیل کا آغاز ہے تم بھی نہیں ہم بھی نہیں ہیں
سدرہ خانم ----- ملتان

ایک مہینے بعد ملا تو نام بھی میرا بھول گیا
جس نے چلنے وقت کہا تھا یاد بہت تم آؤ گی

مل گئی جو محبت یاراں غنیمت جانے
پھر نہیں آتے پلٹ کر جب چلے جاتے ہیں دن
وقت اس کے ساتھ کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں
جانے کس پل میں نہ جانے کب گزر جاتے ہیں دن

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

☆☆☆

بے مہر آسمان کے تلے رسم دوستی
کسی دل میں جا کے سو گئی میں ڈھونڈتا پھرا
راجیلہ فیصل ----- سرگودھا

اس اذیت سے کسی طور رہائی تو ملے
اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بشیر
رہا کھتا بھی ہو دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

ہم جو روئے تو انہیں کہنا پڑا
اس طرح کرتی ہے برسات سفر

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا
آمنہ خان ----- راولپنڈی

محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہو گی
اسے میں عصر حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہاتھ میں

ہر اک بار یہ سوچ کے دل بھر آیا ہے
اتنی عمر میں کیا کھویا کیا پایا ہے
صابرہ سلطانہ ----- کراچی

اب تو ٹوٹی شمشیں بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا ہے
ذکر نہ ہو اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

چھانکڑا سوپ

افراح طارق

چھان کر ایک بڑی ساس پین میں ڈال دیں اور دوبارہ دھیمی آنچ پر رکھ دیں، ٹینڈے کے اوپر سبز چھلکا اتار کر اندر سے گودا بھی نکال دیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، سبز پیاز کو بھی ایک ایک برابر کاٹ لیں، کچی میں میدہ ڈال کر سرخ کریں، اس میں سبز پیاز، ٹینڈا اور گوشت کے سلاکس ڈال کر فرائی کریں، ساتھ ہی سویا ساس بھی ملا دیں، سوپ ڈال کر چند منٹ تک تمام اشیاء کو ابال لیں، اچلتے ہوئے سوپ میں گرینڈ کیا ہوا آمیزہ بھی ملا دیں، سوپ تیار ہو جائے تو سبز دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں اور نوش فرمائیں۔

پوٹیشو سوپ

آٹھ پیالی
ایک پاؤ
دو عدد
چھ پوٹی
ایک ٹکڑا
آدھا کھانے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
آدھا کپ
ایک کھانے کا چمچ
آدھا کپ
ایک پیالی
دو سلاکس
اشیاء
پننی
آلو
پیاز
لہسن
ادرک
نمک
سیاہ مرچ پاؤڈر
کچی
میدہ
سلاکس کے پتے
دودھ
ڈیل روٹی
ترکیب

چائیز سوپ

ایک عدد
آدھا کپ
ایک کپ
حسب ضرورت
دو کھانے کے چمچ
ایک عدد
ایک عدد
چار عدد
ایک پیس
آدھی پوٹی
ایک عدد

اشیاء
چکن ثابت پیس
کچی
دودھ
پانی
سویا ساس
شٹغم
ٹینڈا
پیاز سبز
ادرک
لہسن
پیاز خشک
سبز دھنیا
سیاہ مرچ پاؤڈر
نمک
میدہ
ترکیب

ثابت مرغی کے چار ٹکڑے لے لیں، اسے دلیٹر پانی میں ڈال کر پکا میں، اس میں ایک عدد خشک پیاز، چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں، ثابت لہسن، ادرک کا ایک ٹکڑا، نمک اور سیاہ مرچ شامل کر دیں، اس کے ساتھ شٹغم چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور ایک گھنٹہ تک ان سب کو ابالیں، سوپ تیار ہو جائے تو گوشت کو نکال کر ایک ایک آنچ جوڑے ٹکڑے کر لیں، سوپ میں شامل تمام اشیاء کو گرینڈ کر کے پیسٹ بنالیں اور سوپ کو

لیٹر پانی ملا کر پکائیں، دو گھنٹے بعد بخنی کو چھان لیں، ایک عدد پیاز کو بھی میں سرخ کریں اور اس میں دودھ اور میدے والا آمیزہ ڈال دیں، آخر میں پے ہوئے مٹر ڈال کر مزید پندرہ منٹ تک پکائیں۔

چائیز سوپ

اشیاء
چکن
کارن فلور مکئی کا آٹا
پیاز باریک کٹی ہوئی
انڈے صرف سفیدی
کالی مرچ پیسی ہوئی
اجینو موتو
ہری مرچ
سویا ساس
نمک
ترکیب

چکن کے پیس اچھی طرح دھولیں، ایک ساس پین میں چکن، باریک کٹی ہوئی پیاز، سیاہ مرچ، نمک اور پانی ڈال کر بخنی تیار کریں، گوشت گل جائے تو بخنی چھان کر الگ نکال لیں، ابلی ہوئی بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، ایک پیالی پانی میں کارن فلور کا آمیزہ اور چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر دھبی گچ پر چند منٹ تک پکائیں، جب سوپ آپ کی پسند کے مطابق گاڑھا ہو جائے تو انڈے کی سفیدی ملا دیں اور چھپے سوپ میں خوب اچھی طرح مکس کریں، تھے سوپ تیار ہے۔

چلی ساس بنانے کی ترکیب

اشیاء
سرخ مرچ پیسی ہوئی
سرکہ
دو کھانے کے چمچ
دو کھانے کے چمچ

بخنی میں ایک عدد پیاز، لہسن، ادرک، نمک، مرچ اور ڈبل روٹی کے سلاخ ڈال کر آدھا گھنٹہ تک ہلکی آگ پر پکائیں، جب چھ پیالی پانی رہ جائے تو میدہ بھون کر ڈال دیں، پانچ منٹ بعد دودھ بھی ملا دیں، آلو کو ابال کر پیس کر پیسٹ بنالیں، بخنی میں اس پیسٹ کو ملا کر کچر میں مکس کریں اور دوبارہ چولہے پر اس آمیزے کو چند منٹ ابالیں، سوپ تیار ہو جائے تو سلاد کے پتے ملا کر پیش کریں۔

گرین پیس سوپ

اشیاء
مٹر تازہ دانے
بخنی کے لئے ہڈی
گاجر
شلغم
پیاز
ادرک
لہسن
آلو
سبز دھنیا
میدہ
کھجی
پانی
دودھ
سیاہ مرچ، نمک
سفید زیرہ
دارچینی
ترکیب

مٹروں کے دانے ابال کر پیس لیں، میدہ اور دودھ کو الگ رکھ دیں، گوشت کی ہڈی کے ساتھ پیاز، ادرک، لہسن، دارچینی، نمک، مرچ، آلو، شلغم اور سبز دھنیا کاٹ کر ڈال دیں اور دو

انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ملا دیں، بہترین
مزے دار سوپ تیار ہوگا۔
چکن کارن سوپ اور چلی ساس

ایک چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ

نمک
چینی
ترکیب

سرخ مرچ کے پاؤڈر کو تھوڑے سے پانی
اور سرکہ میں گاڑھا گھول کر اس میں چینی اور نمک
ملا دیں اور ساس تیار کر لیں۔
چکن کارن سوپ

اشیاء
چکن ابلایا ہوا
بخنی
مکئی کا دلیہ
پیاز باریک کتر لیں
لہسن

آدھا کلو
چار پیالی
آدھی پیالی
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
چارکپ
ایک چائے کا چمچ
دو کھانے کے چمچ

حسب ذائقہ
حسب ضرورت
نمک
چلی ساس
ترکیب

گوشت جو آپ ابال چکی ہیں اور اس کی
بخنی الگ کر چکی ہیں اس کے ریشے کر لیں کوکنگ
آئل کو ساس پن میں گرم کریں اور اس میں
باریک کترا ہوا پیاز مل لیں، خیال رکھیں کہ پیاز
سرخ نہ ہونے پائے، اب اس میں مکئی کا دلیہ ڈال
کر بھونیں ساتھ ہی لہسن، ادراک، سویا سوس،
مسٹر ڈاؤڈر، سرکہ اور نمک ڈال کر بخنی بھی ملا دیں
اور پکے دیں، پکتے ہوئے سوپ میں گوشت کے
ریشے ڈال کر سوپ کو پیالوں میں انڈیل لیں اور
چلی ساس شامل کر کے نوش کریں۔

اشیاء
چکن (گوشت)
پیاز
لہسن پسا ہوا
ادراک
سرکہ
انڈے
مکئی کے دانے پے ہوئے
کارن فلور
سیاہ مرچ پاؤڈر
چینی
کوکنگ آئل
نمک
ترکیب

ساس پن میں دس کپ پانی ڈالیں اس
میں چکن کی ہڈیاں، پیاز، لہسن، ادراک اور نمک
ڈال کر چکن کو ابالیں یہاں تک کہ پانی چارکپ
رہ جائے گوشت اور بخنی کو الگ الگ کر لیں اور
گوشت کے ریشے بنالیں، ساس پن میں کوکنگ
آئل ڈال کر گرم کریں اور مکئی کے پے ہوئے
دانے ڈال کر بھونیں پھر پانی ڈال کر کچھ دیر ان کو
گھائیں مکئی کے دانے نرم پڑ جائیں تو بخنی، چینی،
کالی مرچ اور گوشت کے ریشے ڈال کر دھبی آج
پر آدھا گھنٹہ تک پکائیں، کارن فلور کو ہلکا سا بھون
کر شامل کر دیں، سوپ گاڑھا ہونے لگے تو

☆☆☆

کونسا صحیح ہے دعا و دعاؤں

نورین شفیق

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا ان کو بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں آپ کی خوشیوں کے لئے دعا گو رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوشیاں اور مسکرائشیں بکھرنے کی توفیق عطا کرے آمین۔

آئیے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں، ٹیکوں کے خزانے سمیٹتے ہوئے یعنی درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے۔ یہ پہلا خط ہمیں افرات الیاس مرید کے ضلع شیخوپورہ تشریف لائی ہیں ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ان کا تمبرہ دلچسپی سے مہر پور ہے وہ ہستی ہیں۔

سب سے پہلے تو معذرت خواہ ہونکہ پچھلے تین ماہ سے تمبرہ نہیں لکھ پائی یہ بھی ایک الگ سے کہانی ہے۔

میرا ایک شکوہ ہے کہ حنا کی ایک تاریخ کو کیوں نہیں مل سکتا کبھی دس تاریخ اور کبھی چار تاریخ کو ملتا ہے پچھلی بار بھی میرا تمبرہ اسی لئے رہ گیا اور اس بار بھی رہی جاتا اگر بروقت امی کا دوسرا چکر بازار نہ لگ چکا ہوتا اور اگر دس کو ملتا تو تیسرا چکر آپ نے تو ہمیں گھن چکر ہی بنا کر رکھ چھوڑنا تھا، ٹائٹل پر ماڈل دوپٹہ لہرائی اچھی لگی ”احادیث مبارکہ“ تعمیر کو جگا گئیں ”ابن انشاء“ کی تحریر میں آج کے دور کا عکس بھی نمایاں تھا اگر وہ بادشاہت کی تلاش میں در در کی خاک چھان رہے تھے تو ہم بھی ایک اچھی جمہوری حکومت کے لئے دعا گو ہیں، سرفہرست میں نایاب جیلانی کا

السلام علیکم! آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

دسمبر سال رواں کا آخری مہینہ۔ پے در پے ششدر کر دینے والے حالات و واقعات سے اجتماع ایک اور سال اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔

وقت تیزی سے ساتھ سے بھاگتا جا رہا ہے اس کے ساتھ منظر بھی بدلتے جا رہے ہیں، آتے جاتے موسم اور چڑھتے ڈوبتے روز و شب اداسی کا احساس گہرا کرتے چلے جاتے ہیں، گزرتے وقت کا ساتھ نہ دے پانے، پیچھے رہ جانے کا احساس ملال کی کیفیت میں اضافہ کرتا ہے، کتنے سالوں سے دن رات کے الٹ پھیر اور موسموں کے تغیر و تبدل کے باوجود لگتا ہے وقت جیسے جامد سا ہو گیا ہے۔

اس وقت وطن عزیز جن بحرانوں کی زد میں ہے کیا صاحب اختیار و اقتدار کو اس کا احساس و ادراک ہے اور کیا ان بحرانوں سے نکلنے کے لئے کوئی حکمت عملی بنائی ہے یا صرف لفاظی ہی ہے، یاد رہے دائروں میں گھومتے سفر کا اختتام ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔

آنے والے وقت کی بہتری کی دعا کرتے ہوئے امید کا چراغ روشن کیے رہیں اور اس چراغ کو جلتے رہنا چاہیے، خالق کائنات ہر شے پر قادر ہے۔

نام نہ پا کر منہ سے بے اختیار پھسلا چلو جی آدھا کام ختم ”دوسرا شکوہ ہر ناول کے اینڈ پر پانی آئندہ شمار ہمارا منہ خزا رہا تھا ”دل گزیدہ“ قدر کا بدلہ لاؤ حیرت میں ڈال گیا مگر اب حمدان کا مزاج ٹھیکو گیا اور اب قدر کے ضبط آزمائے کی باری ہے اگلے کا بدلہ تو ملتا ہی ہے اور دلہن بنی وہ لڑکی چاب ہی تھی نہ، منظر کسی قیامت سے کم نہ تھا ”بی رقم“ بشری سیال آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اچھا خاصا تو لکھ رہی تھیں مگر اب اتنا پیچ خیز اس بار آپ کی اصلی جھلک کچھ کچھ نظر آئی ”تحسین اختر“ وہ لکھ تو ٹھیک رہیں ہیں کہانی میں کوئی جھول بھی نہیں مگر رفتار اتنی سلواور تاپا بی جیلانی وہ تو ناول کو جیسے ایک جگہ ہی روک رکھیں گئیں آگے ہی نہیں بڑھائے گئیں جہاندار کا پولو کے میدان میں اترنے کا انتظار جو ہے ”تم میرے ہو“ پری پر تو پانی کی پوری نیکی ڈالنی چاہیے اپنے اچھے اور برے کی تمیز ہی نہیں، درمیان ہمیشہ اچھا کھتی ہیں اور اب بھی اچھا ہی لکھے گئیں ”محبت کا فوس“

سو نیا چوہدری سنجیدہ سی اس اسٹوری کو شروع سے آخر تک احسن طریقے سے لائیں، ہول میں آگ لگنے کے باعث فاریہ ہمت ہار گئی ذرا اچھا نہیں لگا ”مجھے اڑنے دو“ مریم ماہ منیر نے بھی خوب لکھا ”اک نام تمہارا“ رویہ کے حوصلے کو داد دینا پڑے گی عزت نفس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں مگر مجبوری اس سے بھی بڑی شے ہے اور افسانہ ”تا ثیر مسجانی“ سب سے بیٹ تھا ایک دم پر فیکٹ سچائی پر مبنی اور ہاں یاد آیا میرا افسانہ ”اے جزیہ دل“ ہائے روی کی نوکری میں ڈال چکی ہوئیں، اب تک تو روی کی نوکری کو بھی میری تحریروں سے دلی لگاؤ ہو چکا ہوگا۔

اترے۔ میں مانتی ہوں کہ میری اکثر تحریروں دیکھی ہوئیں ہیں جو آج کل کے ڈپریشن بھرے ماحول میں مزید ڈپریشن کا سبب بنتی ہیں مگر میری دیکھی تحریر لکھنے کا مقصد آپ کو دیکھی کرنا نہیں بلکہ اس دکھ کا احساس دلانا ہوتا ہے جو نبانے کتنے لوگ اس وقت محسوس کر رہے ہوتے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ صرف آپ دیکھی نہیں صرف آپ اداس نہیں بلکہ دکھ اور اداسیاں تو ہر طرف ہیں اور یقین چاہیے یہ دکھ اور اداسیاں صرف ہم خود ہی کم کر سکتے ہیں ہمارے علاوہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ہمیں جینا ہے تو زندگی کا احساس بھی خود کو خود ہی دلانا پڑے گا اور اصل زندگی اسی میں ہے۔

جاتی ہوں کہ یہ بہت مشکل ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں، اب نیا سال شروع ہونے والا ہے

اترے۔ میں مانتی ہوں کہ میری اکثر تحریروں دیکھی ہوئیں ہیں جو آج کل کے ڈپریشن بھرے ماحول میں مزید ڈپریشن کا سبب بنتی ہیں مگر میری دیکھی تحریر لکھنے کا مقصد آپ کو دیکھی کرنا نہیں بلکہ اس دکھ کا احساس دلانا ہوتا ہے جو نبانے کتنے لوگ اس وقت محسوس کر رہے ہوتے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ صرف آپ اداس نہیں بلکہ دکھ اور اداسیاں تو ہر طرف ہیں اور یقین چاہیے یہ دکھ اور اداسیاں صرف ہم خود ہی کم کر سکتے ہیں ہمارے علاوہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ہمیں جینا ہے تو زندگی کا احساس بھی خود کو خود ہی دلانا پڑے گا اور اصل زندگی اسی میں ہے۔

اترے۔ میں مانتی ہوں کہ میری اکثر تحریروں دیکھی ہوئیں ہیں جو آج کل کے ڈپریشن بھرے ماحول میں مزید ڈپریشن کا سبب بنتی ہیں مگر میری دیکھی تحریر لکھنے کا مقصد آپ کو دیکھی کرنا نہیں بلکہ اس دکھ کا احساس دلانا ہوتا ہے جو نبانے کتنے لوگ اس وقت محسوس کر رہے ہوتے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ صرف آپ اداس نہیں بلکہ دکھ اور اداسیاں تو ہر طرف ہیں اور یقین چاہیے یہ دکھ اور اداسیاں صرف ہم خود ہی کم کر سکتے ہیں ہمارے علاوہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ہمیں جینا ہے تو زندگی کا احساس بھی خود کو خود ہی دلانا پڑے گا اور اصل زندگی اسی میں ہے۔

نئے دن نئی راتیں پچھلے سال میں ہم نے نبھانے
کیا کیا مگر اب اس نئے سال خود سے عہد کرنا ہے
کہ اداسی اور دکھ کی چادر کو اوڑھ کر مسکرائیں گے
کیونکہ جب تک ہم خود نہیں جیتیں گے تب تک
ہمیں کوئی جینے نہیں دے گا۔

آخر میں میری دوست اقراء الیاس آپ ہر
کیا گیا تبصرہ میں انتہائی غور سے پڑھتی ہوں مجھے
آپ سے عقیدت مزید بڑھ جاتی ہے میری
تحریروں کے لئے تھینک یو بہت چھوٹا لفظ ہو گا
اس کے لئے میں صرف اتنا کہوں گی۔

میرے احساس کو سمجھنے کے لئے
پھر اہم راز بننے کے لئے

اے زندگی جیسی لڑکی

تمہارا شکر یہ

ثناء کنول خوش رہو، آپ کے احساسات اور
جذبات ان سطور کے ذریعے قارئین تک پہنچائے
جارے ہیں شکر یہ۔

منحہ رمشا: فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔

نومبر کے شمارے کا شدت سے انتظار کیا
آخر ہم نے بھی تو ایک نعت اور تحریر بھی مسمیٰ، لیکن
شمارہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی آپ نے نعت کے
لئے معذرت کر لی آپ کی اور تحریر ابھی پڑھی ہی
نہیں، خبر میں ہار نہیں مانوں گی، اس خط کے
ساتھ ایک حمد اور نعت ارسال کر رہی ہوں کوئی تو
قابل اشاعت ہوگی انشاء اللہ، ایک اور تحریر
”صورت یا سیرت“ بھی آپ کی خدمت میں
پیش کی ہے، اس ماہ کا شمارہ ناولٹ نمبر تھا اور
زبردست رہا، حصہ اسلامیات پڑھنے کے بعد
اپنے موست فیورٹ ناولٹ ”دل گزیدہ“ کی
طرف چھلانگ لگائی، قدر پھر اپنے روپ میں
واپس نظر آئی، قدر کو حمدان کی غلطی کو دور کرنا
چاہیے، ام مریم آپ کی آپ نے نٹ کھٹی حجاب

کے ساتھ بہت برا کیا، اللہ اللہ کر کے تو عمر اور
حجاب ملے تھے اور آپ نے اس شیطان اولیس
کے ارادوں کو کامیاب کر دیا اور اس شیطان کی
پرکالہ شانزے کی بھی جیت ہوئی، حرم نہ سہی حجاب
کو تر برباد کرنے میں کامیاب رہی، حمدان کو
شانزے اور اولیس دونوں کو عبرتاک سزا ملنی
چاہیے، حق نہیں سکتے وہ حمدان کے عتاب سے
حمدان کو قدر کے ساتھ شوخ ہی دکھایا کریں، اس
روشنی کا بھی جلدی صفایا کریں، بہت پور کرتی ہے
چچی، علی شیر کو اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں
ہونے دیجئے گا آپ کی، قدر کے کردار میں ”تم
آخری جزیرہ ہو“ کی زینب کی جھلک نظر آتی ہے،
درشن بلال آپ کی کامل ناول ”تم میرے پاس
رہو“ دل کو چھوتا ہوا بہترین تحریر ہے، انزک اور
پریش ہی ہیرو و ہیروئن میں سیرا کیلا رہ جائے گا،
شاہ ویز اور انوش کا کردار پسند آیا، ذوریز اور
ماہین کے ماضی پر بھی روشنی ڈالنے، بشری سیال
آپ کی ناولٹ ”مئی رقص“ بھی اچھا رہا ہے لیکن
آپ کی آخر میں آپ نے کس پر فائزنگ کر وادی،
آپ کی وہ فارقلیط نہیں ہونا چاہیے، فارقلیط پہلے والا
محبت کرنے والا ہی اچھا تھا پلیز اسے واپس لے
آئیں، عیسیٰ کا کردار بھی ختم کریں، بہت غصہ آتا
ہے مجھے اس پر، رابعہ افتخار آپ کی ناولٹ ”اک نام
تمہارا“ میں امجد نے آخر میں بالکل صحیح اسٹینڈ
لیتے ہوئے اپنے گھر والوں سے قطع تعلق کر لیا،
بے شک اگر مرد اپنی بیوی کے شانہ بشانہ کھڑا ہو تو
سسرال والوں کی ہمت نہیں ہوتی اسے شک
کرنے کی، ریحانہ آفتاب کا ناولٹ ”تو دھڑکن
میں دل“ تو دل کو چھو گیا، افریشم اور ریان کا کپل
اور ان کی کیمشری بہت پسند آئی، افسانہ صرف
ایک ہی تھا حنا بشری کا ”ثاشر مسیحا“، مرد کو بے
وفائ نہیں ہونا چاہیے اور اگر ہو تو بیوی کو اس کے

میں ڈوبتی جا رہی ہے، نو جوانوں کی آنکھوں سے
حیاء کا جنازہ نکال چکا ہے، امت مسلمہ کی بیٹیاں
بے پردہ اور نیم برہنہ ہو کر شیطانی نظاروں کو
دعوت دہتی نظر آ رہی ہے۔

سب سے پہلے ”مسی رقص“ بڑی ڈیئر
رائیٹر بشری سیال بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن
آپ اپنے ناول کو اتنی طوالت نہ دیں کہ قارئین
بیزار ہو جائیں، فارقلیط اور عروہ کو جتانہ کیجئے گا،
اور عروہ کو جلد از جلد اس کے بابا سے ملوا دیجئے
نویلہ کی ماں جیسی عورتیں ہمیشہ گھروں کو اجاڑ دیتی
ہے اور جب آشیانہ تنکے تنکے کی صورت میں بکھر
جاتا ہے تب بھی ہوش کے ناخن نہیں لیتی، فردا
اچھی ہے مگر مجھے زین ندیم بھی بہت اچھا لگتا ہے
”دل گزیدہ“ ام مریم آبی، کیا ہم ہر ماہ حمدان اور
قدر کی لڑائیاں ہی پڑھتے رہے پلیز کچھ نالے کر
آئے، اس اپنی میں تو پھر بھی کچھ نیا تھا پلیز آبی
ڈونٹ مائنڈ، حمدان کو کم از کم قدر کی آنکھوں میں
جھانک کر دیکھنا چاہیے تھا آیا کہ وہ کس جذبے
سے حجاب اور حرم کو چھڑیں دے رہی تھی، بیٹ مانی
موسٹ فورٹ کیریکٹرز غانیہ بیگم جنہوں نے
بڑی عجیب محبت کی ہے، شکر ہے فیب کو بھی کچھ
ہوش آیا ”ثائر مسیحائی“ زبردست حنا آبی بعض
اوقات انسان کو محبت سیمان ایسے ہی ٹوٹتا ہے، وہ
سوچتا کچھ اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے ”تم میرے
ہو“ آبی درمیں قدم قدم پر چونکا دینے والی تحریر
یک آخر میں باقی آئندہ ماہ منہ چڑاتا محسوس ہوا،
کمل ہونے پر بھرپور تبصرہ کروں گی، ”محبت کا
فسوں“ واقعی ہی محبت کا تیرسید حادل میں لگ ہی
گیا آخر محرکی محبت نے تیمور اور فاریہ کو جکڑ ہی لیا
اور بارش محبت کی پھوار ان کے دلوں پر برسنے
لگی، زبردست اینڈ ”شہر دل کا راستہ“ موصدا ب
پچھتا تا ہے وانیہ سے شادی کر کے کے حرم کو تصور

ساتھ جبر کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے، مشعال کے
دکھ پردہ ہوا، نایاب جیلانی آپ کو اللہ صحت کامل
عطا فرمائے جو علالت کی وجہ سے اس ماہ ”پریت
کے اس پار کہیں“ نہیں لکھ پائیں، آبی میری نئی
تحریر ”صورت یا سیرت“ پڑھ کے اس کے قابل
اشاعت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ضرور
بتائیں گی، آبی مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے آپ
نے لکھاریوں کو موقع دیتی ہیں پلیز مجھے بھی موقع
دیجئے۔

مخبرہ امشاء خوش رہو، نومبر کے شمارے کے
لئے آپ کا تبصرہ پسند آیا آپ کی قیمتی رائے ان
سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہیں
آپ کی تحریر اگر قابل اشاعت ہوگی تو ضرور شائع
ہوگی، حمد اور نعت کے لئے ہماری معذرت اس
لئے کہ اس سلسلے میں صرف مستند اساتذہ کا کلام
ہی شائع کیا جاتا ہے آپ کی تحریریں اگر قابل
اشاعت ہے تو ضرور شائع ہوں گیں اپنی رائے
کے لئے آگاہ کر رہی رہے گا شکریہ۔
شازیہ ہاشم میوالی نے ٹھڈیاں خاص
سے اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہے۔

نومبر کا شمارہ دس تاریخ کو ملتا ہر دفعہ لیٹ ہی
ماتا ہے، اس دفعہ ٹھان ہی لی اس دفعہ میں نے اپنا
تبصرہ ضرور بھیجتا ہے ”کچھ باتیں ہماریاں“ پڑھ
کر دل غم و اندوں کی گہری کھائی میں چلا گیا۔

حمد و نعت سے دل کو نورانی کرنوں سے
تابنا کی جتنے ہوئے بڑی پیارے نبی صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی پیاری باتیں، ہائے ڈوب مرنے کا
مقام ہے مسلمانوں کے لئے جو اپنی اصلیت کو
چھوڑ کر غیروں کی نقائی کر رہے ہیں، جن
اندیشوں اور فتنوں کا ذکر پیارے محمد عربی صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے فرمادیا تھا من
و عن آج ایسا ہی ہو رہا ہے، آج نئی نسل مغرب

میں لاتا ہے، وانیہ اب پچھتاہی ہے اپنے والدین کو چھوڑ کر مراب کیا پچھتاہی جب چڑیاں چک گئیں کھیت مشام پر غصہ آیا، جو حریم سے بدگمان ہے آپنی حریم اور نہال کو ایک مقدس رشتے میں باندھ دینا ایک بات سمجھ نہیں آتی ہر رائٹر اکثر جن کیریکٹرز کو لکھتی ہیں وہ Vich ہی کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ان کا ہونا ضروری ہے؟ دوسرا حنا میں پہلے میں نے کچھ ایسی اسٹوری پڑھی تھیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا ہر اسٹوری ایسی ہو جس میں کم از کم کوئی اسلامی قدر اچا کر کی جائے، تاکہ نئی نسل اپنے مذہب سے دور نہ ہو، تبسم بشیر حسین، انیلا طالب آپ کا حنا میں شامل ہونا دل کو بہت بھایا۔ شازیہ ہاشم خوش آمدید نومبر کے شمارے کے لئے آپ کا تبصرہ بے حد جامع اور بھرپور تھا پسند آیا، مصنفین کہانی اور کردار اپنے آس پاس سے ہی لیتی ہیں اور اسی کو میں بنا کر کہانی کا تانا بانا بنتی ہیں، بہر حال آپ کی رائے مصنفین تک پہنچانی جارہی ہیں، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

ریجیہ گل: سندری فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔

السلام علیکم! نومبر کا شمارہ دس تاریخ کو ملاحظہ اور نعت شریف سے آغاز کیا دونوں بہترین تھیں، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوا پھر سلسلے وار ناولز کی جانب آئی تو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ میرا فورٹ ناول ”پر بت کے اس پار کہیں“ موجود نہیں تھا نایاب آپنی آپ کی ناسازی طبیعت کا پتہ چلا اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یاب کرے تاکہ آپ ناول کو آگے بڑھا سکے ”دل گزیدہ“ بھی اچھا رہا ہے، سندس جنیں سے ایک فرمائش ہے ہماری کہ آپ جلدی سے اسید مصطفیٰ جیسا کردار لے کر اپنا ایک ناول حنا کی خدمت میں پیش کریں ”محبت کا

فسوں“ اختتام پذیر ہوا ناول کچھ خاص نہیں تھا، ”شہر دل کا راستہ“ اور ”می رقص“ بھی جاری ہے، ”مجھے اڑنے دو“ اچھا لگا مگر اختتام پر معلوم ہوا کہ خاطر کی موٹھیں تھیں ”تاثر میجانی“ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے آخر مردانتا بے حس کیوں ہوتا ہے ”اک نام تمہارا“ میں رویہ کے صبر کی داد دینا پڑے گی میرے خیال میں عورت کو اتنی صابر بھی نہیں ہونا چاہیے مگر شکر ہے کہ آخر میں اچھا کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا، ”تو دھڑکن میں دل“ نے دل چھو لیا ریان مرزا کا کردار پسند آیا اس کے ایک حوالے نے اس کی زندگی بریاد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر شکر ہے کہ آخر میں اسے افریقہ مل ہی گئی اور آخر میں اپنے فورٹ ناول ”تم میرے پاس رہو“ کی جانب آتے ہیں، درمن آپنی پری اور انزک کی طلاق مت کرو ایسے گا سیر جیسا انسان پری کے لئے ٹھیک نہیں ہے پری کے دل سے سیر کی محبت نکال کر انزک کی محبت ڈال دیں اور آپنی انوش شاہ ویز کی محبت کو قبول کر لے گی کیا؟ وہ تو اسے کسی خاطر میں نہیں لاتی اور ذوریز آفندی کی بیماری کا دکھ ہوا آپنی ماہین کا پھر دل سوم کر دیجئے۔

میں نے اب تک تین افسانے بھیجے ہیں ایک بھی شائع نہیں ہوا۔

ریجیہ گل نومبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کا نام اب کی بار ٹھیک لکھا گیا کیا؟ بتائیے گا ضرور، آپ کی تحریروں کے لئے ہماری معذرت قبول کیجئے گوش جاری رکھئے انشاء اللہ ایک دن اچھا لکھنے میں ضرور کامیاب ہوں گی آپ کی رائے کا انتظار رہے گا شکریہ۔ تبسم بشیر: ڈنگا سے لکھتی ہیں۔

اس دفعہ حنا دس کو ملاحظہ، توبہ آپنی اتالیٹ، پلیز کم از کم پانچ تک تو بھیج دیا کریں، ٹائٹل ذرا پسند

’کچھ باتیں ہماریاں‘ پڑھا، انگل کشمیر کے بارے فکر مند نظر آئے ہمارے دل سے بھی کشمیری بہن بھائیوں کے لئے دعا نکلی، اس کے بعد سیدھے ’کس قیامت کے یہ نائے‘ پڑھے تمام خطوط اچھے تھے، فوزیہ آپ کی طرح ہمیں بھی کنزیا محمد کا نام پسند آیا، آپ کی شروع میں پراثر باتیں دل میں گھر کر گئیں، نایاب جی کی صحت کاملہ کے لئے ڈیڑھ روں دعائیں۔

درمیں کا طویل ناول زبردست ہے صابرہ بیگم کا انعام ہمیں بھی انجانی خوشی سے ہمکنار کر گیا، ویسے پری عنقریب انزک کے گھر تشریف لانے والی ہے (اندازہ) ہے۔

سونیا کا ”محبت کافسوں“ کا اینڈ زبردست تھا، بس منصورہ بیگم کی بھکی سوچ افسردہ کر گئی۔

ناولٹ نمبر میں موجود بیٹ ناولٹ ”می رقص“ تھا، رابعہ افتخار بھی چھا گئیں، افسانہ ایک ام مریم کے بارے کیا کہوں ”دل گزیدہ“ ہمیشہ کی طرح فٹنا سنگ تھا، مستقل سلسلوں میں ”پیارے نبی“ فتنہ کے متعلق پڑھ کر رونے لگے کھڑے ہو گئے۔

حاصل مطالعہ، حنا کا دسترخوان اچھا تھا، انشاء جی کا مضمون کسی تعریف کا محتاج نہیں، وہ ہمیشہ لاجواب ہوتا ہے۔

ادور آل ناولٹ نمبر بہت پسند آیا، فوزیہ آپ کی میں نے ایک طویل ناول ”ذروموسم“ ارسال کر رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ بہت جلد ”ساوا اہم بھٹی“ کی باری آئے گی،

ساوا اہم بھٹی کیسی ہو چندا، نومبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کا ناول موصول ہو گیا ہے، پڑھنے کے بعد ہی پتا چل سکے گا کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہے گا شکریہ۔

☆☆☆

نہیں آیا پلیز اچھے اچھے ٹائٹل دیا کریں، ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں سردار طاہر محمود انگل کی باتیں دل کو لگی، حمد و نعت اقبال عظیم کی حمد پسند آئی جبکہ نعت پہلے بھی کس ڈائجسٹ میں پڑھ چکے ہیں ”پیارے نبی“ کی باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری رہی، جبکہ انشاء نامہ، اس دفعہ پسند نہیں آیا، ”تم میرے پاس رہو“ درمیں کو سب سے پہلے پڑھا دوسری قسط لاجواب، شاندار رہی زبردست، ”محبت کافسوں“ تینوں اقساط اکٹھی پڑھ کر اگلے ماہ تبصرہ انشاء اللہ ”مجھے اڑنے دو“ مریم ماہ منیر کا ناول بھی پسند آیا خاص کر ماہا کا کردار ”اک تمہارا نام“ رابعہ افتخار کا ناولٹ بہت پسند آیا رابعہ میری فیورٹ رائٹر ہیں، ان کی تحریر لازمی لگایا کریں، ”تو دھڑکن میں دل“ ریحانہ نے ہمیشہ کی طرح زبردست لکھا ویری گڈ۔

جبکہ ”می رقص“ شہر دل کا رستہ، دل گزیدہ میں نے نہیں پڑھے ایک خط پوسٹ کروانے کی جلدی ہے دوسرا اب ان کہانیوں سے میری دلچسپی مکمل ختم ہو چکی، افسانہ ایک ہی ”ناشر مسیحائی“ حنا بشری نے ایسا لکھا سبق آموز۔

”حاصل مطالعہ“ شازیہ رفیق، واجدہ امبر، سعدیہ سرور، زینب شیخ نے زبردست لکھا۔

بیگم بشیر اکوبر کے شمارے کا ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا، انشاء اللہ آئندہ آپ کی پسند کا خیال رکھیں گے، ارے یہ کیا سلسلے دار کہانیوں سے آپ کی دلچسپی کیوں ختم ہو گئی، ناولٹ مل گیا ہے ابھی پڑھا نہیں گیا اگر قابل اشاعت ہوا تو جلد شائع کریں گے شکریہ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہا کچھ شکریہ۔

ساوا اہم بھٹی: ڈیرہ غازی سے لکھتی ہیں۔

نومبر کا شمارہ ناولٹ نمبر سے سجا کافی انتظار کے بعد ملا، سرسری سی نظر سرورق پر ڈالی، جلدی